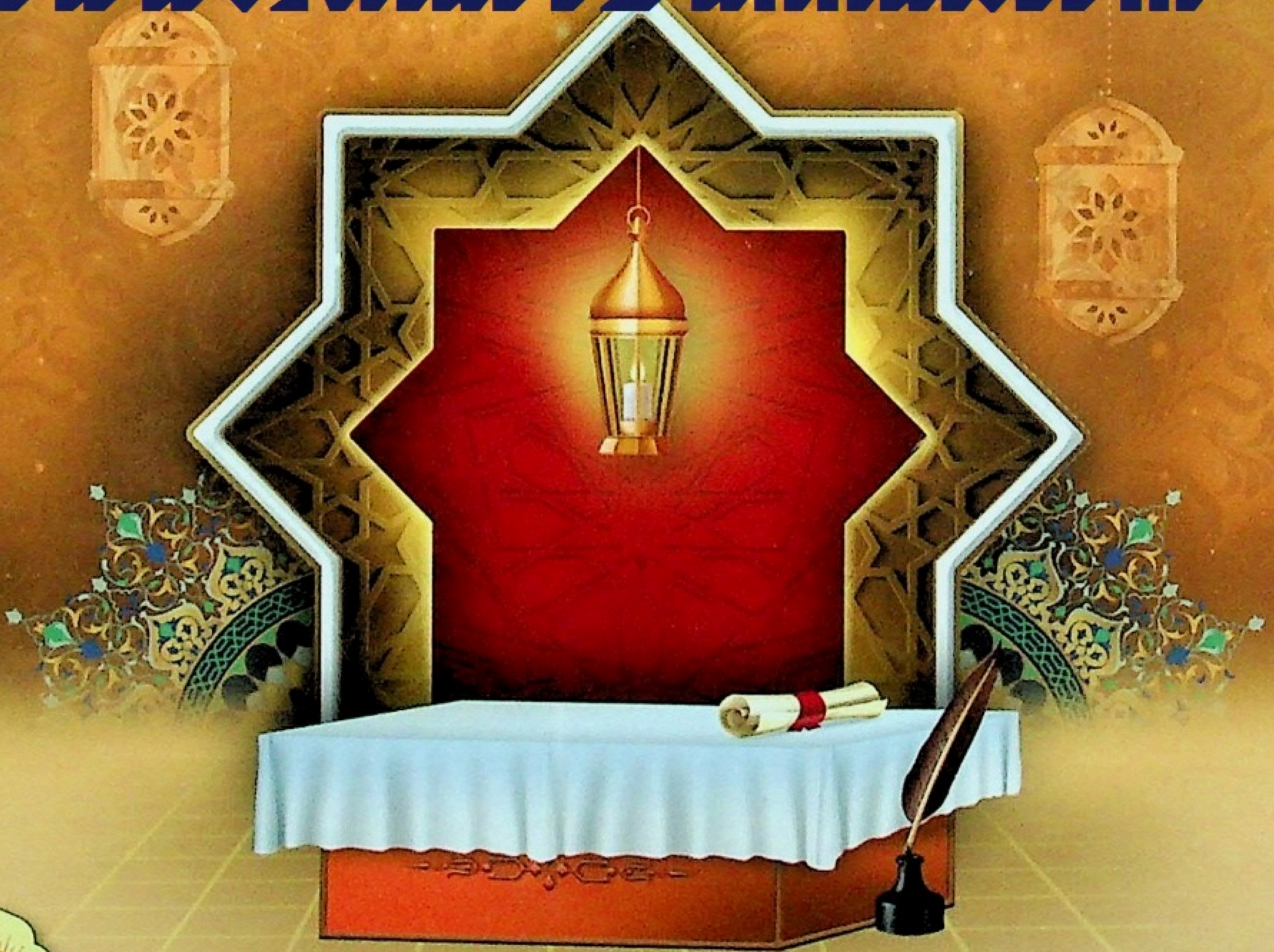
اربعین نووی کی شرح "جامع العلوم والحکم" کا ترجمہ وتہذیب

نیل الإرب
من
جامع العلوم والحکم

للعلامة عبد الرحمن بن أحمد بن رجب الحنبلي



ترجمہ
ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد حفظہ اللہ

مکتبہ اسلامیہ
MAKTABA ISLAMIA

اربعین نووی کی شرح "جامع العلوم والحکم" کا ترجمہ وتہذیب

نیل الأرب من جامع العلوم والحکم

للعلامة عبد الرحمن بن أحمد بن رجب الحنبلی



ترجمہ

ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد



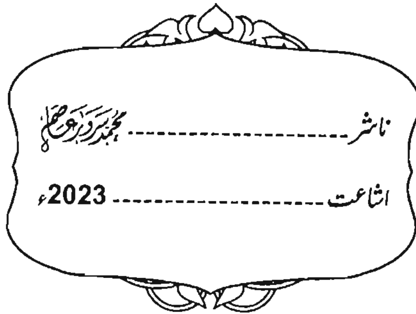


نیل الارب
من
جامع العلوم والحکم

للعلامۃ عبدالرحمن بن احمد بن رجب الحنبلی



ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد حفظہ اللہ



ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ------------------- 2023ء

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ®

لاہور: G/F-26 ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-0997821-22-23-24 ، 042-37244973-37232369

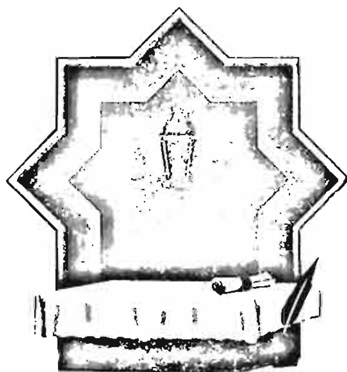
فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
0300-0997826-27-28 ، 041-2631204-2641204

0300-8661763 0300-0997821

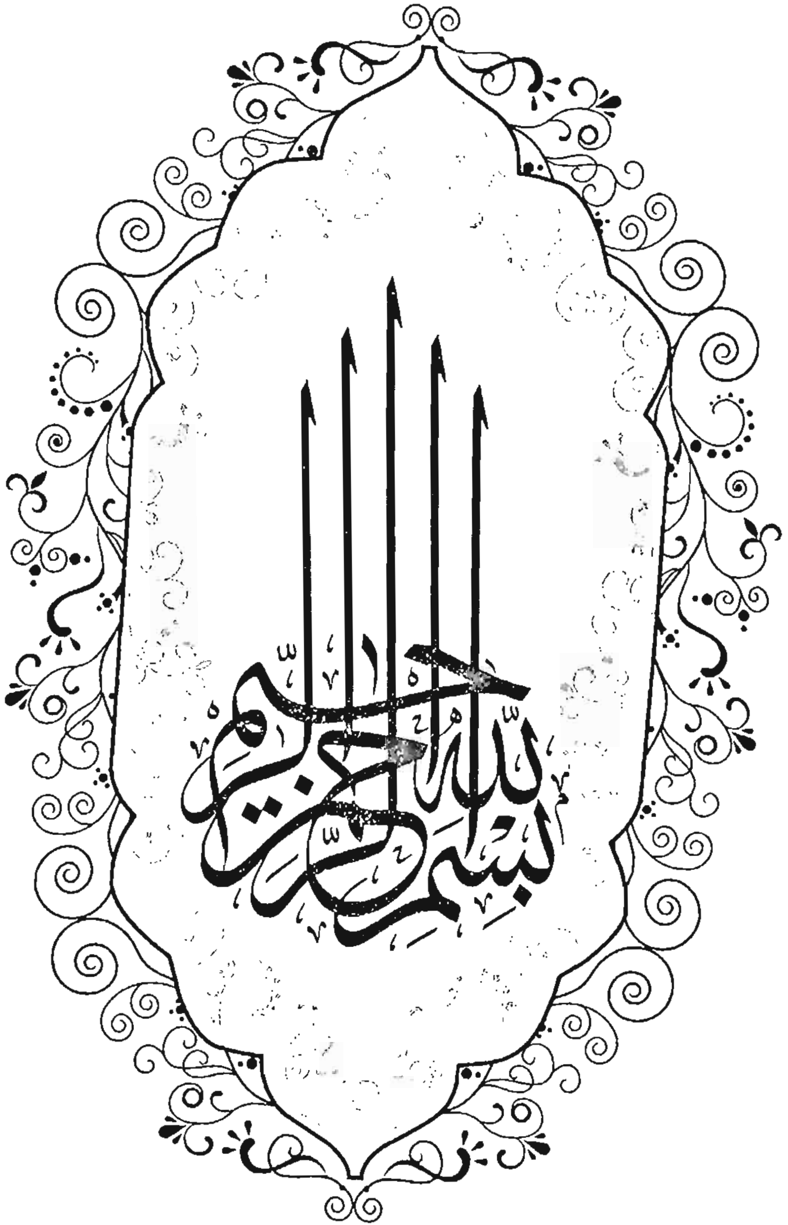
maktabaislamiaofficial

maktabaislamiainfo@gmail.com

www.maktabaislamia.com.pk



نیل الإرب
من
جامع العلوم والحکم


بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست



مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ، وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ... وَبَعْدُ!

وزارتِ اوقاف کویت میں ادارة الدراسات الاسلامیہ کے ذیلی ادارے دار القرآن الکریم میں حدیث کے نصاب کو نئے سرے سے مرتب کرنے کے لیے جس کمیٹی کو مکلف کیا گیا، اس نے کتاب "جامع العلوم والحکم" کو دارالقرآن الکریم میں تدریس کے لیے چنا، جس کے کئی اسباب تھے، ان میں سے اہم ترین اسباب یہ ہیں:

1. اس کتاب میں ذکر کی گئی احادیث سب نہیں تو دین کے زیادہ تر ابواب پر مشتمل ہیں۔
2. علماء کا جامع احادیث کو جمع کرنے کا اہتمام، چنانچہ سب سے پہلے ابوعمرو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے چھبیس احادیث جمع کیں جو ان کی رائے میں نبی کریم ﷺ کے جامع کلمات میں سے تھیں۔ پھر امام ابوزکریا نووی رحمہ اللہ آئے تو انھوں نے مذکورہ چھبیس احادیث پر سولہ احادیث کا اضافہ کرتے ہوئے انھیں بیالیس تک پہنچا دیا، جوکہ اربعین نوویہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے بعد بڑے بڑے ائمہ نے اس کتاب کا بہت اہتمام کیا، جن میں ابو العباس اشبیلی، ابن دقیق العید، ابن الملقن اور سیوطی رحمہم اللہ شامل ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بعد امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ آئے، انھوں نے بیالیس پر آٹھ احادیث کا اضافہ کرتے ہوئے انھیں پچاس تک پہنچا دیا۔ پھر انھوں نے ان تمام احادیث کی شرح کی اور اس کا نام رکھا: "جامع العلوم والحکم"
3. امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کا علماء میں علمی مقام ومرتبہ۔
4. کتاب کے بہت زیادہ فوائد، کیونکہ مولف نے اس میں شرعی احکام اور احادیث کی تخریج اور ان پر حکم لگانے میں توسع کے ساتھ ساتھ بہت سارے آداب، حکم اور علوم بھی جمع کر دیے ہیں۔
5. کتاب کی شہرت اور تمام خاص وعام اہل علم میں اس کی نیک نامی۔
6. لوگوں میں اس کتاب کی مقبولیت۔

کتاب پر ہمارے بعض ملاحظات:

پہلی نظر میں ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم جیسوں کو امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ جیسے ربانی عالم پر کلام کرنا زیب نہیں دیتا، لیکن اس کتاب پر کام کرتے ہوئے بعض امور نے ہمیں متنبہ کیا جن کے بارے میں تنبیہ کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ امام ابن رجب رحمہ اللہ پر تنقید نہیں، بلکہ ان کے منہج پر صرف تنبیہ کرنے کے لیے۔ اگر ہم اس کتاب کی اہمیت وخصوصیات اور اس کے بہت ہی اہم فوائد بیان کرنا چاہیں تو یقینی طور پر اس کے لیے ہمیں کئی صفحات درکار ہیں۔ لیکن ہم یہاں صرف ان ملاحظات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس کتاب پر کام کرتے ہوئے ہمارے سامنے آئے، لہٰذا کوئی گمان کرنے والا شخص ہمارے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرے کہ اس کتاب کا اختصار ایسے ہی بغیر کسی مقصد وترتیب کے تھا۔ چنانچہ ہمارے ملاحظات میں سے کچھ یہ ہیں:

1. بعض اوقات کئی احادیث کو بالمعنی روایت کرتے ہیں اور حدیث کے اصل الفاظ کی پابندی نہیں کرتے۔
2. بعض مصادرِ حدیث کی طرف نسبت کرنے میں تساہل کرتے ہیں، جن میں حدیث بالمعنی روایت کی گئی ہوتی ہے، نہ کہ اصل الفاظ کے ساتھ۔
3. غالب احوال میں بعض علماء کے اقوال ان کی مؤلفات سے نقل کرنے میں اپنی طرف سے تصرف کرتے ہیں۔
4. باوجود اس کے کہ انھوں نے صحیح ترین روایات ذکر کرنے اور بعض ضعیف روایات کی علتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم کہیں کہیں انھوں نے ضعیف روایات بھی ذکر کی ہیں اور ان کے ضعف پر تنبیہ نہیں کی۔

اس کتاب پر ہمارا کام:

اس کتاب کے اختصار کے لیے ہم نے ایک منہج اور لائحہ عمل اختیار کیا جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. ہر حدیث کا ایک عنوان قائم کیا ہے۔
2. جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان احادیث کو روایت کیا ہے ان کے مختصر احوال ذکر کر دیے ہیں۔
3. کتاب میں پھیلی ہوئی روایات کی اسانید کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد ہم نے ان میں سے صحیح ترین روایات کو منتخب کیا ہے جو کہ دار القرآن الکریم کے طلبہ کے لیے مناسب تھیں۔

4 کتاب میں مذکورہ روایات کو ان کے اصل مصادر سے لے کر امام ابن رجب رحمہ اللہ کے ذکر کیے گئے الفاظ کے قریب ترین الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

5 ہم نے بہت سی روایات اور سلف صالحین سے منقول کئی اقوال وامثال کو حذف کر دیا ہے۔ تاہم ہم نے مقررہ نصاب کی پابندی کرتے ہوئے احادیث کی مکمل شرح کو ذکر کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

6 ہم نے بہت سارے مفردات کی لغوی اعتبار سے شرح کر دی ہے تا کہ دارالقرآن الکریم کے طلبہ کو سمجھنے میں آسانی ہو، جن کا علمی معیار مختلف ہوتا ہے۔

7 ہم نے فقہی اختلافات کو نظر انداز کیا ہے اور اہم مسائل میں بس ایک دو مثالیں ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، جن کا واقعات سے ربط وتعلق ہوتا ہے۔

8 ہم نے اس کتاب میں مذکورہ احادیث سے تعلق رکھنے والی بعض ضعیف روایات کو ذکر کر کے ان کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیا ہے، کیونکہ کسی چیز کا علم اس سے ناواقفیت سے بہتر ہے۔

9 ہر حدیث کے آخر میں ہم نے اس سے اخذ کیے گئے فوائد ذکر کر دیے ہیں۔ اس کے بعد حدیث کی شرح سے متعلق کچھ سوالات دے دیے ہیں، تا کہ مذاکرہ کرنے میں آسانی رہے۔

10 احادیث پر نمبر لگا دیے گئے ہیں اور ہر حدیث کا جو نمبر "جامع العلوم والحکم" میں ہے اسے قوسین، یعنی بریکٹ میں ذکر کر دیا ہے۔

11 ہم یہاں تنبیہ کرتے چلیں کہ ہم نے ڈاکٹر ابو النور الاحمدی کی اس کتاب کی تحقیق، ترتیب اور تبویب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اس کا بہترین بدلہ دے۔

12 ہم نے آیات، احادیث اور آثار کی علمی فہرستیں تیار کر دی ہیں۔

13 امام ابن رجب رحمہ اللہ کے کلام کے دوران ہمیں بعض کلمات کی شرح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہم نے یہ علامت [ ] لگا کر معنی کی وضاحت کر دی ہے۔

14 پچاس احادیث میں سے بعض احادیث کو ہم نے ان کے ضعف کی وجہ سے حذف کر دیا ہے۔ اور وہ دو یہ ہیں:

◉ حدیث نمبر: (31)

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہما کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد:

«اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ»

''تم دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔''

اس کی سند میں ایک راوی خالد بن عمرو القرشی ہے جو کہ متروک ہے۔

⊙ حدیث نمبر: (41)

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ»

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے مطابق ہو جائیں۔''

اس کی سند میں ایک راوی نعیم بن حماد ہے جو کہ منکر الحدیث ہے۔

مذکورہ دونوں حدیثوں کے بارے میں امام ابن رجب رحمہ اللہ کا کلام آپ اصل کتاب میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

آخر میں ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر اس کا بے انتہا شکر بجالاتے ہیں کہ جس نے ہمیں امام ابن رجب رحمہ اللہ کی کتاب ''جامع العلوم والحکم'' کا مطالعہ کرنے اور اس کو مختصر کرنے کا شرف بخشا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اس عمل کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کے ذریعے امتِ مسلمہ کو فائدہ پہنچائے۔ نیز ہم سے ایسا کام لے لے جس پر وہ ہم سے راضی ہو جائے اور ہمیں اپنے محبوب وپسندیدہ اعمال کی توفیق دے۔ وہی اس کی توفیق دینے پر قادر ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

وصلى الله وسلم على نبينا محمد النبي الأمين وعلى آله وصحبه أجمعين.



حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ

نام ونسب اور پیدائش:

امام، حافظ، علامہ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد بن ابی البرکات مسعود السلامی بغدادی دمشقی، حنبلی۔ ابن رجب کے نام سے مشہور ہیں جو کہ ان کے دادا عبدالرحمٰن کا لقب تھا۔

تمام مصادر جن میں موصوف کے سوانح حیات ذکر کیے گئے ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ آپ بغداد میں سال 736ھ کے دوران پیدا ہوئے، مغول کے ہاتھوں سقوطِ بغداد کے اسی 80 سال بعد۔

طلب علم کی ابتدا:

آپ کے والد رحمہ اللہ کی کوشش تھی کہ آپ ان ثقہ شیوخ الحدیث سے حدیث کا سماع کریں اور ان سے روایتِ حدیث کی اجازات حاصل کریں، جو مختلف شہروں میں روایتِ حدیث میں شہرت رکھتے تھے اور علمی اعتبار سے مانے جاتے تھے۔ تاکہ یہ چیز ان کے لیے طلبِ علم اور تحمّلِ حدیث کو مسلسل جاری رکھنے میں حوصلہ افزائی کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد کی خصوصی توجہ کی بنا پر بغداد، دمشق اور مصر وغیرہ میں بہت سارے شیوخ الحدیث سے سماع کیا اور ان میں سے کئی شیوخ الحدیث نے انھیں اجازات بھی دیں۔

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کے شیوخ:

ان کے والد انھیں سال 744ھ میں دمشق میں لے آئے تاکہ وہ اس زمانے کے ان محدثین اور بڑے شیوخ الحدیث سے سماعِ حدیث کر لیں جن کی سندیں عالی تھیں۔ اس وقت دمشق علمی مراکز میں سے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر چہار جانب سے اسلامی علوم کے حصول کے لیے طلاب العلم اس کا قصد کرتے تھے۔ اس میں بہت سارے مدارس پائے جاتے تھے جو علمی سرگرمیوں کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔ یہ مدارس مسلم امراء نے بنائے تھے جنھیں علم سے گہری محبت تھی، اور وہ علمی کاموں میں مشغول رہنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور ان کے لیے سازگار ماحول مہیا کرنے میں مددگار ہوتے تھے۔

چنانچہ حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے دمشق میں درج ذیل شیوخ سے سماعِ حدیث کا شرف حاصل کیا:

- أبو العباس أحمد بن الحسن بن عبد الله الشهير بابن قاضي الجبل، المتوفى سنة ٧٧١هـ
- شهاب الدين أبو العباس أحمد بن عبد الرحمن الحريري المقدسي الصالحي، المتوفى سنة ٧٥٨هـ
- عماد الدين أبو العباس أحمد بن عبد الهادي بن يوسف بن محمد بن قدام المقدسي، المتوفى سنة ٧٥٤هـ
- علاء الدين على بن زين الدين المنجا، المتوفى سنة ٧٥٠هـ
- مسند العصر عمر بن حسن بن فريد بن أميلة المراغي الحلبي، ثم الدمشقي، ثم المزي، المتوفى سنة ٧٧٨هـ
- الفقيه الفرضي جمال الدين يوسف بن عبدالله بن العفيف محمد النابلسي، المتوفى سنة ٧٥٤هـ
- شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أبي بكر بن أيوب الزرعي الشهير بابن القيم الجوزية، المتوفى سنة ٧٥١هـ

اس کے بعد موصوف سال 754ھ سے پہلے مصر چلے گئے جہاں انھوں نے درج ذیل شیوخ سے سماع کیا:

- عز الدين عبد العزيز بن محمد بن إبراهيم بن سعد الله بن جماعة، قاضي الديار المصرية، المتوفى سنة ٧٦٧هـ
- الحافظ الكبير زين الدين أبو الفضل عبد الرحيم بن الحسين العراقي، المتوفى سنة ٨٠٦هـ

طلبِ علم کے لیے سفر:

آپ نے اِس سلسلے میں القدس، نابلس، مصر، حجاز، بغداد اور دمشق کی طرف متعدد مرتبہ سفر کیا۔ بغداد میں انھوں نے درج ذیل شیوخ سے سماع کیا:

- تاج الدين عبد الله بن عبد المؤمن بن الوجيه الواسطي المقرئ، المتوفى سنة ٧٤٠هـ

- سراج الدين أبو حفص عمر بن على بن عمرو القزويني، محدث العراق، المتوفى سنة ٧٥٠ھ
- اور القدس میں انھوں نے الحافظ صلاح الدين أبي سعيد خليل بن كيكلدي العلائي، المتوفى سنة ٧٦١ھ سے سماع کیا۔
- اور مکہ میں انھوں نے سال 749ھ کے دوران فخر الدين عثمان بن يوسف بن أبي بكر النويري الفقيه المالكي، المتوفى سنة ٧٥٦ھ سے سماع کیا۔
- اور مدینہ منورہ میں انھوں نے مدینہ کے مشہور حافظِ حدیث اور مؤرخ عفيف الدين أبو محمد عبد الله بن محمد بن محمد الخزرجي العبادي المطري، المتوفى سنة ٧٦٥ھ سے سماع کیا۔

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کے شاگرد:

جب حافظ ابن رجب رحمہ اللہ طلابِ علم کو فائدہ پہنچانے کے لیے تیار ہوگئے تو طلبہ ان کی طرف متوجہ ہوئے، ان سے علم حاصل کرنے لگے، ان کے علوم سے استفادہ کرنے لگے، ان کی مرویات کا سماع کرنے لگے اور بہت سارے طلاب نے ان سے سندِ فراغت حاصل کی۔ جو بعد میں ثقہ علماء شمار کیے جانے لگے اور علمی اعتبار سے بلند و بالا مقام تک جا پہنچے اور بہت ہی مفید علمی آثار اپنے پیچھے چھوڑے۔

ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

- الفقيه أبو ذر عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله بن محمد المصري الحنبلي، الشهير بالزركشي، صنعة أبيه، المتوفى سنة ٨٤٦ھ
- شيخ الحنابلة الإمام العلامة الأصولي علاء الدين أبو الحسن على بن محمد بن عباس البعلي الدمشقي الحنبلي الشهير بابن اللحام، صنعة أبيه، المتوفى سنة ٨٠٣ھ
- الإمام الواعظ صدر الدين أبو بكر بن إبراهيم بن محمد بن مفلح، المتوفى سنة ٨٢٥ھ

ان کے علاوہ بہت زیادہ۔

موصوف کے بارے میں علماء کے اقوال:

قاضی علاء الدین بن اللحام سے یوسف بن عبدالہادی نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کے بارے میں کہا:

"سيدنا وشيخنا الإمام العالم العلامة الأوحد الحافظ شيخ السلام ...... "

"جو علمی اعتبار سے مشکل مسائل کو حل کرنے والے اور مبہمات کی وضاحت کرنے والے تھے۔"

اسی طرح انھوں نے کہا:

"شيخنا الإمام العالم الحافظ بقية السلف الكريم، وحيد عصره، وفريد دهره شيخ الإسلام ...... "①

ملکِ شام کے حافظ، اسلام کے عظیم مؤرخ شہاب الدین احمد بن حجی سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کے بارے میں کہا:

"انھوں نے فنون میں مہارت حاصل کی اور وہ اپنے زمانے میں علتوں اور طرقِ حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ دمشق میں ہمارے زیادہ تر ساتھیوں نے انھی سے سندِ فراغت حاصل کی۔"②

ابن ناصر الدین الدمشقی کہتے ہیں:

"الشيخ الإمام العلامة الزاهد القدوة البركة الحافظ العمدة الثقة الحجة، أوعظ المسلمين، مفيد المحدثين .... أحد الأئمة الزهاد والعلماء العباد ......"③

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"الشيخ المحدث الحافظ ...." "آپ نے فنونِ حدیث میں مہارت حاصل کی، اسماء و رجال ہوں، حدیث کے طرق ہوں، ان کے معانی ہوں، سب میں ماہر تھے اور بہت ہی عبادت گزار اور تہجد گزار تھے۔"④

یوسف بن عبدالہادی کہتے ہیں:

"الشيخ الإمام أوحد الأنام، قدوة الحفاظ، جامع الشتات والفضائل، الفقيه الزاهد البارع الأصولي، الفقيه المحدث"

① الجوهر المنضد (ص: ٤٧)

② أنباء الغمر (١٧٦/٣)

③ الرد الوافر (ص: ١٧٦)

④ الدرر الكامنة (٣٢٢/٢)، أنباء الغمر (١٧٦/٣)

ابن العماد کہتے ہیں:

"الشيخ الإمام العالم العلامة الزاهد القدوة البركة الحافظ العمدة الثقة الحجة"[1]

تصانیف:

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ اپنے زمانے کے علماء میں تصنیف وتالیف پر سب سے زیادہ قدرت رکھتے تھے اور ان میں سب سے زیادہ ماہر تھے، چنانچہ انھوں نے بہت ساری مفید کتب تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور رقائق وغیرہ میں تصنیف کیں، جو ان کے وسیع علم، متعدد صلاحیتوں، اخلاص اور زہد کی دلیل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے علوم القرآن میں درج ذیل کتب تصنیف کیں:

1. تفسير سورة النصر
2. تفسير سورة الإخلاص
3. إعراب البسملة
4. إعراب أم الكتاب
5. تفسير سورة الفاتحة
6. الإستغناء بالقرآن

اور حدیث میں درج ذیل کتب تصنیف کیں:

1. فتح الباري شرح صحيح البخاري۔ اس شرح میں وہ کتاب الجنائز تک ہی پہنچے تھے۔ اور اسی نام سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی اپنی شرح کا نام بھی فتح الباری رکھا۔
2. شرح جامع الترمذي۔ یہ تقریباً 20 جلدوں میں تھی لیکن سال 803ھ کے دوران تاتاری فتنے میں جو تراثِ اسلامی کی کتب ضائع ہوئی تھیں، ان میں یہ کتاب بھی شامل تھی۔

- موصوف نے متعدد احادیث کی شرح میں چھوٹے بڑے کئی رسائل تصنیف کیے، جن میں سے ہر ایک میں ایک حدیث کی شرح ہے۔ ان میں سے کئی مطبوع ہیں اور کئی غیر مطبوع ہیں۔ مطبوعہ رسائل میں درج ذیل رسائل شامل ہیں:

3. الحِكم الجديرة بالإذاعة من قول النبي ﷺ: «بُعِثْتُ بِالسَّيْفِ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ»
4. شرح حديث كعب بن مالك عن النبي ﷺ: «مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِي غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ»
5. اختيار الأولى في شرح اختصام الملأ الأعلى

[1] شذرات الذهب (٦/٣٣٩)

6 الكلام على كلمة الإخلاص وتحقيقها، وهي شرح حديث أنس رضي الله عنه، قال كان النبي ﷺ ومعاذ رديفه على الرحل .....

7 غاية النفع في شرح حديث تمثيل المؤمن بخامة الزرع، وهو شرح حديث: «مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَخَامَةِ الزَّرْعِ يَفِيْءُ وَرَقُهُ مِنْ حَيْثُ أَتَتْهَا الرِّيْحُ تُكَفِئُهَا»

8 نور الاقتباس في مشكاة وصية النبي ﷺ لابن عباس: «يَا غُلَامِ، إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ، اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ»

9 كشف الكربة في وصف حال أهل الغربة، وهو شرح حديث: «بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ طُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ»

اور غیر مطبوع رسائل میں سے کچھ یہ ہیں:

10 شرح حديث زيد بن ثابت أن النبي ﷺ علمه دعاء وأمره أن يتعاهد به أهله كل يوم، وهو:

«لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ، وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ، وَبِكَ وَمِنْكَ وَإِلَيْكَ، اَللّٰهُمَّ مَا قُلْتُ مِنْ قَوْلٍ أَوْ نَذَرْتُ مِنْ نَذْرٍ أَوْ حَلَفْتُ مِنْ حَلِفٍ فَمَشِيْئَتُكَ بَيْنَ يَدَيْهِ مَا شِئْتَ كَانَ وَمَا لَمْ تَشَأْ لَمْ يَكُنْ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ، إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ»

11 شرح حديث ابن عباس المرفوع: «اَلْخَمْرُ أُمُّ الْخَبَائِثِ»

12 شرح حديث شداد بن أوس قال سمعت النبي ﷺ يقول: «إِذَا كَنَزَ النَّاسُ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ، فَاكْنِزُوْا هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ .....»

13 شرح حديث عمار بن ياسر أن النبي ﷺ كان يدعو بهؤلاء الكلمات: «اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ .....»

14 مختصر فيما روي عن أهل المعرفة والحقائق في معاملة الظالم السارق.

15 شرح حديث: «يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلَاثٌ ......»

16 رسالة في فضل صدقة السر.

17 شرح حديث أبي سعيد الخدري: «غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِنْ نَفْسِكَ»

18 شرح حديث أبي أمامة عن النبيﷺ: «إِنَّ أَغْبَطَ أَوْلِيَائِي عِنْدِي مُؤْمِنٌ»

19 البشارة العظمى للمؤمن بأن حظه من النار الحمى، وهو شرح حديث أبي أمامة عن النبيﷺ: «اَلْحُمَّى كِيرٌ مِنْ جَهَنَّمَ، فَمَا أَصَابَ الْمُؤْمِنَ مِنْهَا، كَانَ حَظَّهُ مِنْ جَهَنَّمَ»

20 شرح علل الترمذي.

فقہ میں حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کی مؤلفات:

1 القواعد الفقهية.

2 الاستخراج في أحكام الخراج.

3 كتاب أحكام الخواتيم وما يتعلق بها.

⊙ فقہ میں غیر مطبوع مؤلفات:

4 إزالة الشنعة عن الصلاة بعد النداء يوم الجمعة.

5 الإيضاح والبيان في طلاق كلام الغضبان.

6 الرد على من اتبع غير المذاهب الأربع.

7 القول العذب في تزويج أمهات أولاد الغياب.

8 الكشف والبيان عن حقيقة النذور والأيمان.

9 نزهة الأسماع في مسألة السماع.

10 تعليق الطلاق بالولادة.

11 مشكلة الأحاديث الواردة في أن الطلاق الثلاث واحدة.

تراجم میں حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کی مؤلفات:

1 الذيل على طبقات الحنابلة.

2 مختصر سيرة عمر بن عبد العزيز.

3 سيرة عبد الملك بن عمر بن عبد العزيز.

4 مشيخة ابن رجب.

5 وقعة بدر.

وعظ، فضائل اور رقائق میں حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کی مؤلفات:

1. لطائف المعارف فيما لمواسم العام من الوظائف.
2. فضل علم السلف على علم الخلف.
3. التخويف من النار والتعريف بحال دار البوار.
4. أهوال يوم القيامة.
5. أهوال القبور.
6. الفرق بين النصيحة والتعيير.
7. الذل والانكسار للعزيز الجبار، مطبوع بعنوان: الخشوع فى الصلاة.
8. فضائل الشام.
9. استنشاق نسيم الأنس من نفحات رياض القدس.
10. الإلمام في فضائل بيت الله الحرام.
11. الاستيطان فيما يعتصم به العبد من الشيطان.
12. ذم الخمر.

وفات:

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ سال 795ھ کے دوران دمشق میں فوت ہوئے اور ''الباب الصغیر'' کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔



اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے

(1) امیر المومنین ابوحفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ»[1]

''بے شک اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ لہٰذا جس آدمی نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی، تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی ہے۔ اور جس آدمی نے دنیا کے حصول کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہجرت کی، تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔''

راویِ حدیث:

امیر المومنین عمر بن خطاب بن نفیل القرشی العدوی ابوحفص الفاروق، دوسرے خلیفۂ راشد، جنھیں سب سے پہلے امیر المومنین کا لقب دیا گیا، عظیم بہادر صحابی، پختہ عزم، حکمت وعدل سے بھرپور اور جن کے ہاتھوں بہت ساری فتوحات حاصل ہوئیں۔ آپ جاہلیت کے دور میں زعمائے قریش میں سے تھے اور ان میں سفارتکاری بھی کرتے تھے۔ آپ ہجرت سے پانچ سال قبل مشرف باسلام ہوئے۔ آپ کے اسلام قبول کرنے پر مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی۔ آپ حجاز اور شام کے درمیان تجارت کرتے تھے۔ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن بطورِ خلیفہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ آپ ۲۳ھ میں ابولولو مجوسی (جو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا غلام تھا) کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ آپ سے پانچ سو احادیث مروی ہیں۔

---

(1) رواه البخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله، رقم الحديث (1) ومسلم، كتاب الإمارة، باب قوله: إنما الأعمال بالنية، رقم الحديث (1907)

درجۂ حدیث:

تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث صحیح اور قابلِ قبول ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' کا آغاز اسی حدیث سے کر کے اسے اپنی کتاب کی تمہید کے قائم مقام تصور کیا ہے اور اس سے انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر وہ عمل جس سے مقصود رضائے الٰہی کا حصول نہ ہو وہ باطل ہے اور اس کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی آخرت میں کچھ ملنے والا ہے۔ اسی لیے عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اگر میں ابواب پر مشتمل کوئی کتاب تصنیف کرنا چاہوں تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اِس حدیث کو ہر باب کے شروع میں ذکر کروں گا۔ اور انہی سے یہ بات بھی مروی ہے کہ جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرنا چاہے تو وہ اسی حدیث کے ساتھ اس کی ابتدا کرے۔

اسلام میں اِس حدیث کا مرتبہ:

یہ حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر پورے دین کا دار ومدار ہے۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:

''یہ حدیث علم کا تیسرا حصہ ہے اور یہ فقہ کے ستر ابواب میں داخل ہوتی ہے۔''

اور امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اسلام کے اصول تین احادیث پر مبنی ہیں:

1. حدیثِ عمر رضی اللہ عنہ: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ »
2. حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا: « مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »
3. حدیثِ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما: « اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ ..... »

تقریباً اسی طرح کے اقوال حاکم، اسحاق بن راہویہ، ابوعبید اور ابوداود رحمہم اللہ سے بھی منقول ہیں۔

فرمانِ نبوی: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » کا معنی:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » جو کہ ایک روایت کے مطابق « اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » کے الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ان دونوں الفاظ میں صحیح قول کے مطابق حصر پایا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال نیتوں کے ساتھ ہی واقع ہوتے یا حاصل ہوتے ہیں۔ گویا کہ اختیاری اعمال کے متعلق خبر دی جا رہی ہے کہ وہ عمل کرنے والے کے قصد کے ساتھ ہی واقع ہوتے ہیں اور وہی قصد ہی ان اعمال کو معرضِ وجود میں لانے کا اصل سبب ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: « وَإِنَّمَا لِكُلِّ

امْرِئٍ مَا نَوَى» میں شرعی حکم کی خبر دی جا رہی ہے کہ عمل کرنے والے کو اپنے عمل سے وہی حصہ ملتا ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کی نیت اچھی ہو تو عمل بھی اچھا تصور کیا جاتا ہے اور اسے اجر بھی ملتا ہے۔ اور اگر اس کی نیت فاسد ہو تو اس کا عمل بھی فاسد تصور کیا جاتا ہے، اور اسے اس کا گناہ بھی ہوتا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کے فرمان: «اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» میں اصل عبارت یوں ہو:

''اَلْأَعْمَالُ صَالِحَةٌ أَوْ فَاسِدَةٌ بِالنِّيَّاتِ''

یعنی ''اعمال نیتوں کے ساتھ ہی صالح یا فاسد ہوتے ہیں۔''

یا یوں ہو: ''اَلْأَعْمَالُ مَقْبُوْلَةٌ أَوْ مَرْدُوْدَةٌ بِالنِّيَّاتِ''

یعنی ''اعمال نیتوں کے ساتھ ہی مقبول یا مردود ہوتے ہیں۔''

یا یوں ہو: ''اَلْأَعْمَالُ مُثَابٌ عَلَيْهَا أَوْ غَيْرُ مُثَابٌ عَلَيْهَا بِالنِّيَّاتِ''

یعنی ''نیتوں کے ساتھ ہی اعمال پر ثواب دیا جاتا ہے یا نہیں دیا جاتا۔''

گویا اس میں شرعی حکم کی خبر دی جا رہی ہے کہ اعمال کے ٹھیک ہونے یا فاسد ہونے کا انحصار نیتوں کے ٹھیک یا فاسد ہونے پر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ آپ ﷺ کے اس فرمان: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ » میں بتایا گیا ہے کہ اعمال کے ٹھیک ہونے یا فاسد ہونے، یا ان کے قبول ہونے یا قبول نہ ہونے کا دار و مدار انسان کے خاتمہ پر ہے۔[1]

فرمانِ نبوی: «وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى» کا معنی:

آپ ﷺ کے اس فرمان میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو اپنے عمل سے وہی چیز ملتی ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کی نیت خیر و بھلائی کی ہو تو اسے خیر و بھلائی ملتی ہے۔ اور اگر اس کی نیت شر کی ہو تو اسے شر ہی ملتا ہے۔

یہ جملہ پہلے جملے کا تکرار نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے مختلف ہے۔ پہلا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عمل کے ٹھیک ہونے یا فاسد ہونے کا انحصار اس نیت پر ہے جو اس عمل کو معرضِ وجود میں لانے کا سبب بنی۔ جب کہ دوسرا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عمل کرنے والے کو اپنے عمل کا ثواب اس کی اچھی نیت کے مطابق ہی ملتا ہے اور اس کی سزا بھی اس کو اس کی فاسد نیت کے مطابق ہی ملتی ہے۔ اور کبھی

[1] یاد رہے کہ مذکورہ حدیث ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے اور اس کا حوالہ یہ ہے: صحیح البخاري، کتاب الرقاق، باب الأعمال بالخواتیم، رقم الحدیث: (6493)

نیت مباح ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے عمل بھی مباح ہو جاتا ہے جس سے نہ اسے کوئی ثواب ملتا ہے اور نہ ہی سزا۔ لہٰذا بذاتِ خود عمل کے ٹھیک ہونے یا فاسد ہونے یا مباح ہونے کا انحصار اس نیت پر ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کرتی اور اسے معرضِ وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ اور عمل کرنے والے کا ثواب یا اس کی سزا اس کی اس نیت پر منحصر ہے جس کے ساتھ اس کا عمل ٹھیک یا فاسد یا مباح قرار پاتا ہے۔

نیت کی لغوی واصطلاحی تعریف:

نیت: عربی زبان میں قصد وارادہ ہی کی ایک قسم ہے، اگرچہ ان الفاظ میں فرق بھی کیا گیا ہے تاہم اسے یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

علماء کی اصطلاح میں ''نیت'' کے دو معنی ہیں:

پہلا معنی: عبادات میں ایک عبادت کو دوسری عبادت سے الگ کرنا اور ان کے درمیان امتیاز قائم کرنا، مثلاً: نمازِ ظہر کو نمازِ عصر سے الگ کرنا، رمضان کے روزوں کو دیگر روزوں سے الگ کرنا ...... یا عبادات کو عادات سے الگ کرنا، مثلاً: غسلِ جنابت کو عمومی غسل سے جو ٹھنڈک یا صفائی کے لیے کیا جاتا ہے الگ کرنا۔ یہی وہ نیت ہے جو فقہاء کی کتب میں ذکر کی جاتی ہے۔

دوسرا معنی: عمل سے جو چیز مقصود ہے اسے واضح کرنا، یعنی یہ واضح کرنا کہ یہ عمل محض اللہ کی رضا کے لیے ہے اور اس میں اس کے علاوہ کوئی شریک نہیں یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے! اور یہی وہ نیت ہے جس کا تذکرہ اہلِ علم ومعرفت اکثر اپنی کتب میں اخلاص وغیرہ کے ضمن میں کرتے ہیں۔ اور یہی وہ نیت ہے جو متقدمین سلف صالحین کے کلام میں اکثر پائی جاتی ہے۔

فرمانِ نبوی: «فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهِ، فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ»

جملوں کی ترتیب میں کیا حکمت ہے؟:

حدیث کے پہلے دو جملے جن میں یہ بتایا گیا کہ اعمال کا دار ومدار نیتوں پر ہے اور عمل کرنے والے کو اس کے عمل سے خیر وشر میں سے وہی چیز ملتی ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے...... یہ دونوں جملے جامع کلمات

پر مشتمل ہیں اور یہ دونوں وہ بنیادی ضابطے اور اصول ہیں کہ جن سے کوئی چیز باہر نہیں نکل سکتی۔ ان دونوں کے بعد آپ ﷺ نے ان اعمال میں سے ایک عمل بطورِ مثال ذکر کیا جن کی ظاہری شکل تو ایک ہی ہوتی ہے مگر ان کا ٹھیک ہونا یا فاسد ہونا نیتوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ گویا کہ آنحضور ﷺ یوں فرما رہے ہیں کہ باقی تمام اعمال بھی اسی مثال کے مطابق ہیں۔

ہجرت کا معنیٰ:

بنیادی طور پر ''ہجرت'' کا معنیٰ ہے: دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام کی طرف منتقل ہونا۔ جیسا کہ فتح مکہ سے پہلے مہاجرین نے مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اور ان میں سے بعض لوگ اس سے قبل سرزمینِ نجاشی (حبشہ) کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے آگاہ فرمایا کہ یہ ہجرت نیت اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا جس آدمی نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت، دینِ اسلام کو سیکھنے کی رغبت اور اسے دیگر ادیان پر غالب کرنے کی خاطر ہجرت کی، جبکہ وہ یہ کام دار الشرک میں رہ کر نہیں کر سکتا تھا، تو اس کی ہجرت واقعتاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہے۔ اور یہ اس کے لیے بہت بڑے شرف اور فخر کی بات ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرنے سے وہ چیز مل گئی جس کی اس نے نیت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوابِ شرط «فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ» میں وہی الفاظ دہرائے گئے جو شرط «فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ» میں ذکر کیے گئے تھے، کیونکہ اپنی ہجرت کے ذریعے اس نے جس چیز کی نیت کی اس کا حاصل کر لینا ہی دنیا و آخرت میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔

جس نے دنیا کے لیے ہجرت کی!

جس شخص نے دار الشرک سے دار الاسلام کی طرف اس لیے ہجرت کی کہ وہ دنیا کو حاصل کر لے، یا دار الاسلام میں پہنچ کر کسی عورت سے نکاح کر لے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ دنیا کے حصول کے لیے ہجرت کرنے والا تاجر اور کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کرنے والا خاطب (منگنی کا پیغام دینے والا) تو ہوگا مگر وہ مہاجر نہیں ہوگا۔

آپ ﷺ کے فرمان: «فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ» میں دراصل اس دنیاوی امر کی تحقیر کرنا مقصود ہے جس کا وہ طالب تھا۔ اسے اصل الفاظ کے ساتھ ذکر نہ کرنا اسے ہلکا قرار دینے کے مترادف ہے۔

دونوں شرطوں کے جوابات میں شرطوں والے الفاظ کے اعادے کی ایک اور حکمت:

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت ایک ہی ہوتی ہے، الگ الگ نہیں۔ اسی لیے «فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ» کے جواب میں انہی الفاظ «فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ» کا اعادہ کیا گیا۔ جبکہ ہجرت کے دنیاوی مقاصد کا کوئی شمار ہی نہیں ہے، بعض اوقات دنیاوی امور کے حصول کے لیے انسان کی ہجرت مباح ہوتی ہے اور بعض اوقات حرام ہوتی ہے۔ اور چونکہ دنیاوی اغراض و مقاصد جن کی خاطر ہجرت کی جاتی ہے بہت زیادہ ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: «فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ» یعنی جو بھی مقصد ہو گا اس کی ہجرت اسی کے لیے تصور کی جائے گی، نہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے۔

ام قیس کی طرف ہجرت کرنے والے شخص کا قصہ:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم میں ایک آدمی تھا جس نے ام قیس نامی ایک عورت کو شادی کا پیغام بھیجا تو اس نے اس سے انکار کر دیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر تم میری طرف ہجرت کر کے آ جاؤ تو پھر میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ تو اس نے ہجرت کر کے اس سے شادی کر لی۔ اسی لیے ہم اسے (مہاجر ام قیس) امِ قیس کی طرف ہجرت کرنے والا کہا کرتے تھے۔[1]

یہ بات مشہور ہے کہ (مہاجرِ امِ قیس) کا واقعہ ہی نبی کریم ﷺ کے اِس فرمان: «وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا» کا سبب بنا اور بہت سارے متاخرین نے اپنی کتابوں میں اسی بات کو ذکر کیا ہے، لیکن کسی صحیح سند کے ساتھ یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی۔ واللہ اعلم

تمام اعمال کو ہجرت پر قیاس کیا جائے گا:

حدیث کا جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے اس میں تمام اعمال کو ہجرت پر قیاس کیا جائے گا، لہٰذا جہاد ہو یا حج، کوئی بھی عملِ صالح ہو اس کا ٹھیک ہونا یا فاسد ہونا عمل کرنے والے کی نیت کے مطابق ہو گا جس کی بنا پر اس نے وہ عمل سرانجام دیا۔

صحیحین میں ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر

---

[1] حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ اس قصہ کو سعید بن منصور اور طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے جس کی سند ان کے بقول: صحیح علی شرط الشیخین ہے، تاہم ان کا کہنا ہے کہ اس میں اِس بات کی تصریح نہیں ہے کہ یہ حدیث: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» اسی واقعہ کی بنا پر لائی گئی۔ فتح الباری: (16/1)

ہوا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! ایک شخص غنیمت کے لیے جنگ کرتا ہے، دوسرا شہرت کے لیے اور تیسرا اس لیے کہ اس کے بارے میں لوگوں کو پتا چل جائے کہ اس نے بھی جنگ میں حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کون ہے جو فی سبیل اللہ جنگ کرتا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ» [1]

''جو شخص اس لیے قتال کرے کہ اللہ کا کلمہ ہی بلند ہو تو وہ فی سبیل اللہ جنگ کرتا ہے۔''

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے، دوسرا حمیت وغیرت کے اظہار کے لیے اور تیسرا ریا کاری کرتے ہوئے قتال کرتا ہے تو ان میں سے کون فی سبیل اللہ قتال کرتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے وہی جواب دیا جو اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ [2]

رضائے الٰہی کے بجائے کسی اور مقصد کے لیے حصولِ علم پر سخت وعید:

رضائے الٰہی کے حصول کے لیے نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لیے علم حاصل کرنے پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيْبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرَفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [3]

''جو علم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے طلب کیا جاسکتا ہو اسے اگر کوئی شخص اس لیے سیکھے کہ وہ دنیا کا ساز وسامان حاصل کر لے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''تین مقاصد کے لیے تم علم کو نہ سیکھا کرو: نہ بے وقوف لوگوں سے بحث وتکرار کے لیے، نہ اہلِ علم سے جدال کے لیے اور نہ ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے۔ بلکہ تم اپنے قول وفعل کے ذریعے اس چیز کو طلب کیا کرو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، کیونکہ وہی چیز باقی رہنے والی ہے، باقی سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔'' [4]

---

[1] البخاري، كتاب الجهاد، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا، رقم الحديث (2810) ومسلم، كتاب الإمارة، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا، رقم الحديث: 149 (1904)

[2] مسلم، كتاب الإمارة، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا، رقم الحديث: 150 (1904)

[3] مسند أحمد (338/2)، سنن أبي داود، كتاب العلم، باب في طلب العلم لغير الله تعالىٰ، رقم الحديث (3664)

[4] سنن الدارمي، مقدمة، باب العمل بالعلم وحسن النية فيه (85/1)

غیر اللہ کے لیے کوئی بھی عمل کرنے پر وعید:

غیر اللہ کے لیے کسی بھی عمل پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اِس امت کو بشارت دے دیجیے کہ اسے بلند مرتبہ اور اونچا مقام نصیب ہوگا، اس میں دین قرار پائے گا اور اسے زمین میں عروج نصیب ہوگا، لہٰذا اس امت کے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص اخروی عمل کے ذریعے دنیا کو حاصل کرنا چاہے گا تو اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔''[1]

غیر اللہ کے لیے عمل کی اقسام:

1 محض ریاکاری:

یعنی بعض اوقات عمل کرنے والا شخص محض ریاکاری کے لیے ہی عمل کرتا ہے اور اس کا ارادہ کسی دنیاوی مقصد کے حصول کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ منافقوں کا حال ان کی نمازوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [النساء: ١٤٢]

''یہ منافق اللہ سے دھوکا بازی کرتے ہیں جبکہ اللہ ہی انھیں دھوکا (کا بدلہ) دینے والا ہے۔ اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں، صرف لوگوں کو دکھلانے کے لیے (نماز ادا کرتے ہیں) اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔''

فرض نمازوں اور روزوں میں اِس طرح کی محض ریاکاری کوئی مومن نہیں کر سکتا! ہاں زکات یا حج وغیرہ جیسے ظاہری اعمال، یا وہ اعمال جن کا فائدہ کئی لوگوں کو ہوسکتا ہے ان میں وہ ایسا کر سکتا ہے، بلکہ ایسے اعمال میں اخلاص تقریباً نایاب ہے۔ اور اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں کہ اِس طرح کا عمل ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کی طرف سے سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

2 اللہ کے لیے عمل کرنا، لیکن ریاکاری کی نیت سے:

یعنی کوئی شخص عمل تو اللہ کے لیے کرے لیکن اس میں کسی اور کو بھی شریک کر لے۔ اگر شروع سے

[1] مسند أحمد (134/5)

ہی اس کی نیت ریا کاری کی تھی تو صحیح دلائل کی روشنی میں اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ باطل ہے اور ریا کاری کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ»[1]

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں اور جو شخص ایسا عمل کرے کہ اس میں میرے ساتھ میرے علاوہ کسی اور کو بھی شریک کرے تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔''

3 عمل میں ریا کاری کے علاوہ کسی اور چیز کی ملاوٹ:

مثلاً: نیتِ جہاد میں ریا کاری تو شامل نہ ہو، لیکن یہ شامل ہو کہ خدمت کرنے پر اجرت ملے گی، یا غنیمت ہاتھ لگے گی، یا تجارت ہوگی، تو اس طرح کے دنیاوی مقاصد کی ملاوٹ جہاد کے اجر میں کمی کر دیتی ہے، عملِ جہاد کلی طور پر باطل نہیں ہوتا۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک غازی جب غنیمت حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنے اجر کا دو تہائی حصہ لے لیتے ہیں۔ اگر انھیں کچھ بھی غنیمت نہ ملے تو انھیں پورا اجر ملتا ہے۔''[2]

اِس حدیث اور گذشتہ احادیث کے درمیان تطبیق:

ہم اس سے پہلے چند احادیث ذکر کر چکے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جو شخص اپنے جہاد کے ذریعے کسی دنیاوی مقصد کے حصول کی نیت کرتا ہے تو اسے بالکل اجر نہیں ملتا۔ تو یہ احادیث دراصل اس بات پر محمول ہیں کہ جہاد کے ذریعے جس شخص کا مقصد ہی دنیا کا حصول ہو تو اسے کچھ بھی نہیں ملتا۔

امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''تاجر اور کرائے پر دینے والوں کا اجر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ جنگ کے دوران اپنی نیتوں میں

[1] مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب من أشرك في عمله غير الله، رقم الحديث (2985)

[2] مسلم، کتاب الإمارة، باب بيان ثواب من غزا فغنم، رقم الحديث (1906)

اخلاص پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اس مجاہد کی طرح نہیں ہو سکتے جو اپنی جان اور اپنے مال کو قربان کر دیتا ہے اور اس کی نیت میں کسی چیز کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔"

اسی طرح جہاد پر اجرت لینے والے شخص کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ درہم لینے کی غرض سے نہ نکلا ہو تو اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، گویا کہ وہ دین کی سربلندی کے لیے ہی نکلا تھا، لیکن اسے کچھ اجرت بھی دے دی گئی جو اس نے وصول کر لی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نیز سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب جنگ میں شریک ہونے کا عزم کر چکا ہو، پھر اسے اللہ تعالیٰ اس کی جد و جہد کے بدلے میں کچھ رزق بھی عطا کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے درہم ملیں گے تو میں جنگ میں شریک ہوں گا ورنہ نہیں، تو اس شخص میں کوئی خیر نہیں ہے۔

اللہ کی رضا کے لیے کیے گئے عمل پر جب اس کی تعریف کی گئی:

ایک شخص خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے عمل کرے، پھر اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دے اور وہ اس کی تعریف کرنا شروع کر دیں جس پر اسے خوشی ہو، اور وہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر مسرور ہو تو اِس سے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس بارے میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آدمی کے متعلق پوچھا گیا جو کوئی عملِ خیر کرے اور اس پر لوگ اس کی تعریف کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ»[1]

"یہ جلد ملنے والی مومن کی خوشخبری ہے۔"

نیت کے بعض فقہی احکام:

نیت کا جو معنی فقہاء مراد لیتے ہیں وہ ہے: عبادات کو عادات سے الگ کرنا، یا عبادات میں ایک عبادت کو دوسری عبادت سے الگ کرنا۔ عبادات کو عادات سے الگ کرنے کی مثال ہے: کھانے پینے کو ترک کرنا۔ چنانچہ بعض اوقات حمیت وغیرت کی بنا پر کھانا پینا چھوڑ دیا جاتا ہے، اور بعض اوقات اس کی قدرت نہ ہونے پر اسے ترک کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات اللہ کی رضا کی خاطر شہوات کو ترک کرنے کے

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب إذا أثني علی الصالح فهي بشریٰ، رقم الحدیث (2642)

لیے ایسے کیا جاتا ہے۔ روزے میں نیت کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے تاکہ امتیاز ہو سکے کہ روزہ دار نے کھانا پینا اللہ کی رضا کے لیے ترک کیا ہے نہ کہ کسی اور مقصد کی خاطر۔

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے، مثلاً: نماز اور روزہ وغیرہ، تو ان کی دو قسمیں ہیں: فرض اور نفل۔ پھر فرض کی بھی کئی اقسام وانواع ہیں۔ چنانچہ فرض نمازیں دن اور رات میں پانچ ہیں اور فرض روزہ کبھی رمضان کے روزوں کی شکل میں اور کبھی کفارہ اور کبھی نذر کے روزوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور ان سب میں امتیاز صرف نیت کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صدقہ کبھی فرض ہوتا ہے اور کبھی نفل۔ اور فرض صدقہ کبھی زکات کی شکل میں اور کبھی کفارہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ تو اس میں بھی امتیاز نیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ ساری صورتیں نبی کریم ﷺ کے فرمان: « وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى » کے عموم میں شامل ہیں۔ تاہم ان میں سے بعض کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف مشہور ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض علماء ہر فرض نماز کے لیے نیت کا تعین کرنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک صرف اتنی نیت ہی کافی ہوتی ہے کہ اب جس نماز کا وقت ہے میں وہی پڑھنے لگا ہوں، اگرچہ وہ اس نماز کا نام ذہن میں نہ بھی لائے۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کا ایک قول ہے۔

رمضان کے روزں کی نیت:

بعض علماء کا موقف ہے کہ ماہِ رمضان المبارک کے روزوں میں اِس کی تعیین کرنا ضروری نہیں کہ یہ روزے رمضان المبارک کے ہیں، بلکہ صرف روزے کی نیت ہی کافی ہوتی ہے، کیونکہ اس مہینے میں کوئی دوسرا روزہ رکھا ہی نہیں جا سکتا، صرف رمضان کے روزے ہی رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی امام احمد رحمہ اللہ کا ایک قول ہے اور بعض اہلِ علم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ رمضان کے روزوں کی نیت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ (جیسے ہی یہ مہینا شروع ہوتا ہے تو) وہ خود بخود متعین ہو جاتا ہے اور اس کی مثال ودائع کو واپس لوٹانے کی طرح ہے۔

قسم اور نیت:

قسم کے مسائل میں بھی نیت کا عمل دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ لغو الیمین (فضول قسم) کا کوئی کفارہ نہیں ہوتا اور اس سے مراد وہ قسم ہے جو بغیر قصد کے زبان پر خود بخود آ جائے، مثلاً: گفتگو کے دوران "لا واللہ"، یا "بلی واللہ" کہنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمٰنِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ [البقرة: ٢٢٥]

''اللہ تعالیٰ تمھاری غیر ارادی قسموں میں تمھاری پکڑ نہیں کرے گا، ہاں ان میں تمھاری پکڑ ضرور کرے گا جن کا تم نے دل سے ارادہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نہایت بخشنے والا اور بڑا ہی بردبار ہے۔''

اسی طرح قسموں میں قسم کھانے والے کی نیت کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قسم سے کس بات کا قصد کیا؟ چنانچہ اگر وہ طلاق یا آزاد کرنے کی قسم کھائے، پھر وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اپنے ظاہری الفاظ کے برخلاف کسی اور بات کا قصد کیا تھا تو اس کا معاملہ اس کے اور اللہ جل شانہ کے مابین چھوڑ دیا جائے گا۔

معاملات ومعاہدات میں نیت:

حدیث: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ .....» سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ خرید وفروخت کے وہ معاملات اور باہمی معاہدے جن میں خفیہ طور پر نیت یہ ہو کہ حرام (یعنی سود وغیرہ) تک رسائی حاصل ہو تو ایسے تمام معاملات اور معاہدے درست نہیں ہوتے، جیسا کہ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ وغیرہم کا مسلک ہے، کیونکہ اِس طرح کے معاہدات کا اصل مقصد سود ہے نہ کہ بیع۔ اور ہر شخص کے لیے وہی ہوتا ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔

اسی طرح عقدِ نکاح کا مقصد اگر حلالہ کرنا ہو تو وہ عقد درست نہیں ہوتا۔ نیز اگر کوئی شخص کھا پی کر روزہ اس لیے توڑ دے کہ وہ جماع کر سکے تو یہ بھی اس کی نیت کی بنا پر درست نہیں ہے۔

عبادات میں زبان کے ساتھ نیت:

نیت: دل کے ارادے کا نام ہے۔ اس لیے عبادات میں دلی ارادے کو زبان پر لانا واجب نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض شاگردوں نے ان کا ایک قول ذکر کیا ہے کہ نماز کی نیت زبان کے ساتھ کرنا لازم ہے، لیکن ان میں سے محقق علماء نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ اور جہاں تک متاخرین فقہاء کا تعلق ہے تو ان میں نماز وغیرہ کی نیت زبان کے ساتھ کرنے کے مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے مستحب اور بعض مکروہ سمجھتے ہیں۔

سلف صالحین اور ائمۂ دین سے ان مسائل کے بارے میں کوئی خاص بات منقول نہیں ہے، ہاں

صرف حج کے متعلق مجاہد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ جب کوئی شخص حج کا ارادہ کرے تو وہ اپنی نیت زبان سے کرے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ تلبیہ میں اس چیز کا نام لے جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ (حج یا عمرہ یا دونوں) کیونکہ نبی کریم ﷺ اپنے تلبیہ میں اس چیز کا ذکر کرتے تھے جو وہ کرنا چاہتے تھے اور آپ ﷺ فرماتے تھے: « لَبَّيْكَ عُمْرَةً وَحَجًّا » جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک احرام باندھتے ہوئے اسے یوں کہنا چاہیے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" یہ بعض فقہاء کا خیال ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کا جو قول ہم نے ذکر کیا ہے وہ اس سلسلے میں واضح نہیں ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. نیت اعمال کا رکن ہے اور اس کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اعمال کو سرانجام دینے پر ثواب مرتب ہو۔
2. مومن پر لازم ہے کہ وہ نیت کے عظیم الشان ہونے پر پورا یقین رکھے اور تمام اعمال میں اس کی اہمیت کو اپنے دل میں بٹھائے، کیونکہ بندوں کے اعمال کا دار و مدار ان کی نیتوں پر ہے۔
3. نیت دل میں ہوتی ہے اور اسے زبان کے ساتھ کرنا درست نہیں ہے۔
4. ریاکاری عمل کو ضائع اور اس کے ثواب کو ختم کر دیتی ہے۔
5. عمل میں اخلاصِ نیت اس کی قبولیت کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خالصتاً اس کی رضا کے لیے ہو۔

سوالات:

1. مذکورہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن پر دین کا دار و مدار ہے، اس کی وضاحت کریں۔
2. « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » کی تشریح کریں۔
3. علماء کے نزدیک نیت کے دو معنی ہیں، انھیں ذکر کریں۔
4. « إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ » کہنے میں کیا حکمت ہے؟
5. ہجرت کی لغوی واصطلاحی تعریف کریں۔
6. شرط: « فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ » کے جواب میں دوبارہ وہی الفاظ « فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ » کیوں ذکر کیے گئے؟
7. اللہ کے ہاں عمل کی قبولیت کے لیے کیا شرطیں ہیں؟

8 درج ذیل مسائل کے بارے میں شرعی حکم ذکر کریں:

- ایک شخص جہاد کی نیت کے ساتھ غنیمت کے حصول کی نیت کر کے جنگ میں شریک ہوا۔
- ایک آدمی نے وضو کی نیت کے ساتھ ٹھنڈک حاصل کرنے کی بھی نیت کر لی۔
- ایک آدمی نے ایک عورت کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ اس کی بیوی ہے، پھر اس نے اسے طلاق دے دی، اس کے بعد پتا چلا کہ وہ تو کوئی اور عورت تھی۔



اسلام، ایمان اور احسان

(2) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی دوران ہم پر ایک آدمی رونما ہوا جس کا لباس انتہائی سفید رنگ کا اور اس کے بال بہت ہی سیاہ رنگ کے تھے، اس پر سفر کے آثار نہ تھے اور نہ ہی ہم میں سے کوئی شخص اسے پہچانتا تھا۔ وہ آیا یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، اس نے اپنے گھٹنوں کو آپ ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آپ ﷺ کی رانوں پر رکھ دیے۔ اور اس نے کہا: اے محمد ﷺ! مجھے اسلام کے متعلق آگاہ کیجیے۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا »، قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ: فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ، وَيُصَدِّقُهُ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيْمَانِ؟ قَالَ: « أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ »، قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ؟ قَالَ: « أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ »، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ؟ قَالَ: « مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ » قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَتِهَا، قَالَ: « أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ »، قَالَ: ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًا، ثُمَّ قَالَ لِي: « يَا عُمَرُ، أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ؟ » قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: « فَإِنَّهُ جِبْرِيْلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ » [1]

''اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں،

[1] رواہ مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الإیمان والإسلام والإحسان، رقم الحدیث (8)

اور تم نماز قائم کرو، زکات دیتے رہو، رمضان کے روزے رکھتے رہو، اور اگر تمھیں استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔''

اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ سائل سوال بھی کر رہا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق بھی کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا: مجھے ایمان کے متعلق آگاہ کیجیے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور اچھی و بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔''

اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا: مجھے احسان کے متعلق آگاہ کیجیے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت یوں کرو کہ جیسے اسے دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ یقیناً تمھیں دیکھ رہا ہے۔''

اس کے بعد اس نے کہا: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس آدمی سے اس کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔''

تو اس نے کہا: مجھے اس کی نشانیوں کے بارے میں بتائیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ کہ ایک لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے۔ اور تم یہ دیکھو کہ ننگے پاؤں چلنے والے، ننگے جسموں والے، فقراء اور بکریوں کے چرواہے تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

پھر وہ شخص چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عمر! کیا تم جانتے ہو کہ سائل کون تھا؟''

میں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ جبریل علیہ السلام تھے جو آپ لوگوں کو آپ کے دین کی تعلیم دینے آئے تھے۔''

مرتبۂ حدیث:

یہ حدیث انتہائی عظیم حدیث ہے، کیونکہ اس میں پورا دین ہی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اسلام، ایمان اور احسان کی وضاحت کرنے کے بعد اس حدیث کے آخر میں ارشاد فرمایا: ''یہ جبریل علیہ السلام تھے جو آپ لوگوں کو آپ کے دین کی تعلیم دینے آئے تھے۔'' جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انہی تین چیزوں کو دین قرار دیا۔

اسلام کا معنی:

نبی کریم ﷺ نے ''اسلام'' کی تشریح اعضاء کے ظاہری اقوال وافعال کے ساتھ کی اور ان میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کے اقرار کا ذکر کیا جو کہ زبانی عمل ہے۔ پھر جن چار اعمال کا ذکر کیا ان کی تین قسمیں ہیں: بدنی عمل، یعنی نماز اور روزہ۔ مالی عمل، یعنی زکات اور بدنی ومالی عمل، یعنی حجِ بیت اللہ۔

صحیح ابن حبان کی روایت میں عمرہ، غسلِ جنابت اور وضو کا ذکر بھی آیا ہے۔[1]

اس میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ تمام ظاہری واجبات ''اسلام'' میں شامل ہیں۔ تاہم یہاں اِس حدیث میں اسلام کے صرف وہ اعمال ذکر کیے گئے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔ جیسا کہ ہم سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث: «بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ» کی تشریح کرتے ہوئے اس کی وضاحت کریں گے۔ ان شا اللہ تعالیٰ

بعض روایات میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا: اگر میں یہ سب کچھ کروں تو کیا میں مسلمان ہوں گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اسلام کے ان پانچوں بنیادی ارکان پر عمل کرے گا وہی سچا مسلمان ہوگا۔ حالانکہ جو آدمی صرف شہادتین کا اقرار کر لے تو وہ حکما مسلمان تو ہو جاتا ہے، لیکن اسلام میں داخل ہونے کے بعد اس پر یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کے باقی ارکان پر عمل کرے اور جو شخص شہادتین کو ہی چھوڑ دے تو وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ رہا نماز کا ترک کرنا یا اسلام کے دیگر ارکان کو چھوڑنا تو کیا اس سے مسلمان اسلام سے خارج ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کے مابین مشہور اختلاف پایا جاتا ہے۔

---

[1] صحيح ابن حبان، رقم الحديث (173) الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان (198/1)

قرآن وسنت میں ایمان کا معنی:

نبی کریم ﷺ نے اِس حدیث میں ''ایمان'' کی تشریح ان امور کے ساتھ کی ہے جن کا تعلق باطنی اعتقاد کے ساتھ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور اچھی و بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔''

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ''قرآن مجید'' میں مذکورہ ارکانِ ایمان میں سے پانچ کا ذکر متعدد آیات میں فرمایا ہے، مثلاً: اس کا فرمان ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٨٥]

''رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتاری گئی اور مومن بھی ایمان لائے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ﴾

[البقرة: ١٧٧]

''درحقیقت نیکی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لائے۔''

ایمان بالرسل کا لازمی تقاضا:

رسل علیہم السلام پر ایمان لانے سے یہ بات لازم آتی ہے کہ انھوں نے جس چیز کی خبر دی اس پر بھی سچا ایمان لایا جائے۔ مثلاً: فرشتے، انبیاء، آسمانی کتابیں، قیامت کے روز دوبارہ اٹھایا جانا اور تقدیر وغیرہ۔ اسی طرح انھوں نے اللہ تعالیٰ کی جو صفات ذکر کیں، آخرت کے متعلق جن امور پر تنبیہ کی، مثلاً: میزان (ترازو)، پل صراط اور جنت ودوزخ ...... تو ان تمام امور پر ایمان لانا بھی لازم ہے۔

ایمان میں اچھی اور بری تقدیر کو ماننا بھی شامل ہے۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اِس حدیث کو حجت بناتے ہوئے ان لوگوں پر سخت تنقید کی جنھوں نے تقدیر کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور ان کا دعویٰ تھا کہ ہر کام از خود نئے سرے سے ہو رہا ہے، اس کے بارے میں پہلے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی تقدیر

موجود نہیں ہے۔ موصوف نے ایسے لوگوں سے بیزاری کا اظہار کیا اور ان کے بارے میں خبر دی کہ ان کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہے جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہیں لاتے۔

یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کا انکار کیا وہ بصرہ میں رہائش پذیر معبد الجہنی تھا۔ چنانچہ میں اور حمید بن عبد الرحمٰن الحمیری جب حج یا عمرہ کی غرض سے روانہ ہوئے تو ہم نے کہا: اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی صحابی سے ہماری ملاقات ہو جائے تو ہم ان سے تقدیر کا انکار کرنے والے اِن لوگوں کے بارے میں پوچھیں گے۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت ہی ہماری ملاقات سیدنا عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے ہوگئی۔ سو ہم نے انھیں گھیر لیا، ہم میں سے ایک ان کی دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب تھا۔ میں نے یہ گمان کیا کہ میرا ساتھی مجھے بولنے کا موقع دے گا، اس لیے میں نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا: ابو عبد الرحمٰن! ہماری طرف کچھ ایسے لوگ ظاہر ہو گئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم طلب کرتے اور اس کی اتباع کرتے ہیں ...... اس کے علاوہ ان کی کچھ اور صفات بھی ذکر کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ تقدیر نہیں ہے اور ہر کام از سرِ نو خود بخود واقع ہوتا ہے۔ تو عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے کہا:

> ''جب تم ان سے ملو تو انھیں خبر دینا کہ میں ان سے بیزار ہوں اور وہ مجھ سے لاتعلق ہیں۔ اور اللہ کی قسم! اگر ان میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔......'' الخ

ایمان بالقدر کے دو درجات:

❁ پہلا درجہ:

اس بات پر ایمان لانا کہ بندوں کو پیدا کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ کیا خیر و شر اور اطاعت و نافرمانی کریں گے، ان میں سے کون جنت والوں میں سے اور کون جہنم والوں میں سے ہوگا، اس کے علاوہ اس نے انھیں پیدا کرنے سے قبل ہی ان کے لیے ان کے اعمال کی جزا اور سزا کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور یہ سب اس نے اپنے پاس لکھ لیا تھا اور اس کا ریکارڈ بھی تیار کر لیا تھا۔ لہٰذا اِس پر یقینِ کامل ہونا چاہیے کہ بندے اسی طرح عمل کر رہے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی معلوم تھا اور اس نے لکھ رکھا تھا۔

❁ دوسرا درجہ:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال و اعمال کا خالق ہے۔ کفر ہو یا ایمان، اطاعت ہو یا نافرمانی سب

کچھ اس کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ تقدیر کا یہ درجہ اہل السنہ والجماعہ ثابت کرتے، جبکہ قدریہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ قدریہ میں سے کئی لوگ پہلے درجہ کو مانتے ہیں تاہم ان میں سے جن لوگوں نے غلو (حد سے تجاوز) کیا، مثلاً: معبد الجہنی جس کے بارے میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا تھا اور عمرو بن عبید وغیرہ، تو انھوں نے اسے بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے قدیم علم کا انکار کیا تو امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ جیسے دیگر کئی ائمۂ اسلام نے صراحتاً کہا ہے کہ وہ کافر ہیں۔

ایمان اور اسلام کے درمیان فرق:

اِس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کے درمیان فرق کیا ہے اور تمام اعمال کو اسلام کا حصہ قرار دیا ہے نہ کہ ایمان کا۔ جبکہ سلف صالحین اور اہلِ حدیث کا مشہور مسلک یہ ہے کہ ایمان قول وعمل اور اعتقاد کا نام ہے اور تمام اعمال ایمان کے اندر داخل ہیں، حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ان کے بعد ان کے پیروکاروں کا اجماع نقل کیا ہے۔ سلف صالحین نے ان لوگوں پر شدید تنقید کی ہے جنھوں نے اعمال کو ایمان سے الگ تھلگ تصور کیا۔ ان کے نزدیک یہ ایک نیا ایجاد کردہ قول ہے جس کا پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ ان تنقید کرنے والوں میں سعید بن جبیر، میمون بن مہران، قتادہ، ایوب سختیانی، نخعی، زہری اور یحییٰ بن ابی کثیر رحمہم اللہ وغیرہم شامل ہیں اور امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سلف صالحین ایمان اور عمل کے درمیان فرق نہیں کرتے تھے۔

اعمال ایمان کے اندر داخل ہیں:

اعمال کا ایمان میں داخل ہونا اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان سے ثابت ہوتا ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴾ [الأنفال: ٢۔٤]

''سچے مومن تو وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اور جب انھیں اللہ کی آیات سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے رب

پر ہی بھروسا کرتے ہیں۔ اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو مال و دولت انھیں دے رکھا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے مومن ہیں جن کے لیے ان کے رب کے ہاں درجات ہیں، بخشش اور عزت کی روزی ہے۔''

اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس کو فرمایا تھا:

''میں تمھیں چار چیزوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا جو کہ اکیلا ہے۔ اور کیا تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان لانا کیا ہے؟ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، نماز قائم کرنا، زکات دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور غنیمت کا پانچواں حصہ دینا۔''[1]

مذکورہ دلائل کے درمیان تطبیق کا طریقہ کار:

جو احادیث ہم نے ابھی ذکر کی ہیں ان کے اور حدیثِ جبریل (جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کے درمیان فرق کرتے ہوئے ظاہری اعمال کو اسلام میں شامل کیا، ایمان میں نہیں) کے درمیان تطبیق کا طریقہ کار ایک اصولی بات کے اثبات کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک لفظ اگر اکیلا وارد ہو تو وہ متعدد چیزوں کو شامل ہوتا ہے اور اگر کسی دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر آئے تو ان چیزوں میں سے کچھ اس میں آجاتی ہیں اور کچھ دوسرے لفظ میں۔ اس کی مثال لفظ ''فقیر'' اور لفظ ''مسکین'' ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی لفظ اگر اکیلا ہو تو اس میں ہر محتاج شامل ہوتا ہے۔ اور اگر دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر آئے تو چند خاص قسم کے محتاج لوگ ایک لفظ میں شامل ہو جاتے ہیں اور باقی لوگ دوسرے لفظ میں آجاتے ہیں۔ اسی طرح اسلام اور ایمان کا معاملہ ہے، چنانچہ ان میں سے کوئی ایک اگر اکیلا ہو تو دوسرا بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے اور جس چیز پر دوسرا لفظ دلالت کرتا ہے وہ اسی اکیلے لفظ میں ہی آجاتی ہے۔ اور اگر یہ دونوں اکٹھے ہوں (جیسا کہ حدیثِ جبریل میں اکٹھے ہیں) تو ان میں سے ہر ایک کا مفہوم و مدلول الگ الگ ہوتا ہے اور جن چیزوں پر وہ دلالت کرتے ہیں ان میں کچھ ایک میں اور کچھ دوسرے میں شامل ہو جاتی ہیں۔

(ان احادیث کا) یہی معنی ائمہ کی ایک جماعت نے صراحتاً بیان کیا ہے۔ امام ابو بکر اسماعیلی رحمہ اللہ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے اہل الجبل کو بھیجا تھا، کہتے ہیں:

[1] رواه البخاري، كتاب الإيمان، باب أداء الخمس من الإيمان، رقم الحديث (53) بمعناه، ومسلم، كتاب الإيمان، باب الأمر بالإيمان، رقم الحديث 23-(17) نحوه.

''اہل السنہ والجماعہ میں زیادہ تر حضرات کا کہنا ہے کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو کچھ فرض کیا ہے اس کو سرانجام دینا ''اسلام'' کہلاتا ہے۔ اور جب اسلام اور ایمان دونوں ایک ساتھ ذکر کیے جائیں، مثلاً یوں کہا جائے: ''المسلمون والمؤمنون'' تو ان میں سے ایک لفظ کا مفہوم دوسرے لفظ کے مفہوم سے الگ ہوگا۔ اور جب ان میں سے کوئی ایک ہی ذکر کیا جائے تو وہ اکیلا ہی دونوں کے مفہوموں کو شامل ہوگا۔''

یہی بات امام خطابی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''معالم السنن'' میں ذکر کی ہے اور ان کے بعد آنے والے علماء میں سے ایک جماعت نے انہی کی پیروی کی ہے۔

جو تفصیل ہم نے ابھی ذکر کی ہے اس کے ساتھ اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب اسلام اور ایمان میں سے کوئی ایک لفظ اکیلا آئے تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اور جب یہ دونوں اکٹھے آئیں تو ان کے درمیان فرق ہوگا۔ تحقیق کے مطابق صحیح ترین فرق یہ ہے کہ ''ایمان'' دل کی تصدیق، اقرار اور معرفت کا نام ہے جبکہ ''اسلام'' بندے کا اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا اور سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے جو کہ عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ اعمال ظاہری طور پر نظر آتے ہیں اور تصدیق دل میں ہوتی ہے جو ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔

یہ کیوں کہا گیا کہ ہر مومن مسلمان ہوتا ہے؟:

محقق علماء کا کہنا ہے کہ ہر مومن مسلمان ہوتا ہے کیونکہ جو شخص سچا مومن ہوتا ہے اور ایمان اس کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو وہ اسلام کے ارکان پر بھی عمل کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ»[1]

''خبردار! جسم میں خون کا ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ ہے دل۔''

لہٰذا جس آدمی کے دل میں ایمان مضبوط ہو تو یقینی طور پر اس کے باقی اعضاء ارکانِ اسلام پر عمل کرنے کے لیے خود بخود تیار ہو جاتے ہیں۔ ہر مسلمان مومن نہیں ہوتا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا ایمان

[1] اس حدیث کی تشریح حدیث نمبر 6 میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

ابھی کمزور ہو اور دل میں مکمل طور پر مضبوط نہ ہوا ہو، جس کی بنا پر وہ اسلام کے ارکان پر عمل پیرا ہونے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ تو ایسا شخص مسلمان تو ہوگا لیکن مکمل مومن نہیں ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ ﴾ [الحجرات: ١٤]

''دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، آپ کہیے کہ (حقیقت میں) تم ابھی ایمان نہیں لائے، لیکن تم یوں کہو کہ ہم اسلام لائے اور ابھی تمھارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔''

یہ لوگ صحیح ترین تفسیر کے مطابق منافق نہیں تھے، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے بلکہ ان کا ایمان کمزور تھا۔ اور اس کی دلیل بعد میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

[الحجرات: ١٤]

''اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرنے لگو تو اللہ تمھارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔''

یعنی وہ تمھارے اعمال کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ ان میں اتنا ایمان ضرور تھا جس کی بنا پر ان کے اعمال اللہ کے ہاں قابلِ قبول تھے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: آپ نے فلاں آدمی کو مال کیوں نہیں دیا جبکہ وہ مومن ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسے مسلمان کہو، مومن نہ کہو۔''[1]

اس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس آدمی نے ابھی ایمان کو مضبوط نہیں کیا تھا اور وہ بس ظاہری طور پر مسلمان تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب باطنی ایمان کمزور ہو تو اس کی وجہ سے ظاہری اعمال بھی کمزور پڑ جاتے ہیں، لیکن ایمان کے لفظ کی اس آدمی سے نفی کی جائے گی جو اس کے واجبات میں سے کسی کو چھوڑ دے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے:

[1] صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب إذا لم يكن الإسلام على الحقيقة، رقم الحديث (27) بمعناه، ومسلم، كتاب الإيمان، باب تأليف قلب من يخاف على إيمانه، رقم الحديث: 236 (150) بمعناه

«لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ» [1]

''کوئی زانی ایمان کی حالت میں زنا نہیں کرسکتا۔ اور کوئی چور بحالتِ ایمان چوری نہیں کرسکتا۔ اور کوئی شرابی ایمان کی حالت میں شراب نوشی نہیں کرسکتا۔''

اور اِس میں اہل السنہ کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا ایسے شخص کو ناقص ایمان والا مومن کہا جائے گا یا یوں کہا جائے گا کہ وہ مومن نہیں ہے، بس مسلمان ہے؟ یہ دونوں اقوال ان سے منقول ہیں۔ جہاں تک لفظ ''اسلام'' کا تعلق ہے تو اس کی نفی اس شخص سے نہیں کی جائے گی جو اسلام کے بعض واجبات کو چھوڑ دے یا اس کی بعض محرمات کا ارتکاب کرے۔ ہاں اگر وہ بالکل اس کے منافی کسی کام کا ارتکاب کرے تو پھر لفظ ''اسلام'' اس پر صادق نہیں آئے گا۔

ایمان وکفر کے مسائل نہایت سنجیدہ ہیں:

اسلام وایمان اور کفر ونفاق کے مسائل نہایت ہی سنجیدہ اور بہت ہی اہم ہیں۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھی الفاظ پر کئی چیزوں کو معلق کیا ہے۔ مثلاً: خوش بختی اور بدبختی، جنت ودوزخ کا استحقاق وغیرہ۔ یاد رہے کہ انھی الفاظ کے مدلولات اور مسمیات پر ہی امت میں اختلاف کی ابتدا ہوئی۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب خارجیوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اختلاف کرتے ہوئے، موحد نافرمانوں کو کلی طور پر اسلام سے خارج قرار دے کر انھیں کفر کے دائرہ میں داخل کر دیا۔ پھر انھوں نے انھیں کفار قرار دے کر ان ساتھ وہی سلوک کیا جو کافروں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ پھر اسی کے ساتھ انھوں نے ان کے خونوں اور مالوں کو بھی حلال قرار دے دیا۔ بعد ازاں معتزلہ کا گروہ پیدا ہوگیا جس نے منزل بین المنزلتین کا ایک الگ موقف گھڑ لیا۔ اس کے بعد مرجئہ کا فرقہ وجود میں آگیا جس کا کہنا تھا کہ فاسق آدمی کامل ایمان والا مومن کہلائے گا۔

احسان کی تشریح:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: «أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ» ''تم اللہ کی عبادت اِس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ

[1] صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب النهبى بغير إذن صاحبه، رقم الحديث (2475) ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي، رقم الحديث: 100 (57)

بندے کو اللہ کی عبادت اسی کیفیت کے ساتھ کرنی چاہیے اور وہ ہے دل و دماغ کو حاضر رکھنا اور یہ تصور کرنا کہ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کی خشیت، ہیبت، تعظیم اور اس کے ڈر کا موجب بنتی ہے۔ نیز اس کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پوری توجہ کے ساتھ کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس عبادت کو خوبصورت انداز سے سرانجام دے اور اسے مکمل طور پر ادا کرے۔

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دورانِ طواف ان کی بیٹی سے نکاح کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے معذرت کی اور کہا: اس وقت ہم طواف میں تھے اور ہم یوں سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

احسان کے دوسرے جملہ کی تشریح:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ « فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ » ''اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو پھر وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔'' تو بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اِس میں پہلے جملے کی وجہ بیان کی گئی ہے، کیونکہ بندہ جب عبادت میں اللہ تعالیٰ کو نگران تصور کرتا اور اسے اپنے آپ سے اتنا قریب سمجھتا ہے کہ جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو تو ہوسکتا ہے کہ ایسا تصور کرنا اس کے لیے مشکل ہو، لہٰذا وہ اس پر اپنی مدد اِس یقین و ایمان کے ساتھ کرتا ہے کہ اللہ عزوجل اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے ظاہر و باطن سے مطلع ہے اور اس پر اس کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو اس کے لیے یہ نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اِس سے بھی آگے بڑھے اور ہمیشہ پوری بصیرت کے ساتھ یہ محسوس کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے قریب اور اس کے ساتھ ہے، بالکل ایسے جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس جملے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس آدمی کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرے جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہے تو وہ اِس احساس کے ساتھ عبادت کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور اسے اس پر مکمل اطلاع حاصل ہے۔ لہٰذا وہ کم از کم اِس سے شرم کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ بعض اہلِ معرفت کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، ایسا نہ ہو کہ تم اپنی طرف دیکھنے والوں میں اسے سب سے کم اہمیت دو۔

بعض کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنی وہ تم پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اس سے اتنی شرم کرو

جتنا وہ تمھارے قریب ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اسی معنی کو واضح کیا گیا ہے، جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرة:١٨٦]

''اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں (ان کے) قریب ہی ہوں۔ کوئی دعا کرنے والا جب بھی مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔''

اسی طرح باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ﴾ [الحديد: ٤]

''تم جہاں کہیں بھی ہو وہ (اللہ) تمھارے ساتھ ہے۔''

اور صحیح احادیث میں اِس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ عبادات میں اللہ رب العزت کے اِس قرب کا احساس رہنا چاہیے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے ذکر میں اپنی آوازوں کو بلند کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا تھا:

«فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلَا غَائِبًا إِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيعاً بَصِيراً» ①

''تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم اس کو پکار رہے ہو جو یقیناً بہت سننے والا اور نہایت ہی قریب ہے۔''

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالىٰ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ، وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِيْ، فَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ، وَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَأٍ ذكرته فِيْ مَلَأٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعاً، وَإِنْ تقرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعاً، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِيْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً» ②

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد

① صحيح البخاري، كتاب القدر، باب لا حول ولا قوة إلا بالله، رقم الحديث (6610) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب خفض الصوت بالذكر، رقم الحديث: 44 (2704) بمعناه

② صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله: ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ﴾، رقم الحديث (7405) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة، باب الحث على ذكر الله تعالىٰ، رقم الحديث (2675)

کرے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔ اور اگر وہ کسی جماعت میں مجھے یاد کرے تو میں اس سے بہتر جماعت میں اسے یاد کرتا ہوں۔ اور اگر وہ ایک بالشت میرے نزدیک ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے نزدیک ہوتا ہوں۔ اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے نزدیک ہوتا ہے تو میں ایک کلا (دونوں ہاتھ پھیلانے کی مقدار) اس کے قریب ہوتا ہوں۔ اور اگر وہ چلتا ہوا میرے پاس آئے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔"

قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے:

حدیثِ جبریل میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق سوالات کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ مجھے قیامت کے متعلق بتائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ»

"جس آدمی سے اس کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔"

یعنی قیامت کے وقت کے متعلق پوری مخلوق کا علم ایک جیسا ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہیں۔

اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالم سے جب کوئی ایسا سوال کیا جائے جس کا جواب وہ نہ جانتا ہو تو اسے کہہ دینا چاہیے کہ میں نہیں جانتا۔ اِس سے اس کی قدر میں کمی نہیں ہوگی، بلکہ اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ اللہ سے ڈرنے والا اور دین کے معاملے میں احتیاط برتنے والا ہے۔ ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر صاحبِ علم سے بڑا عالم بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٨٧]

"یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ آپ فرما دیجیے کہ اس کا علم تو صرف میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اسے اس کے وقت پر صرف وہی ظاہر کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری (حادثہ) ہوگا۔ وہ تم پر اچانک آپڑے گی۔ وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے گویا کہ آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ اس کا علم خاص اللہ ہی کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

اور صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا اللّٰهُ»

''غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

﴿ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴾ [لقمان: ٣٤]

''بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے۔ اور کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کچھ کرے گا؟ اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کس زمین پر مرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا اور نہایت باخبر ہے۔''[1]

علاماتِ قیامت:

حضرت جبریل علیہ السلام نے جب قربِ قیامت کی علامات کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دو علامتیں ذکر کیں:

- پہلی علامت:

«أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا» ''یہ کہ ایک لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے۔''

یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ملکوں کو فتح کیا جائے گا جس کے نتیجے میں مسلمان کثرت کے ساتھ غلاموں کے مالک بن جائیں گے، لونڈیاں بہت زیادہ ہو جائیں گی، پھر ان کی اولاد بھی کثرت سے ہوگی، یوں ایک لونڈی اپنے آقا کی مملوکہ تو ہوگی، لیکن جب اس کی اس سے اولاد پیدا ہوگی تو اولاد کی حیثیت اپنی ماں کے لیے وہی ہوگی جو اس کے آقا کی اس کے لیے ہوگی، کیونکہ آقا کی اولاد بھی آقا کے برابر ہوتی ہے۔ اِس طرح ایک لونڈی کی اولاد اس کے آقا کے برابر ہو جائے گی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عقوقِ والدین (والدین کی نافرمانی) ہے، یعنی بیٹا اپنی ماں سے وہ سلوک کرے گا جیسا کہ ایک آقا اپنی لونڈی سے کرتا ہے۔

- دوسری علامت:

«وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ»

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب ﴿ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾، رقم الحديث (4778)

”اور تو یہ دیکھے گا کہ ننگے پاؤں چلنے والے، ننگے جسموں والے، فقراء اور بکریوں کے چرواہے تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

« اَلْعَالَةَ » سے مراد فقراء ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان میں ہے:

﴿ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنَىٰ ﴾ [الضحیٰ: ۸]

« رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ » سے مراد یہ ہے کہ نچلے طبقے کے لوگ ان کے حکمران بن جائیں گے جس کے نتیجے میں ان کے مالوں میں اضافہ ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ اونچی، خوبصورت اور پختہ عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ جب ننگے پاؤں چلنے والے، ننگے جسموں والے، فقراء اور بکریوں کے چرواہے (جن سے مراد جاہل اور سخت مزاج لوگ ہیں) لوگوں کے حکمران اور مال ودولت کے مالک بن جائیں گے حتی کہ تعمیر وترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے تو اس سے دین ودنیا کا پورا نظام فاسد ہو جائے گا، کیونکہ ایک فقیر آدمی لوگوں کا حکمران بن کر خواہ وہ پورے ملک کے لوگوں کا یا ملک کے کسی ایک حصے کا یا کسی ایک محکمے کا سربراہ ہو وہ لوگوں کو ان کے حقوق نہیں دے گا، بلکہ جتنا مال اس کے ہاتھ میں آئے گا یا جس مال ودولت پر تصرف کرنے کا اختیار اسے حاصل ہوگا وہ اسے اپنی ذات کے لیے مختص کر کے دوسروں کو اس سے محروم کر دے گا۔ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ اگر تم کسی سانپ کے منہ میں اپنا ہاتھ دے دو جسے وہ چبا لے تو یہ اِس سے بہتر ہے کہ تم اپنا ہاتھ اس مالدار کی طرف بڑھاؤ جو فقر وفاقہ کا سامنا کر چکا ہو۔

حکمران بننے سے قبل وہ فقیر بھی رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جاہل اور سخت مزاج بھی ہو تو اس سے دین بھی فاسد ہو جائے گا، کیونکہ اس میں اتنی ہمت نہیں ہو گی کہ وہ لوگوں کی اصلاح اور دینی تعلیم پر توجہ دے سکے، بلکہ اس کی پوری کوشش ہو گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال ودولت کا مالک بن جائے اور اسے (اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسل کے لیے) ذخیرہ کر لے، چاہے لوگ دینی ودنیاوی اعتبار سے برباد ہو جائیں، یا ضرورت مند حضرات ہلاک ہو جائیں، اسے اِس کی کوئی پروا نہیں ہو گی۔

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ ”وہ تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔“ تو اس میں ایک دوسرے پر فخر کرنے خاص طور پر تعمیر بلڈنگ میں ایک دوسرے پر فخر کرنے کی مذمت ہے اور یہ چیز، یعنی اونچی اونچی عمارتیں بنانا، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں معروف نہیں تھی، ان کے دور میں حسبِ ضرورت چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہی بنائی جاتی تھیں۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَقُوْمُ السَّاعَةَ حَتَّى يَتَطَاوَلَ النَّاسُ فِي الْبُنْيَانِ»[1]

"قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ لوگ تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔"

حریث بن سائب، حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے گھروں میں داخل ہوتا تھا تو وہ اِس قدر چھوٹے تھے کہ میں ان کی چھتوں کو آسانی سے ہاتھ لگا لیتا تھا۔

فوائدِ حدیث:

1. اس حدیث میں ارکانِ اسلام، قواعدِ ایمان اور حقیقتِ احسان کو بیان کیا گیا ہے۔
2. قیامت وہ غیبی چیز ہے جس کا علم سوائے اللہ کے کسی کے پاس نہیں، اس لیے اس کے وقت کے بارے میں غور وخوض کرنا درست نہیں ہے۔
3. جو شخص کسی بات کا علم رکھتا ہو اور اسے پتا ہو کہ حاضرین اس سے ناواقف ہیں تو اسے اس کے متعلق صاحبِ علم سے سوال کرنا چاہیے تاکہ اس کا جواب سن کر تمام حاضرین کو بھی اس کا علم ہو جائے۔
4. سائل کو ایک طالب علم کے آداب کا خیال رکھنا چاہیے اور اسے صاحبِ علم کے سامنے ایک سائل کے انداز میں ہی بیٹھنا چاہیے۔
5. جس سے سوال کیا جائے اسے سائل کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے اور سائل کے سوالوں کے جوابات پوری امانت داری کے ساتھ دینے چاہئیں۔
6. اس حدیث میں قیامت کی بعض علاماتِ صغریٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔
7. اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے انسان کی خوبصورت شکل اختیار کر سکتے ہیں۔
8. جس سے سوال کیا جائے اگر وہ اس کا جواب نہ جانتا ہو تو اسے واضح کر دینا چاہیے کہ وہ اس کا جواب نہیں جانتا۔ اِس میں کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ عیب تو اِس میں ہے کہ وہ بغیر علم کے جیسے چاہے جواب دے، یقیناً یہ خطرناک عمل ہے!
9. اِس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام مسلمانوں کو ان کے دین کے اصولوں کی تعلیم دینے پر انتہائی حریص تھے۔

[1] صحيح البخاري، كتاب الفتن، باب حدثنا مسدد .....، رقم الحديث (7121)

سوالات:

1. قرآن مجید کی متعدد آیات میں ایمان اور عمل صالح کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس کی کوئی ایک مثال ذکر کریں اور اس کی حکمت بھی بتائیں۔
2. نبی کریم ﷺ کو جامع کلمات دیے گئے تھے، اِس حدیث میں وہ کون سا جملہ ہے جس سے اِس بات کا ثبوت ملتا ہے؟
3. درج ذیل دو خانوں میں مذکورہ کلمات میں سے ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھنے والے کلمات کو ملائیں:

کالم ا	کالم ب
أمارتها	ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں
ربّتها	اس کی علامات
العالة	مالکہ
يتطاولون	فقراء

4. آپ نے مذکورہ بالا حدیث سے جو سمجھا ہے اس کی روشنی میں بتائیں کہ انسانوں کی موت کے بعد جو کچھ ان سے پیش آتا ہے اس کے بارے میں مسلمان کا کیا عقیدہ ہونا چاہیے؟
5. رسول اکرم ﷺ سے جب قیامت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے کیا جواب دیا؟ اور آپ کا وہ جواب کس بات کی دلیل ہے؟
6. نبی کریم ﷺ نے قیامت کی دو علامات ذکر کیں، وہ کیا ہیں؟



ارکانِ اسلام

(3) سیدنا ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ»[1]

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ نیز نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، حج بیت اللہ کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

راویِ حدیث:

سیدنا ابوعبدالرحمٰن ان فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کا نام عبداللہ تھا اور جنھوں نے رسول اکرم ﷺ سے بہت زیادہ احادیث روایت کیں۔ ان کی مرویات کی تعداد ۲۶۳۰ ہے۔ انھوں نے ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ لوگوں کو فتویٰ دیتے ہوئے گزارا۔ ان کی پیدائش بعثتِ نبوی کے دو یا تین سال بعد ہوئی۔ بچپن میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنے والدِ گرامی کے ہمراہ ہجرت کی۔ انھیں کم سنی کی وجہ سے جنگِ احد میں شرکت کی اجازت نہ ملی۔ پہلی جنگ جس میں وہ شریک ہوئے وہ جنگِ خندق تھی۔ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو انھیں خلافت کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دو مرتبہ افریقی جنگوں میں بھی شریک ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام میں بینائی ختم ہوگئی تھی۔ آپ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں بہت بڑھاپے کی حالت (پچاسی سال کی عمر میں) فوت ہوئے۔

حدیث کا معنی ومفہوم:

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اسلام مذکورہ پانچ چیزوں پر مبنی ہے۔ گویا یہ پانچوں چیزیں عمارتِ اسلام

[1] صحیح البخاري، کتاب الإیمان، باب دعاؤکم إیمانکم، رقم الحدیث (8) ومسلم، کتاب الإیمان، باب أرکان الإسلام، رقم الحدیث: 21 (16)

کے لیے ستونوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام ایک عمارت ہے اور یہ پانچ اس کے ستون ہیں۔ جب کہ اسلام کے بقیہ اعمال اِس عمارت کا تکملہ ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک عمل نہ ہو تو اسلام کی عمارت میں نقص ضرور واقع ہوتا ہے تاہم وہ منہدم نہیں ہوتی۔ منہدم تب ہوتی ہے جب یہ پانچوں کے پانچوں ستون نہ ہوں۔ یا پہلا ستون (جو ان سب سے اہم ہے) یعنی شہادتین کا اقرار اگر وہی نہ ہو تو یقینی طور پر عمارتِ اسلام گر جاتی ہے۔

شہادتین کا مفہوم:

شہادتین سے مراد اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ ایک روایت جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے اس میں ہے:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ .....» الخ[1]

یہ روایت اس مفہوم کی تائید کرتی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

جبکہ مسلم کی ایک روایت میں ہے:«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: عَلَى أَنْ يُّوَحَّدَ اللّٰهَ، .....» الخ اور دوسری روایت میں ہے:«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: عَلَى أَنْ يَّعْبُدَ اللّٰهَ، وَيُكْفَرُ بِمَا دُوْنَهُ، .....» الخ[2]

ان دونوں روایتوں کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانا، اس اکیلے کی عبادت کرنا اور اس کے علاوہ باقی تمام معبودان کا انکار کرنا اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا، یہ اسلام کا سب سے پہلا رکن ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول ﷺ اسلام میں داخل ہے، جیسا کہ پچھلی حدیث کی تشریح میں یہ بات گذر چکی ہے۔

نماز قائم کرنا اور اس کا چھوڑنا:

نماز قائم کرنے کے حوالے سے متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جو اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جو شخص نماز کو ترک کردے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب سورة البقرة: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾، رقم الحديث (4514) موقوفا على ابن عمر.

[2] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب أركان الإسلام ودعائمه العظام، رقم الحديث: 19(16) و 20(16)

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»[1]

''آدمی اور شرک وکفر کے درمیان فرق نماز کو چھوڑنا ہے۔''

اسی سے ملتی جلتی احادیث سیدنا بریدہ، سیدنا ثوبان اور سیدنا انس وغیرہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔[2]

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ»[3]

''معاملے کی جڑ اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے۔''

اِس حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کا ستون قرار دیا اور جب ستون نہ رہے تو کوئی عمارت قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح نماز نہ پڑھی جائے تو دین بھی باقی نہیں رہتا!

اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اس شخص کا دینِ اسلام میں کوئی حصہ نہیں جو نماز کو ترک کر دے۔''

اور سعد رضی اللہ عنہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جو شخص نماز کو ترک کرے تو وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔''

سلف وخلف کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے اور عبداللہ بن مبارک، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے، بلکہ اسحاق رحمہ اللہ نے اس پر اہلِ علم کا اجماع نقل کیا ہے اور محمد بن نصر المروزی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہی جمہور اہلِ حدیث کا موقف بھی ہے۔

ارکانِ اسلام میں سے کسی ایک کا تارک:

علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جو شخص ارکانِ اسلام میں سے کسی ایک کو جان بوجھ کر چھوڑ دے وہ اس سے کافر ہو جاتا ہے۔ سعید بن جبیر، نافع اور الحکم رحمہم اللہ سے یہی بات مروی ہے اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے جسے ان کے شاگردوں میں سے ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ جبکہ ایک اور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ خاص طور پر نماز اور زکات کا چھوڑنا کفر ہے،

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة، رقم الحديث: 134 (82)

[2] سنن الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في ترك الصلاة، رقم الحديث (2621) ومسند أحمد (346/5، 282)، وسنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة، باب ما جاء فيمن ترك الصلاة، رقم الحديث (1080)

[3] سنن الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم الحديث (2616) وقال: هذا حديث حسن صحيح

روزوں اور حج کا چھوڑنا کفر نہیں ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے پیروکاروں میں سے ابن حبیب رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے (استطاعت کے باوجود) فریضۂ حج ادا نہ کرنے والوں پر جزیہ عائد کر دیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔

اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تارکِ زکات مسلمان نہیں ہے۔

امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ نے تارکِ نماز کے کفر پر جس چیز کو دلیل بنایا ہے وہ یہ ہے کہ ابلیس کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا جس سے اس نے انکار کر دیا تھا، اسی بنا پر وہ کافر ٹھہرا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہونا اس سے بھی بڑا کفر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِذَا قَرَأَ ابْنُ آدَمَ السَّجْدَةَ فَسَجَدَ اعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِي، يَقُولُ: يَا وَيْلَهُ - وَفِي رِوَايَةِ أَبِي كُرَيْبٍ: يَا وَيْلِي - أُمِرَ ابْنُ آدَمَ بِالسُّجُودِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ، وَأُمِرْتُ بِالسُّجُودِ فَأَبَيْتُ فَلِيَ النَّارُ »[1]

”جب آدم کا بیٹا آیتِ سجدہ کی تلاوت کرتا اور سجدہ ریز ہو جاتا ہے تو ابلیس الگ ہو کر رونا شروع کر دیتا ہے اور وہ کہتا ہے: میں ہلاک ہو گیا، ابنِ آدم کو سجدے کا حکم دیا گیا تو وہ سجدے میں چلا گیا، لہٰذا اس کے لیے جنت ہے۔ جبکہ مجھے سجدے کا حکم دیا گیا اور میں نے انکار کر دیا، تو میرے لیے جہنم کی آگ ہے۔“

پانچوں ارکان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں:

اِس بات پر یقین کر لیجیے کہ یہ پانچوں ارکانِ اسلام ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص زکات ادا نہ کرے تو اس کی نماز بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

قبولیت کی نفی سے نماز کی درستی کی نفی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسے دوبارہ پڑھا جائے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر راضی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ فرشتوں کے سامنے اس کی مدح وثناء کرتا ہے اور نہ اس پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ لہٰذا جو آدمی ان تمام ارکان کی ادائیگی مکمل طور پر بجا لاتا ہے تو اسے مذکورہ معنی میں قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو ایسا نہیں کرتا بلکہ ارکانِ اسلام میں سے کسی کو ادا کرتا اور کسی کو نہیں کرتا تو اسے وہ قبولیت حاصل نہیں ہوتی جس کا تذکرہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ جس رکن

[1] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة، رقم الحديث: 133 (81) نحوه.

کو وہ ادا کرے گا اس کی ادائیگی پر اسے سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ وہ اس سے بری الذمہ تصور کیا جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ اسے اس پر ثواب بھی دیا جائے۔ (اور جس رکن کا وہ تارک ہوگا اس پر اسے سزا دی جائے گی۔)

حرام کا ارتکاب عملِ صالح کی قبولیت میں رکاوٹ بن سکتا ہے:

درج بالا سطور میں ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض حرام کام جن کے ساتھ ایمان میں نقص واقع ہوتا ہے ان میں کسی ایک کا ارتکاب بعض اعمالِ صالحہ (چاہے وہ ارکانِ اسلام میں کیوں نہ ہوں) کی قبولیت میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً» [1]

''جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس سے کسی چیز کے متعلق سوال کرے تو اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔''

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا أَبَقَ الْعَبْدُ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ» [2]

''جو غلام اپنے آقاؤں سے بھاگ کر چلا جائے تو اس کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔''

ایمان کے خصائل میں سے کوئی ایک نہ ہو تو ایمان مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اِس بات کی دلیل ہے کہ جب ایک لفظ کئی چیزوں پر مشتمل ہو تو ان میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی وجہ سے اس لفظ کی نفی نہیں ہوتی۔ (یعنی ایمان کئی خصائل پر مشتمل ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو لفظِ ایمان کی نفی نہیں ہوسکتی۔) اِس بنا پر بعض لوگوں کا یہ قول باطل ہو جاتا ہے کہ اگر اعمال ایمان میں داخل ہیں تو کسی ایک عمل کے نہ ہونے کی وجہ سے ایمان ہی ختم ہو جاتا ہے! کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مذکورہ پانچ اعمال کو اسلام کے ارکان اور ستون قرار دیا اور انہی پانچ کے ساتھ آپ ﷺ نے حدیثِ جبریل میں اسلام کی تشریح فرمائی۔ اور سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک دیہاتی نے نبی کریم ﷺ سے اسلام کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے یہی پانچ چیزیں ذکر کیں۔ [3]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب السلام، باب تحريم الكهانة، رقم الحديث: 125 (2230)

[2] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب تسمية العبد الآبق كافرا، رقم الحديث: 124 (70)

[3] صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب وجوب صيام رمضان، رقم الحديث (1891) ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الصلوات التي هي أحد أركان الإسلام، رقم الحديث: 8 (11)

اِس کے ساتھ ساتھ ایمان کے بارے میں جن لوگوں کا نظریہ مختلف ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ شہادتین کے علاوہ خصالِ اسلام میں سے کسی ایک یا چاروں خصال کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور ان میں سے بعض نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرائعِ اسلام کے متعلق سوال کیا تھا نہ کہ اسلام کے متعلق۔

علماء نے ایمان کی مثال ایک درخت کے ساتھ بیان کی ہے جس کی ایک جڑ ہوتی ہے اور اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی ہوتی ہیں۔ لفظِ درخت ان سب چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر اس کی شاخوں یا ٹہنیوں میں سے کسی ایک کو ختم کر دیا جائے تو لفظِ درخت کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ یہ درخت ناقص ہے یا کوئی دوسرا درخت اِس سے زیادہ مکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ایمان کی مثال بیان کرتے ہوئے ارشادفرماتا ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ﴾ [إبراهيم: ٢٤]

''کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پاک کلمہ کی مثال کس طرح بیان کی! (اس کی مثال) ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ مضبوط اور ٹہنیاں آسمان میں ہیں۔ جو اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل لاتا ہے۔''

''کلمہ'' سے مراد کلمۂ توحید ہے اور اس کی جڑ سے مراد وہ مضبوط عقیدۂ توحید ہے جو دلوں میں جڑ پکڑ چکا ہوتا ہے۔ اور اس کے پھلوں سے مراد وہ اعمالِ صالحہ ہیں جو اس کی جڑ سے نکلتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن ومسلمان کی مثال کھجور کے درخت کے ساتھ بیان کی ہے۔ اگر کھجور کی شاخوں میں سے کوئی ایک شاخ ختم ہو جائے تو اس سے کلی طور پر لفظِ کھجور کا خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ اسے ناقص شاخوں والی کھجور ہی کہا جاتا ہے۔

جہاد کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟

حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں جہاد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ جہاد افضل ترین اعمال میں سے ایک ہے اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

«رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ»[1]

''معاملے کی جڑ اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔''

[1] سنن الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم الحديث (2616)

چوٹی سب سے اونچی ہوتی ہے۔ تاہم جہاد کو نبی کریم ﷺ نے اسلام کے ان ارکان میں شامل نہیں کیا جن پر اس کی عمارت قائم ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

❁ پہلی وجہ:

جمہور علماء کے نزدیک جہاد فرضِ کفایہ ہے نہ کہ فرضِ عین، جبکہ مذکورہ پانچ ارکان فرضِ عین ہیں۔

❁ دوسری وجہ:

جہاد اِس دنیا کے اختتام تک جاری نہیں رہے گا، بلکہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اس وقت سوائے ملتِ اسلام کے اور کوئی ملت باقی نہ رہے گی تو اس وقت جنگی ہتھیار رکھ دیے جائیں گے اور جہاد کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جبکہ اسلام کے یہ پانچوں ارکان مومنوں پر اس وقت تک واجب ہیں جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں آتا۔ واللہ اعلم

فوائدِ حدیث:

1. اسلام اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے پانچوں ارکان پر مضبوط ایمان نہ ہو، لہٰذا جو آدمی ان میں سے کسی ایک کا انکار کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ اور جو شخص ان میں سے کسی ایک کو غفلت کی بنا پر ترک کرے گا وہ فاجر ہوگا۔
2. اسلام ''عقیدہ اور عمل'' دونوں کا نام ہے۔ اور عقیدہ عمل کی بنیاد اور اس کی جڑ ہے۔
3. حدیث میں جن پانچ ارکان کا ذکر کیا گیا ہے اور جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے وہ اپنے اندر اسلام کی بیشتر تعلیمات کو شامل ہیں۔
4. ایمان صرف تمنا کرنے یا ظاہری خوبصورتی کا نام نہیں، بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں قرار پا چکا ہو اور عمل اس کی تصدیق کر رہا ہو۔
5. نماز دین کا ستون ہے اور شہادتین کے بعد اسلام کا سب سے اہم رکن ہے۔
6. اسلام کے مذکورہ ارکان میں سے ہر رکن میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور ہر فرد اور پورے معاشرے کے لیے اس میں عظیم فوائد موجود ہیں۔

سوالات:

1. راویِ حدیث ''ابو عبدالرحمٰن'' کون ہیں؟

2 نبی کریم ﷺ نے بنیادی ارکان ''جن پر دین کی بنیاد قائم ہے'' کو مذکورہ پانچ چیزوں میں ہی کیوں محصور کیا ہے؟

3 اسلام ''قول وعمل'' کا نام ہے۔ اِس عبارت کی تشریح حدیث سے آپ نے جو کچھ سمجھا ہے اس کی روشنی میں کریں۔

4 درج ذیل مسائل میں شرعی حکم ذکر کریں:

- ایک شخص جان بوجھ کر زکات ادا نہ کرے۔
- ایک عورت کسی کاہن یا نجومی کے پاس آئے اور وہ جو کچھ کہے اس کی تصدیق کرے۔

5 وجہ ذکر کریں:

- سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکات کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کیا؟
- حدیث میں جہاد کا ذکر کیوں نہیں ہے؟



خلقت کے مراحل اور خالق کا عدل

4 سیدنا ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرمائی جو کہ سچ بولنے والے تھے اور جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْماً، ثُمَّ يَكُونُ فِي ذٰلِكَ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ فِي ذٰلِكَ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ الْمَلَكَ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ، وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ بِكَتْبِ رِزْقِهِ وَأَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ، فَوَالَّذِي لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ! إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا»[1]

”بے شک تم میں سے ہر آدمی کی پیدائش کی تشکیل اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں ہوتی ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دن خون کے لوتھڑے کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دن گوشت کی بوٹی کی شکل میں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: اس کا رزق، عمل، اجل اور کیا وہ خوش بخت ہوگا یا بد بخت! اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! تم میں سے ایک شخص جنت والوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتۂ تقدیر اس سے سبقت لے جاتا ہے، چنانچہ وہ جہنم والوں کا کوئی عمل کرتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور تم میں سے ایک شخص جہنم والوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے،

[1] صحيح البخاري، كتاب القدر، باب حدثنا أبو الوليد، رقم الحديث (6594) ومسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 1 (2643)

پھر نوشتۂ تقدیر اس سے سبقت لے جاتا ہے، چنانچہ وہ جنت والوں کا کوئی عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

راوی حدیث:

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود بن غافل الہذلی، المکی، بنوزہرہ کے حلیف۔ ''ابن ام عبد'' کے نام سے مشہور تھے۔ موصوف ایک امام، عالم، فقیہ، قاری اور جلیل القدر صحابی تھے۔ جنگِ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے اور دونوں ہجرتیں بھی کیں۔ آپ نے علم کا بہت بڑا حصہ روایت کیا ہے۔ مرویات کی تعداد ۸۴۸ ہے۔ آپ کے متعدد فضائل ومناقب ثابت ہیں۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں سیدنا ابو موسیٰ، ابوہریرہ، ابن عباس، ابن عمر، انس اور دیگر کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی وغیرہ نے آپ سے قراءتِ قرآن بھی روایت کی ہے۔ آپ کی وفات ۳۳ھ یا ۳۲ھ میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ آپ کو بقیع الغرقد (قبرستان) میں دفن کیا گیا۔

درجۂ حدیث:

تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اسے امت نے قبول کیا ہے۔

حدیث کس چیز پر دلالت کرتی ہے؟

اس حدیث میں انسان کے تکوینی مراحل کو بیان کیا گیا ہے:

0 تا 40 یوم = نطفہ

40 تا 80 یوم = علقہ

80 تا 120 یوم = مضغہ

120 یوم = نفخِ روح

280 یوم = ولادت

چنانچہ وہ اپنی ماں کے رحم میں پہلے چالیس دن نطفے کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر چالیس دن خونِ بستہ کی شکل میں اور اس کے بعد چالیس روز گوشت کے ٹکڑے کی شکل میں رہتا ہے۔ یہ ٹوٹل ۱۲۰ دن ہو گئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں چار چیزیں لکھ دے۔ اس کا رزق، اس کا عمل، اس کی عمر اور یہ کہ وہ خوش بخت ہوگا یا بد بخت۔

اِس سے ثابت ہوا کہ انسان کی تکوین کے پہلے تین مراحل میں سے ہر مرحلہ چالیس دن کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید کی متعدد آیات میں خِلقتِ انسان کے ان مراحل کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس کا فرمان ہے:

﴿ يَايُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ [الحج: ۵]

''اے لوگو! اگر تمھیں (موت کے بعد) دوبارہ اٹھنے میں شک ہے تو ہم نے تم سب کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ پھر نطفہ سے، پھر خونِ بستہ سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے جو منقش بھی ہوتا ہے اور نقش کے بغیر بھی۔ تاکہ ہم تم پر (اپنی قدرت کو) واضح کر دیں۔ اور ہم جس نطفہ کے متعلق چاہتے ہیں اسے رحموں میں ایک خاص مدت تک جمائے رکھتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر مزید اضافے کے ساتھ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۲۔۱۴]

''اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ مقام (ماں کے رحم) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفہ کو لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا کر پیدا کیا۔ لہٰذا بڑا با برکت ہے اللہ جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے۔''

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے روح پھونکنے سے پہلے انسان کی تکوین کے سات مراحل ذکر فرمائے ہیں۔

اور سیدنا حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ کی درج ذیل حدیث میں اِس بات کی دلیل ہے کہ گوشت اور ہڈیوں کو دوسرے مرحلہ کے چالیس دنوں میں پیدا کیا جاتا ہے۔

چنانچہ صحیح مسلم میں ان سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب ایک نطفہ پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتے کو بھیجتا

ہے جو اس کی شکل وصورت بناتا، اس کے کان، آنکھیں، جلد، گوشت اور ہڈیاں پیدا کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے: اے میرے رب! یہ مرد ہے یا عورت؟ چنانچہ تمھارا رب جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: اے میرے رب! اس کی عمر کتنی ہوگی؟ تو تمھارا رب جو چاہتا ہے اس کی عمر مقرر کرتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: اے میرے رب! اس کا رزق کتنا ہوگا؟ تو تمھارا رب جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ پھر فرشتہ اپنے ہاتھ میں صحیفہ لیے واپس آجاتا ہے جس میں وہ کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔''[1]

یہ حدیث بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچے کی شکل وصورت، کانوں، آنکھوں، جلد، گوشت اور ہڈیوں کی تکوین دوسرے مرحلہ کے چالیس روز میں ہی مکمل ہو جاتی ہے۔

بچے کی تکوین اور جدید سائنس:

طبی علوم کے ماہرین بھی یہی کہتے ہیں کہ دوسرے مرحلہ کے اوائل میں ہی گوشت اور ہڈیوں کی تکوین مکمل ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منی جب رحم میں پہنچتی ہے تو وہ چھے یا سات روز تک جھاگ کی شکل میں رہتی ہے۔ اور انھی ایام میں رحم سے کچھ لیے بغیر نطفہ کی تصویر بنتی ہے۔ پھر وہ رحم سے (رطوبت وخون وغیرہ) لیتا ہے اور اس کے تین دن بعد نقش ونگار بننا شروع ہوتا ہے۔ اِس میں ایک دن آگے پیچھے بھی ہوسکتا ہے۔ پھر مزید چھے روز گزرنے کے بعد، یعنی منی کے رحم میں پہنچنے کے پندرہ روز بعد اس میں خون پہنچ جاتا ہے جس کے بعد وہ علقہ (لوتھڑا) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بعد ازاں اعضاء واضح طور پر نمایاں ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ تاہم وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے اور رطوبت کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر نو دن کے بعد سر کندھوں کے درمیان سے اور پورے انگلیوں میں سے نکلنے لگتے ہیں۔ کچھ اعضاء تو نمایاں ہو جاتے ہیں اور کچھ مخفی ہوتے ہیں۔

اِن طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ کم ترین مدت جس میں ایک بچے کی شکل وصورت بنتی ہے وہ تیس دن ہے۔ اور اس کی معتدل مدت پینتیس یا پینتالیس روز ہے۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ جو حمل ضائع ہو جاتے ہیں ان میں ایسا کبھی نہیں پایا گیا کہ ایک بچہ تیس دن گزرنے سے پہلے ہی مکمل ہوگیا ہو یا ایک بچی چالیس روز سے قبل مکمل ہوگئی ہو۔ لہٰذا حدیثِ حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ میں جو بات ذکر کی گئی ہے کہ مراحلِ تخلیق میں سے دوسرے مرحلے میں ہی گوشت کی تکوین مکمل ہو جاتی ہے تو یہ (طبی ماہرین کی تحقیق) اس کے عین مطابق ہے۔

[1] رواه مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 3(2645)

جہاں تک حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو اس میں بچے کی شکل وصورت کی تکوین کے وقت کا ذکر نہیں ہے۔ تاہم خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بچے کی شکل وصورت کی تکوین تیسرا مرحلہ شروع ہونے سے قبل ہی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

شعبی نے علقمہ سے اور انھوں نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

جب نطفہ رحم میں مستقر ہوتا ہے تو فرشتہ آتا ہے اور اسے اپنی ہتھیلی کے ساتھ پکڑ کر کہتا ہے: میرے رب! نقش دار یا بغیر نقش کے؟ اگر کہا جائے: بغیر نقش کے، تو وہ پیدا ہی نہیں ہوتا اور رحم اسے خون کی شکل میں ضائع کر دیتا ہے۔ اور اگر کہا جائے: نقش دار، تو فرشتہ کہتا ہے: میرے رب! لڑکا یا لڑکی؟ بدبخت یا خوش بخت؟ عمر کتنی؟ اسے کہاں کہاں جانا ہے؟ اور اس کی موت کہاں آئے گی؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر نطفہ سے کہا جاتا ہے: تمھارا رب کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے: اللہ۔ پھر کہا جاتا ہے: تمھارا رازق کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے: اللہ۔ پھر (فرشتے سے) کہا جاتا ہے: تم کتاب (لوح محفوظ) کی طرف جاؤ جس میں تمھیں اس نطفہ کے متعلق تمام معلومات مل جائیں گی۔ پھر اسے پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مقررہ عمر گزارتا ہے، اپنا رزق کھاتا ہے اور جہاں جہاں اس کا جانا اس کی قسمت میں ہوتا ہے وہ وہیں جاتا ہے، حتی کہ جب اس کی موت کا مقررہ وقت آتا ہے تو وہ مر جاتا ہے اور پھر اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد شعبی نے یہ آیت پڑھی:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴾

[الحج: ٥]

چنانچہ وہ جب گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے تو یہ خلقت کے اس چوتھے مرحلے میں ذی روح انسان بن جاتا ہے۔ اگر بغیر نقش کے ہو تو رحم اسے خون کی شکل میں ضائع کر دیتا ہے اور اگر نقش دار ہو تو وہ انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔[1]

[1] تفسیر ابن ابی حاتم۔ نیز تفسیر طبری کے حاشیہ میں احمد شاکر اور محمود شاکر کا تبصرہ بھی ملاحظہ کیجیے۔

حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بنا پر ہی امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ بچے میں چار مہینے بعد روح پھونک دی جاتی ہے، اس لیے اگر چار مہینوں کے بعد وضع حمل ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے، کیونکہ وہ روح پھونکے جانے کے بعد مرا۔ یہی مسلک سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے اور امام شافعی اور اسحاق رحمہما اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

فرشتہ کب لکھتا ہے؟

حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فرشتہ مذکورہ بالا امور چار مہینوں کے بعد لکھتا ہے، جیسا کہ گذشتہ سطور میں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ہر رحم پر ایک فرشتہ لگا دیتا ہے جو کہتا ہے: اے میرے رب! نطفہ؟ اے میرے رب! لوتھڑا؟ اے میرے رب! گوشت کا ٹکڑا؟ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: اے میرے رب! لڑکا یا لڑکی؟ خوش بخت یا بد بخت؟ رزق کتنا؟ عمر کتنی؟ یہ سب کچھ اس وقت لکھ دیا جاتا ہے جب وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔''[1]

یہ حدیث ظاہری طور پر حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مطابق ہے، لیکن اس میں مدت کا تقرر نہیں کیا گیا۔ جبکہ سیدنا حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کتابت دوسرے چالیس روز کی ابتدا میں ہوتی ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اسی حدیث کو کچھ دیگر الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''نطفہ جب رحم میں مستقر ہو جاتا ہے تو اس کے چالیس یا پینتالیس دن بعد فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے رب! خوش بخت یا بد بخت؟ چنانچہ اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: اے میرے رب! لڑکا یا لڑکی؟ چنانچہ اس کا بھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اس کا عمل، اس کے جانے کے نشانات، اس کی عمر اور اس کے رزق کو بھی لکھ دیتا ہے۔ پھر صحیفوں کو لپیٹ دیا جاتا ہے جن میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب القدر، الباب الأول، رقم الحديث (6595) ومسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 5 (2646)

[2] صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 2 (2644)

اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''نطفہ جب رحم میں چالیس دن یا چالیس راتیں ٹھہرا رہتا ہے تو اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو یہ پوچھتا ہے کہ اے میرے رب! اس کا رزق کیا ہوگا؟ چنانچہ اسے بتا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: اے میرے رب! اس کی عمر کتنی ہوگی؟ چنانچہ اسے بتا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: اے میرے رب! لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ چنانچہ اسے اس کے متعلق بھی بتا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: خوش بخت ہوگا یا بدبخت؟ تو اسے اس کے بارے میں بھی بتا دیا جاتا ہے۔''[1]

بعض اہلِ علم ان احادیث و آثار اور حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان جمع و تطبیق کی صورت یہ بیان کرتے ہیں کہ کتابت دو مرتبہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کتابت آسمان پر ہوتی ہے اور دوسری مرتبہ ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے، جبکہ راجح یہ ہے کہ کتابت ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے اور شاید یہ بچوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، چنانچہ بعض کے متعلق یہ امور پہلے چالیس دن گزرنے کے بعد لکھے جاتے ہیں اور بعض کے متعلق تیسرے چالیس روز کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں «ثُمَّ» کے لفظ سے مراد ترتیبِ اخبار ہو، نہ کہ اس کی ترتیب جس کے بارے میں خبر دی جارہی ہے۔ واللہ اعلم

ماں کے پیٹ میں بچے کے متعلق کتابت ...... اور خلقِ کائنات سے پہلے تقدیر کی کتابت!

بچے کے متعلق ماں کے پیٹ میں ہونے والی کتابت اس کتابتِ تقدیر کے علاوہ ہے جو خلقِ کائنات سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے لکھ دی تھی اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ﴾ [الحدید: ۲۲]

''دنیا میں یا (خاص طور پر) تمھاری جانوں میں جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اِس سے قبل کے کہ ہم اس کو پیدا کریں، وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔''

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ»[2]

[1] مسند أحمد (397/3)

[2] صحيح مسلم، كتاب القدر، باب حجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام، رقم الحديث: 16 (2653)

''اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تقدیروں کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تحریر فرما دیا تھا۔''

اور حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا، پھر اس سے کہا: لکھو۔ چنانچہ قیامت کے تمام امور کا فیصلہ کر دیا گیا۔''[2]

بہت سارے دلائل میں صراحتاً موجود ہے کہ سعادت و بدنصیبی پہلے ہی لکھی جا چکی ہے۔ چنانچہ صحیحین میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ، مَا مِنْ نَفْسٍ مَنْفُوسَةٍ إِلَّا وَقَدْ كَتَبَ اللّٰهُ مَكَانَهَا مِنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، وَإِلَّا وَقَدْ كُتِبَتْ شَقِيَّةٌ أَوْ سَعِيدَةٌ»

''تم میں سے جو شخص بھی پیدا ہوا ہے اس کا ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے، جنت میں یا دوزخ میں۔ اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ وہ نیک بخت ہے یا بد بخت۔''

یہ سن کر ایک شخص کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اپنی قسمت کے لکھے پر بھروسا کرتے ہوئے عمل کرنا چھوڑ نہ دیں؟ کیونکہ جو نیک بختوں میں لکھا گیا ہے وہ بالآخر نیک بختوں میں ہی شامل ہوگا۔ اور جو بد بخت لکھا گیا ہے وہ بالآخر بد بختوں میں ہی شامل ہوگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ، فَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ السَّعَادَةِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ» ثُمَّ قَرَأَ:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ [اللیل: ۵-۱۰]

''تم عمل کرو، کیونکہ ہر ایک کو جس کام کے لیے پیدا کیا گیا وہ اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔ اور جو شخص سعادت مندوں میں لکھا گیا ہے اسے نیک اعمال کی توفیق دی جاتی ہے۔ اور جو شخص بد بختوں میں لکھا گیا ہے اسے ویسی ہی توفیق دی جاتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات تلاوت فرمائیں جن کا ترجمہ ہے:

''پھر جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا، پرہیز گاری اختیار کی اور اچھی باتوں کی تصدیق کی تو

[1] سنن الترمذي، كتاب التفسير، باب ومن سورة نٓ، رقم الحديث (3319)

ہم اسے آسان راہ پر چلنے کی توفیق دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا، بے پروائی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا تو ہم اسے تنگی کی راہ پر چلنے کی سہولت دیں گے۔''[1]

اِس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ سعادت وبد نصیبی پہلے ہی اعمال کے لحاظ سے تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اور ہر انسان کو جس چیز کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس کو اسی چیز کے لیے عمل کرنے کی توفیق دی جاتی ہے۔ اور اس کے اعمال ہی اس کی سعادت یا بد نصیبی کا سبب بنتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! کیا اہلِ جنت کو اہلِ جہنم میں سے پہچانا جا سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: تو پھر عمل کرنے والے عمل کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر ایک اسی طرح کا عمل کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔''[2]

یہی معنی نبی کریم ﷺ کی بہت ساری احادیث میں مروی ہے۔

دار و مدار خاتموں پر ہے:

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اِس بات کی دلیل ہے کہ سعادت وبد نصیبی کا دار و مدار آخری اعمال پر ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث کے آخری الفاظ: « فَوَاللّٰهِ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ أَنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ .... » مدرج ہیں، یعنی یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا کلام ہے جیسا کہ سلمہ بن کہیل نے زید بن وہب سے اور انھوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کے یہی الفاظ روایت کیے ہیں۔ تاہم یہ مفہوم کہ (دار ومدار خاتموں پر ہے) نبی ﷺ سے متعدد احادیث میں مروی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِخَوَاتِيْمِهَا »[3] ''اعمال کا دار و مدار خاتموں پر ہے۔''

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب سورة الليل: ﴿ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴾، رقم الحديث (4948) ومسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 6 (2646)

[2] صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قوله تعالىٰ: ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ ﴾، رقم الحديث (7551) ومسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 9 (2649)

[3] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم، رقم الحديث (6493)

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ الزَّمَنَ الطَّوِيلَ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، ثُمَّ يُخْتَمُ لَهُ عَمَلُهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ الزَّمَنَ الطَّوِيلَ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ، ثُمَّ يُخْتَمُ لَهُ عَمَلُهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ»[1]

''بے شک ایک آدمی لمبے عرصے تک اہلِ جنت والا عمل کرتا رہتا ہے، پھر اس کا خاتمہ جہنمیوں کے کسی عمل پر ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدمی لمبے عرصے تک جہنم والوں کے عمل کرتا رہتا ہے، پھر اس کا خاتمہ اہلِ جنت کے کسی عمل پر ہو جاتا ہے۔''

اور صحیحین میں حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ اور مشرکین کا (کسی جنگ میں) آمنا سامنا ہوا اور دونوں فوجوں میں شدید لڑائی ہوئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹ آئے اور دوسرے لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔ آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں ایک شخص ایسا تھا کہ اس کے سامنے مشرکین میں سے جو بھی آتا وہ اس پر حملہ آور ہوتا اور اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی بہادری دیکھی تو اس کے متعلق کہا: آج جس طرح اِس شخص نے شجاعت و بہادری کے کارنامے دکھائے ہیں اس طرح ہم میں سے کسی نے بھی نہیں دکھائے!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمَا إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''خبردار! وہ جہنمی ہے۔''

تو لوگوں میں سے ایک شخص کہنے لگا: آج میں اس کے ساتھ ہی رہوں گا (تاکہ دیکھ سکوں کہ یہ جہنمی کیوں ہے؟!) یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ نکل گیا، وہ جہاں رکتا یہ بھی رک جاتا اور وہ جہاں تیز چلتا یہ بھی تیز چلنے لگتا۔ آخر کار وہ شخص شدید زخمی ہو گیا۔ چنانچہ وہ صبر نہ کر سکا اور اس نے اپنی موت کے لیے جلد بازی کرتے ہوئے تلوار کا قبضہ زمین پر ٹکایا اور اس کی نوک اپنے دونوں پستانوں کے درمیان رکھ کر اپنے بدن کا پورا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ یوں اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ اس کا یہ انجام دیکھتے ہی تعاقب کرنے والا صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: «أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ» ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔''

آپ ﷺ نے پوچھا: بات کیا ہے؟ اس نے کہا: آپ نے جب یہ فرمایا تھا کہ فلاں آدمی جہنمی ہے تو لوگوں پر یہ بات بڑی گراں گزری تھی۔ اس پر میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ آج میں اس کا تعاقب کروں گا اور تمھیں بتاؤں گا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے پیچھے نکل گیا یہاں تک کہ جب وہ

[1] صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 11 (2651)

شدید زخمی ہوا تو اس نے موت کے لیے جلد بازی کی۔ تلوار کا قبضہ زمین پر ٹکایا اور اس کی نوک اپنے سینے پر رکھ کر اپنے جسم کا پورا وزن اس پر ڈال دیا۔ یوں وہ خودکشی کر کے ہلاک ہوگیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ فِيمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ وَهُوَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ فِيمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ» وفي رواية للبخاري: «وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ»[1]

''بے شک ایک آدمی بظاہر اہلِ جنت والا عمل کرتا ہے حالانکہ وہ اہلِ جہنم میں سے ہوتا ہے۔ اور ایک آدمی بظاہر اہلِ جہنم والا عمل کرتا ہے اور درحقیقت وہ اہلِ جنت میں سے ہوتا ہے۔ اور اعمال کا دارومدار خاتموں پر ہوتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد: «فِيمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ» ''لوگوں کی نظروں میں'' اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ ظاہری طور پر اہلِ جنت کا عمل کرتا ہے، لیکن باطنی طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اور اس کا برا خاتمہ اس کی اس باطنی برائی کی وجہ سے ہوتا ہے جس سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ خواہ وہ برا عمل ہو یا کچھ اور، لہٰذا اس کی خفیہ بری خصلت ہی موت کے وقت اس کے برے خاتمے کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی طرح ایک آدمی لوگوں کی نظروں میں اہلِ جہنم کا عمل کرتا ہے، لیکن خفیہ طور پر وہ کوئی ایسا عملِ خیر کرتا ہے کہ جو اس کی آخری عمر میں اس پر غالب آجاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کا خاتمہ اچھا ہو جاتا ہے۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ تقدیر اور خاتمہ کے متعلق بہت سخت پریشان رہتے تھے۔ اور وہ روتے ہوئے کہا کرتے تھے: مجھے اِس بات کا خوف ہے کہ کہیں تقدیر میں مجھے بدبخت نہ لکھا گیا ہو! اور کہتے تھے: مجھے ڈر ہے کہ موت کے وقت مجھ سے ایمان سلب نہ کرلیا جائے۔ موصوف اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کی طرف اشارہ کرتے تھے:

﴿ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴾ [الرعد: ٣٩]

''اللہ تعالیٰ جو چاہے مٹاتا اور جو چاہے ثابت رکھتا ہے۔ اور لوحِ محفوظ اسی کے پاس ہے۔''

اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد دیگر سلف صالحین رحمہم اللہ اپنے اوپر نفاق کا ڈر محسوس کرتے تھے اور اس کی وجہ سے انھیں شدید پریشانی لاحق رہتی تھی۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب لا يقول: فلان شهيد، رقم الحديث (2898) نحوه، ومسلم، كتاب الإيمان، باب غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه، رقم الحديث: 179 (112) بمعناه

لہٰذا ہر مومن کو نفاقِ اصغر سے ڈرتے رہنا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خاتمہ کے وقت یہ اس پر غالب آجائے اور اسے نفاقِ اکبر تک پہنچا دے! والعیاذ باللہ

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا فرماتے تھے:

«يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلَى دِيْنِكَ»

''اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر اور آپ کے دین پر ایمان لا چکے ہیں، تو کیا آپ کو کوئی خدشہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ہاں۔ کیونکہ

«إِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ، يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ»[1]

''بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ انھیں جیسے چاہے پھیر دے۔''

فوائدِ حدیث:

1. انسان جب اپنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کی عمر، اس کا عمل، رزق اور ٹھکانا لکھ دیا جاتا ہے۔
2. انسان جو عمل ظاہری طور پر کرتا ہے، دار و مدار اس پر نہیں، بلکہ اس کی نیت اور اخلاص پر ہے۔
3. اعمال کی کتابت اور اوامر و نواہی کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔
4. اعمال کا دار و مدار خاتموں پر ہے۔
5. انسان اپنی ماں کے پیٹ میں پہلے نطفہ، پھر لوتھڑا، پھر گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے، پھر اس کی طرف فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح کو پھونکتا ہے۔

سوالات:

1. نطفہ، علقہ اور مضغہ کی تعریف کریں۔
2. بچے کے متعلق جو کتابت کی جاتی ہے، کیا کتابتِ تقدیر بھی وہی ہے؟
3. سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول ''اَلصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ'' کس بات پر دلالت کرتا ہے؟

[1] سنن الترمذي، كتاب القدر، باب ما جاء أن القلوب بين إصبعي الرحمن، رقم الحديث (2140) ومسند أحمد (112/3)

4 بچے میں روح کب پھونکی جاتی ہے؟

5 اِس حدیث اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے درمیان جمع وتطبیق کس طرح ہوگی؟

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»

''جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں فراوانی اور اس کے اجل (موت) میں دیر ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔''



دین میں نئے کام ایجاد کرنا

5 ام المومنین ام عبداللہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» [1]

''جس شخص نے ہمارے اس دین میں نیا کام ایجاد کیا جو اس سے نہیں تھا تو وہ مردود ہے۔''

اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ مردود ہے۔''

راویِ حدیث:

ام المومنین، ام عبداللہ عائشہ بنت ابی بکر الصدیق القرشیہ التمیمیہ رضی اللہ عنہا، آپ اِس امت کی سب سے بڑی فقیہ خاتون ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث کا بہت بڑا مجموعہ روایت کیا جو علمِ دین کے اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ ان سے سیکڑوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ نے احادیث روایت کیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جنگِ بدر کے بعد شوال کے مہینے میں شادی کی۔ لوگوں میں ان کے علم اور ان کی فقہ کو بہت شہرت ملی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی مدح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''تمام عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کو وہ فضیلت حاصل ہے جو ثرید کو تمام کھانوں پر حاصل ہے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ۵۷ھ میں فوت ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال اور چھ مہینے تھی۔

درجۂ حدیث:

یہ حدیث اصولِ اسلام میں سے اصلِ عظیم پر مشتمل ہے اور جس طرح حدیث «اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» کے ساتھ اعمال کی باطنی حالت کو جانچا جا سکتا ہے اسی طرح اِس حدیث کے ذریعے اعمال کی ظاہری حالت

[1] صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، رقم الحديث (2697) ومسلم، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، رقم الحديث: 17 (1718)

کو پرکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ عمل جس میں عمل کرنے والے کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا نہ ہو تو اسے اس کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اسی طرح ہر وہ عمل جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے امر کے مطابق نہ ہو وہ عمل کرنے والے کو ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔ اور ہر وہ عمل جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اجازت کے بغیر دین میں ایجاد کیا جائے اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

گویا یہ حدیث ظاہری طور پر اِس بات کی دلیل ہے کہ ہر وہ عمل جس کے متعلق شارع کا کوئی امر نہ ہو وہ مردود ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ عمل جس کے بارے میں شارع کا امر موجود ہو وہ مردود نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ یہاں امر سے مراد، اللہ کا دین اور اس کی شریعت ہے۔ لہٰذا حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کا عمل شریعت سے ہٹ کر ہو اور اس کا شریعت میں کوئی وجود نہ ہو تو وہ نا قابلِ قبول ہوتا ہے۔

«لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا» کا معنی:

آپ ﷺ کے اِس ارشاد میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام عمل کرنے والوں کو ہر عمل شرعی احکام کے دائرہ میں رہ کر کرنا چاہیے، کیونکہ شرعی احکام اپنے اوامر ونواہی کے ساتھ اعمال پر حاکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا جو عمل احکامِ شرعیہ کے مطابق ہوگا وہی قابلِ قبول ہوگا اور جو ان سے ہٹ کر ہوگا وہ مردود اور نا قابلِ قبول ہوگا۔

اعمال کی دو قسمیں:

اعمال کی دو قسمیں ہیں: عبادات ومعاملات

عبادات میں سے جو عبادت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے بالکل ہٹ کر ہو وہ عمل کرنے والے کو لوٹا دی جاتی ہے۔ اور عمل کرنے والا شخص ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُا۟ شَرَعُوا۟ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ ﴾ [الشوریٰ:٢١]

''کیا ان لوگوں کے لیے ایسے (اللہ کے) شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کے ایسے کام مقرر کر دیے ہیں جن کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟''

لہٰذا جو شخص کسی ایسے عمل کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کرنا چاہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے تقرب کا ذریعہ نہیں بنایا تو وہ عمل باطل اور مردود ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ قوالیاں سن کر یا

رقص کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا ان بدعات کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں جن کے ساتھ تقرب حاصل کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بالکل مشروع ہی نہیں کیا۔ جو شخص ایسا عمل کرے اس کو ان لوگوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جن کی نماز بیت اللہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

مشروع میں غیر مشروع کو ملانا:

جو شخص ایسا عمل کرے کہ جو اصلاً مشروع ہو اور تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہو، لیکن وہ اس میں کسی غیر مشروع کام کو ملا دے یا اس میں کسی مشروع کام کے ساتھ خلل ڈال دے (یعنی اپنی مرضی سے اس میں کمی بیشی کر دے) تو ایسا شخص بھی اپنی طرف سے کی ہوئی اِس کمی بیشی کے بقدر شریعت کا مخالف ہوگا۔ لیکن کیا اس کا یہ عمل جس میں اس نے اپنی منشاء کے مطابق کمی بیشی کر دی بالکل مردود ہوگا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے نہ تو کلی طور پر رد کیا جائے گا اور نہ ہی کلی طور پر قبول کیا جائے گا، بلکہ اس میں غور وفکر کر کے اس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے کسی عمل میں جو کمی کی اگر وہ کمی عمل کے اجزاء اور اس کی شرائط میں سے ہو کہ جس کے بغیر وہ عمل شرعی طور پر باطل ہو جاتا ہو، جیسا کہ ایک شخص قدرت کے باوجود طہارت کے بغیر نماز پڑھ لے یا رکوع وسجود میں کوتاہی کرتے ہوئے انھیں اطمینان کے ساتھ مکمل نہ کرے، تو ایسا عمل مردود ہوگا اور اگر وہ فرض ہو تو اسے دوبارہ کرنا پڑے گا۔ اور اگر وہ کمی ایسی ہو کہ جس سے عمل باطل نہ ہو، جیسا کہ ایک شخص فرض نماز کی جماعت کو جان بوجھ کر چھوڑ دے تو جن علماء نے باجماعت نماز کو واجب قرار دیا ہے اور اسے نماز کی شرط قرار نہیں دیا تو ان کے نزدیک اس شخص کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا یہ عمل مردود ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ اس کا یہ عمل ناقص ہے۔

جہاں تک عمل میں اضافہ کرنے کا تعلق ہے تو اگر کوئی شخص کسی مشروع عمل میں غیر مشروع کام کا اضافہ کر دے تو اس کا یہ اضافہ بایں معنی مردود ہوگا کہ اسے اس کے ذریعے تقربِ الٰہی حاصل نہیں ہوگا اور نہ اسے اس کا ثواب ملے گا۔ بلکہ بعض اوقات اضافہ کرنے کی وجہ سے عمل باطل بھی ہو جاتا ہے، مثلاً: کوئی شخص نماز میں جان بوجھ کر ایک رکعت کا اضافہ کر دے تو اس کا یہ عمل بالکل ہی باطل ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات اضافہ کرنے سے عمل باطل نہیں بھی ہوتا، مثلاً: کوئی شخص وضو کرتے ہوئے اعضاء کو چار چار مرتبہ دھوئے، یا وہ دن کے ساتھ رات کا بھی روزہ رکھے اور کئی کئی دن تک ایسے کرتا رہے تو اس سے اس کا عمل کلی طور پر باطل نہیں ہوتا۔

اسی لیے بعض علماء نے اِس میں فرق کیا ہے کہ ایک نہی ایک خاص وجہ کی بنا پر ایک عبادت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، چنانچہ وہ اسی کی وجہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اور ایک نہی اس عبادت کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی اور اسی لیے اس کی وجہ سے وہ باطل نہیں ہوتی۔ اس کی واضح مثال روزہ ہے کہ جس میں کھانا، پینا اور صحبت کرنا ممنوع ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے (اگر جان بوجھ کر ہو تو) وہ باطل ہو جاتا ہے۔ جبکہ روزہ میں جھوٹ بولنا اور غیبت کرنا بھی ممنوع ہے، لیکن جمہور اہلِ علم کے نزدیک اس کی وجہ سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔ اسی طرح حج ہے کہ جس میں احرام کی حالت میں جماع کرنا ممنوع ہے اور اس کی وجہ سے حج باطل ہو جاتا ہے، جبکہ اس میں جو دیگر ممنوعات ہیں ان کی وجہ سے حج باطل نہیں ہوتا، اسی طرح قتل، چوری اور شراب نوشی کرنے سے بھی حج باطل نہیں ہوتا۔

معاملات کیسے باطل ہوتے ہیں؟

جہاں تک معاملات کا تعلق ہے، مثلاً: عقود اور ان کا فسخ ہونا وغیرہ، تو ان میں اگر شرعی احکام کو ہی تبدیل کر دیا جائے، مثلاً: زنا کی سزا میں بجائے کوڑے مارنے یا رجم کرنے کے مالی جرمانہ عائد کرنا وغیرہ، تو ایسی تبدیلی کلی طور پر مردود ہے اور اس کے ذریعے مال ودولت کی ملکیت منتقل نہیں ہوتی، کیونکہ اسلامی احکام میں یہ چیز انتہائی معروف ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جب ایک آدمی نے کہا کہ میرا بیٹا فلاں آدمی کے پاس نوکر تھا، اس نے اس کی بیوی سے زنا کاری کی، تو میں نے اسے ایک سو بکریاں اور ایک خادم دے کر اپنے بیٹے کی جان چھڑا لی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایک سو (۱۰۰) بکریاں اور ایک خادم واپس لے لو اور تمھارے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور ایک سال کی جلا وطنی ہے۔''[1]

اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق میں فرق:

معاملات میں اگر کوئی ایسا عقد (Agreement) ہو کہ جس سے شریعت میں اِس لیے منع کیا گیا ہو کہ جس چیز پر عقد کیا جا رہا ہو وہ عقد کے قابل ہی نہ ہو، یا اس میں کوئی شرط معدوم ہو، یا اس کی وجہ سے اس شخص پر ظلم ہو رہا ہو جس کے ساتھ عقد کیا جا رہا ہو یا جس پر عقد کیا جا رہا ہو، یا وہ عقد ایسا ہو کہ جو اللہ

[1] صحيح البخاري، كتاب الشروط، باب الشروط التي لا تحل في الحدود، رقم الحديث (2724-2725) ومسلم، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه في الزنى، رقم الحديث: 25 (1697-1698)

کے بعض ضروری احکامات سے اس وقت غافل کرنے کا موجب بن رہا ہو کہ جب ان کا مقررہ وقت نہایت کم ہو، یا مذکورہ وجوہات کے علاوہ کوئی اور وجہ ہو تو کیا ایسا عقد کلی طور پر مردود ہے کہ جس کے ساتھ ملکیت ہی منتقل نہیں ہوتی یا وہ کلی طور پر مردود نہیں؟

اِس جگہ پر اہلِ علم بہت زیادہ اضطراب کا شکار ہوئے ہیں، تاہم جو بات ان شاء اللہ حق کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس عقد سے نہی کی وجہ اللہ تعالیٰ کا حق ہو تو اس میں ملکیت بالکل منتقل نہیں ہوتی اور اس میں چاہے عقد کرنے والے دونوں شخص راضی کیوں نہ ہوں اللہ کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور اگر اس عقد سے نہی کی وجہ کسی متعین آدمی کا حق ہو تو وہ اس کی رضامندی پر موقوف ہے، اگر وہ راضی ہو تو عقد واجب العمل ہو جاتا ہے اور ملکیت منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ راضی نہ ہو تو اسے اس عقد کو فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

تاہم وہ شخص جسے اس عقد کی وجہ سے نقصان ہو رہا ہو وہ ایسا ہو کہ اس کی رضا بالکل ہی معتبر نہ ہو، مثلاً: طلاق کے معاملے میں بیوی کی رضا اور آزادی کے معاملے میں غلام کی رضا، تو اس کی رضامندی یا ناراضی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

اور اگر وہ عقد مشقت کی بنا پر ممنوع ہو تو اس میں عقد کرنے والا شخص اگر اس مشقت کو جھیلنے پر تیار ہو اور وہ عقد کر لے تو اس کی وجہ سے وہ عقد باطل نہیں ہوگا۔

اللہ کے حقوق کی بعض صورتیں:

حقوق اللہ کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً: ان عورتوں سے نکاح کرنا جن سے نکاح کرنا نسب یا سبب کی بنا پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو، یا کسی خاتون کے ساتھ جمع ہونے کی بنا پر نکاح حرام ہو، یا کسی شرط کے معدوم ہونے کی بنا پر نکاح حرام ہو، جیسا کہ عدت گزارنے والی خاتون سے، یا احرام والی خاتون سے، یا سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے والی خاتون سے نکاح کرنا حرام ہوتا ہے، تو اِس طرح کے تمام عقود میں چاہے عقد کرنے والے تمام فریق رضامند کیوں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا۔

اسی طرح وہ تمام عقود جن کے تحت حرام چیزوں کی بیع ہو، مثلاً: شراب، مردار، خنزیر، بت اور کتا وغیرہ، تو ان میں بھی عقد کرنے والوں کی رضامندی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، کیونکہ ان چیزوں کی بیع کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور اس کا حق کسی کی رضامندی کے ساتھ ساقط نہیں ہوسکتا۔

بندوں کے حقوق کی بعض صورتیں:

بندوں کے حقوق کی بھی متعدد صورتیں ہیں۔ مثلاً: سرپرست کا کسی ایسی خاتون کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہی کر دینا کہ جس کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کیا جا سکتا ہو۔ نبی کریم ﷺ نے اس بیوہ/ مطلقہ عورت کا نکاح رد کر دیا تھا جس کی منشا کے بغیر اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی تھی۔[1]

اسی طرح یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس خاتون کو اختیار دے دیا تھا جس کی مرضی کے بغیر شادی کر دی گئی تھی، کہ وہ چاہے تو اس سے انکار کر دے اور چاہے تو اس پر راضی ہو جائے۔[2]

بعض علماء کا موقف ہے کہ جو شخص کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف کرے تو اس کا تصرف بالکل ہی باطل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کی اجازت پر موقوف ہے۔ اگر وہ اجازت دے دے تو ٹھیک ورنہ وہ باطل ہو جاتا ہے۔ ان علماء کی دلیل سیدنا عروہ بن جعد رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے لیے دو بکریاں خریدی تھیں، جبکہ آپ ﷺ نے انھیں ایک ہی بکری خریدنے کا حکم دیا تھا، پھر انھوں نے ایک بکری کو بیچ کر پیسے بھی واپس کر دیے اور ایک بکری بھی پیش کر دی۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان کی اس بیع کو قبول کر لیا تھا۔[3]

اِس حدیث « مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ » کا سببِ ورود یہ ہے کہ سعد بن ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے القاسم بن محمد سے سوال کیا کہ ایک شخص کے تین گھر ہیں اور اس نے ہر گھر کے ثلث (ایک تہائی حصہ) کے متعلق وصیت کی ہے! تو انھوں نے جواب دیا کہ ہر گھر کے ثلث کو ایک ہی گھر میں جمع کر دیا جائے اور اسی ایک کو ہی اس کی وصیت سمجھا جائے۔ پھر انھوں نے کہا: مجھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حدیث بیان کی کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ »[4]

''جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ مردود ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب إذا زوج الرجل ابنته وهي كارهة فنكاحه مردود، رقم الحديث (5138)

[2] سنن أبي داود، كتاب النكاح، باب في البكر يزوجها أبوها لا يستأمرها، رقم الحديث (2096)

[3] صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب: 28، رقم الحديث (3642)

[4] صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، رقم الحديث: 18 (1718)

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ شریعت کامل ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔
2. وہ امور جن کا تعلق لوگوں کی مصلحتوں کے ساتھ ہے اور وہ شریعت کے منافی نہیں ہیں تو وہ ممنوع نہیں ہیں۔
3. حاکم کا ظاہر پر حکم لگانا، اس سے اس کا باطن تبدیل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی حقیقت تبدیل ہوسکتی ہے۔
4. ایسی صلح جو فاسد اور شریعت کے منافی ہو اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوسکتا۔
5. اِس حدیث میں دین میں نئے کام ایجاد کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔

سوالات:

1. شرعی لحاظ سے اس حدیث کی اہمیت واضح کریں۔
2. اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو کسی مشروع عمل میں غیر مشروع کی ملاوٹ کر دے یا اس میں کسی مشروع عمل کے ساتھ خلل ڈال دے؟
3. اِس حدیث میں اعمال کی کون سی قسم سے منع کیا گیا ہے؟ مثال سے وضاحت کریں۔
4. کسی بھی عقد (ایگریمنٹ) میں فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے، کیا یہ اصول درج ذیل امور میں بھی معتبر ہے:
   - جو شخص عدت میں بیٹھی ہوئی خاتون سے نکاح کر لے یا اپنی رضاعی بہن سے شادی کر لے!
   - جو شخص مردار یا بتوں یا خنزیر کو فروخت کرے!
   - کوئی شخص کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرے، پھر وہ اس پر راضی ہو جائے!



شبہات کے بارے میں مسلمان کا موقف

6 سیدنا ابوعبداللہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

«إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُتَشَابِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيهِ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ»[1]

”یقیناً حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں جن سے بہت سارے لوگ ناواقف ہیں۔ لہٰذا جو شخص شبہات سے بچتا ہے وہ اپنی عزت اور اپنا دین محفوظ کر لیتا ہے اور جو شخص شبہات میں واقع ہوتا ہے وہ حرام میں واقع ہو جاتا ہے، جیسا کہ ایک چرواہا (کسی کی) چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے تو عین ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر چلا جائے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور خبردار! اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی محرمات ہیں۔ اور خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور وہ ہے دل۔“

راوی حدیث:

سیدنا نعمان بن بشیر بن سعد الخزرجی الانصاری ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد انصار میں سب سے

[1] صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه، رقم الحديث (52) ومسلم، كتاب المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، رقم الحديث: 107 (5199)

پہلے پیدا ہونے والے بچے تھے اور آپ دمشق کے قاضی بھی رہے۔ سماک بن حرب رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے موصوف کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور آپ میرے علم کے مطابق سب سے بڑے خطیب تھے۔ انھوں نے ۱۱۴ احادیث روایت کیں اور آپ کی وفات ۶۵ھ میں ہوئی۔[1]

حدیث کا مفہوم:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "یقیناً حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں جن سے بہت سارے لوگ ناواقف ہیں۔" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز یقینی طور پر حلال ہے وہ بالکل واضح ہے اور اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے۔ اسی طرح حرام بھی۔ تاہم ان دونوں کے درمیان کچھ امور ایسے ہیں جن کے بارے میں بہت سارے لوگوں کے ہاں اشتباہ پایا جاتا ہے کہ کیا وہ حلال ہیں یا حرام؟ البتہ وہ حضرات جو علمی لحاظ سے مضبوط ہیں، ان کے لیے کوئی چیز مشتبہ نہیں ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان امور کا تعلق مذکورہ دو قسموں میں سے کس قسم کے ساتھ ہے۔

یقینی طور پر حلال اور یقینی طور پر حرام:

یقینی طور پر حلال چیزیں، مثلاً: اناج اور پھلوں میں سے جو پاک ہیں ان کا کھانا، چوپائے جانوروں کا گوشت کھانا اور پاکیزہ مشروبات کا پینا۔ سوتی، اونی اور بالوں سے بنا ہوا لباس حسبِ ضرورت پہننا، نکاح کرنا اور لونڈیاں رکھنا وغیرہ، بشرطیکہ ان چیزوں کو عقدِ صحیح کے ساتھ حاصل کیا گیا ہو، مثلاً: بیع یا وراثت یا ہبہ یا غنیمت۔

یقینی طور پر حرام چیزیں، مثلاً: مردار، خون اور خنزیر کا گوشت کھانا، شراب پینا، محرم عورتوں سے نکاح کرنا، مردوں کے لیے ریشم کا لباس پہننا، سودی لین دین یا جوئے کے ذریعے مال بنانا، جس چیز کی بیع حرام ہو اسے بیچ کر پیسے وصول کرنا، چوری، ڈاکہ زنی یا دھوکے اور فریب کے ساتھ لوٹے ہوئے مال کو قبول کرنا وغیرہ۔

جن چیزوں میں اشتباہ پایا جاتا ہے:

ان چیزوں کا کھانا جن کے حلال یا حرام ہونے میں اختلاف ہے۔ مثلاً: گھوڑا، خچر، گدھا اور سانڈھ۔ اسی طرح ان چیزوں کا پینا جن کی حرمت میں اختلاف ہے۔ مثلاً: نبیذ (انگور یا کھجور سے بنی ہوئی شراب جس کی زیادہ مقدار نشہ آور ہوتی ہے، تھوڑی نہیں) نیز ان چیزوں کا پہننا جن کے متعلق اختلاف ہے

[1] الإصابة (529/3)

کہ ان کا پہننا جائز ہے یا ناجائز، مثلاً: درندوں وغیرہ کی جلدوں سے بنی ہوئی چیزیں۔ اسی طرح وہ اموال جنھیں ان مالی معاملات کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے جن کے جائز یا ناجائز ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً: بیع عینہ اور تورق وغیرہ۔ امام احمد واسحاق رحمہما اللہ جیسے ائمہ مشتبہ امور کی تشریح انھی چیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ بیع عینہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو کوئی چیز موجل قیمت پر فروخت کر کے اسے خریدار کے سپرد کر دے، پھر وہی شخص اس سے اس چیز کو اس قیمت سے کم پر خرید کر لے جس پر اس نے اس کو بیچا تھا اور اسے فوری طور پر ادائیگی کر دے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اگر وہ دونوں اِس طرح قصداً کریں تو ان کی بیع باطل ہوگی، کیونکہ اس میں حیلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث کو دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے جس میں بیع عینہ کے ساتھ خرید و فروخت پر سخت وعید آئی ہے، نیز ان کا کہنا ہے کہ اگر ایسا دونوں کی جانب سے قصداً نہ ہو تو پہلی بیع درست اور دوسری باطل ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے ذکر کیا ہے کہ اگر خریدار کا مقصد یہ ہو کہ اسے نقد پیسے مل جائیں، پھر وہ کسی چیز کو موجل قیمت پر خرید کر نقد قیمت پر فروخت کر دے تو اسے ''تورق'' کہتے ہیں۔ اس کی کراہت کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے دو اقوال مروی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ''تورق'' میں دراصل نقدی پیسوں کی طلب ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لیے ایک چیز کی خرید و فروخت کو حیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔[1]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا اور اس میں امت کے لیے ہر اس حلال و حرام چیز کو کھول کر بیان کر دیا جس کی انھیں ضرورت تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ تِبْيَٰنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النحل: ٨٩]

''اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔''

مجاہد وغیرہ کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا انھیں حکم دیا گیا یا جس سے انھیں منع کیا گیا اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سورۃ النساء (جس میں اس نے اموال اور شرمگاہوں کے متعلق بہت سارے احکامات بیان کیے ہیں) کے آخر میں فرماتا ہے:

[1] القواعد النورانية (ص: 143-142)

﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ [النساء: ١٧٦]

''اللہ تمھارے لیے یہ وضاحت اس لیے کرتا ہے کہ تم بھٹکتے نہ پھرو۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اسی طرح اس کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۗ ﴾ [الأنعام: ١١٩]

''آخر کیا بات ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے اسے تمھارے لیے تفصیلاً بیان کر دیا ہے، الا یہ کہ تم (کوئی حرام چیز کھانے پر) مجبور کر دیے جاؤ۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۗ ﴾ [التوبة: ١١٥]

''اور اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کیا کرتا جب تک ان پر یہ واضح نہ کر دے کہ انھیں کن کن باتوں سے بچنا چاہیے۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی ہر اس آیت کا مفہوم واضح کرنے کی ذمہ داری نبی کریم ﷺ کو سونپ دی جس میں کوئی اشکال ہوسکتا تھا۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ [النحل: ٤٤]

''اور آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ چیز واضح طور پر بتا دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔''

دین مکمل ہے:

رسول اکرم ﷺ پر موت نہیں آئی جب تک کہ آپ اور آپ کی امت کے لیے دین کو مکمل نہ کر دیا گیا۔ اسی لیے آپ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے عرفات کے میدان میں آپ پر یہ آیت نازل کی گئی:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۗ ﴾ [المائدة: ٣]

’’آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور اسلام کو بحیثیتِ دین تمھارے لیے پسند کر لیا۔‘‘

اور رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«تَرَكْتُكُمْ عَلَى بَيْضَاءَ نَقِيَّةٍ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا، لَا يَزِيغُ عَنْهَا إِلَّا هَالِكٌ»[1]

’’میں نے تمھیں سفید اور صاف ستھری شریعت پر چھوڑا ہے، اس کی رات بھی اس کے دن کی مانند واضح ہے، اس سے کوئی ہلاک ہونے والا ہی ہٹ سکتا ہے۔‘‘

اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

’’رسول اکرم ﷺ جب فوت ہوئے تو اس وقت اگر آسمان میں کوئی پرندہ اپنے پروں کے ساتھ اڑ رہا تھا تو آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ علم تھا آپ نے ہمیں اس کے متعلق بھی آگاہ کر دیا۔‘‘[2]

اختلافِ علماء کے اسباب:

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہر حلال چیز کو واضح طور پر بیان کر دیا اور اسی طرح ہر حرام چیز کو بھی۔ تاہم حلال وحرام میں سے بعض چیزیں دیگر چیزوں سے زیادہ واضح تھیں۔ لہٰذا جس چیز کا حلال یا حرام ہونا بالکل واضح اور مشہور ہو گیا اور بدیہی طور پر دین میں یہ معلوم ہو گیا کہ فلاں چیز حلال یا حرام ہے تو اس کے متعلق کسی قسم کا شک وشبہہ باقی نہ رہا۔ اور وہ ملک جس میں اسلام کا غلبہ ہو اس میں اگر کوئی شخص اِس طرح کے حلال وحرام کے متعلق ناواقف ہو تو اس کے پاس ناواقفیت کا کوئی عذر نہیں۔

اور جو حلال یا حرام چیزیں اِس طرح واضح نہ ہو سکیں جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے تو ان میں سے بعض چیزیں خاص طور پر علمائے شریعت کے ہاں مشہور ہو گئیں اور ان علماء نے ان کے حلال یا حرام ہونے پر اجماع کر لیا۔ اور ان میں سے بعض چیزیں بعض علماء پر مخفی رہیں اور بعض چیزیں حتی کہ علمائے شریعت کے ہاں بھی مشہور نہ ہو سکیں، تو ان کے مابین ایسی چیزوں کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں اختلاف واقع ہوا جس کے اسباب درج ذیل ہیں:

---

[1] مسند أحمد: (126/4)

[2] مسند أحمد: (162/5) اس کی سند میں انقطاع ہے، تاہم اپنے متعدد طرق کی بنا پر یہ اثر حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد بتحقیق شعیب الارناؤوط: (290,346/35)

- کبھی ایک نص (یعنی دلیل) بعض اہلِ علم پر مخفی رہ جاتی ہے اور اسے بہت کم علماء نے نقل کیا ہوتا ہے، چنانچہ وہ تمام اہلِ علم تک نہیں پہنچ پاتی۔
- بعض اوقات ایک مسئلہ میں دو دلیلیں نقل کی جاتی ہیں جن میں سے ایک اس کے حلال ہونے اور دوسری اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے، چنانچہ بعض اہلِ علم کے ہاں ان دونوں میں سے ایک دلیل پہنچتی ہے اور دوسری نہیں پہنچتی، تو وہ بس اسی کو تھام لیتے ہیں۔ یا پھر دونوں دلیلیں بسا اوقات کسی ایسے شخص کے ہاں پہنچتی ہیں کہ جس کو تاریخ کا علم نہیں ہوتا اور وہ ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے کے متعلق ناواقف ہونے کی بنا پر اس مسئلہ میں توقف کر لیتا ہے۔
- بعض اوقات ایک مسئلہ میں کوئی واضح دلیل نہیں ہوتی، بلکہ عموم یا مفہوم یا قیاس سے دلیل لی جاتی ہے اور اِس طرح کی صورتِ حال میں علماء کے مابین اکثر و بیشتر اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔
- بعض اوقات ایک مسئلہ میں امر اور نہی دونوں وارد ہوتے ہیں، چنانچہ امر کو وجوب یا استحباب پر اور نہی کو تحریم یا کراہت پر محمول کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے۔

اسبابِ اختلاف اور بھی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ امت میں کوئی نہ کوئی عالم ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس کا نظریہ برحق ہوتا اور وہی اس مسئلہ میں شرعی حکم کا علم رکھنے والا ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے علاوہ دیگر اہلِ علم کا تعلق ہے تو ان کے لیے وہ حکم مشتبہ امور میں سے ہوتا ہے اور انھیں اس کا پورا علم نہیں ہوتا۔ امت میں کسی ایک عالم کا حق بات کو جاننا اس لیے ضروری ہے کہ یہ امت پوری کی پوری گمراہی پر اجماع نہیں کر سکتی اور اس میں اہلِ باطل اہلِ حق پر غالب نہیں آ سکتے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ حق کو بالکل ہی چھوڑ دیا جائے اور پوری امتِ مسلمہ میں اس پر کوئی بھی عمل کرنے والا کہیں بھی نہ ہو۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے مشتبہ امور کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ''ان کے متعلق بہت سارے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو ان کا علم رکھنے والے ہوں گے۔ ہاں وہ مشتبہ ان کے لیے ہوتے ہیں جنھیں ان کا علم نہیں ہوتا، درحقیقت وہ مشتبہ نہیں ہوتے۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر بہت سارے علماء کے ہاں بعض امور کے متعلق اشتباہ پایا جاتا ہے۔

یقین، یقین کے ساتھ ہی ختم ہو سکتا ہے:

جو چیز بنیادی طور پر مباح ہو، مثلاً: پانی، لباس اور زمین کا پاک ہونا تو جب تک اس کا یہ وصف

(طہارت) باقی رہے اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور جو چیز بنیادی طور پر حرام ہو، مثلاً: شرمگاہ اور جانوروں کا گوشت تو وہ چیز جب تک شرعی طریقہ کے مطابق یقینی طور پر حلال نہ ہو اس وقت تک وہ حرام ہی رہتی ہے۔ شرمگاہ عقدِ نکاح کے ساتھ اور جانور ذبح کے ساتھ حلال ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی چیز میں کسی دوسرے سبب کی بنا پر تردد واقع ہو جائے تو اسے اس کی اصل کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اگر وہ اصلاً حرام ہے تو وہ حرام ہی رہے گی اور اگر وہ اصلاً حلال ہے تو حلال ہی رہے گی۔ چنانچہ پانی، زمین اور لباس محض گمان کی بنا پر نجس نہیں ہوتے۔ اسی طرح جسم، جب تک اس کے پاک ہونے کا یقین ہو تو وہ پاک ہی متصور ہوگا۔ اور اگر کسی شخص کو شک ہو جائے کہ اس کا وضو ٹوٹا ہے یا نہیں، تو جمہور علماء کے نزدیک وہ چونکہ اصلاً باوضو تھا اس لیے وضو کی حالت میں ہی متصور ہوگا جب تک اسے وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ اس سے مشروط ہے کہ وہ نماز میں داخل نہ ہوا ہو۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ اسے نماز میں شک ہو جاتا ہے کہ شاید اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْصَرِفُ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ يَجِدُ رِيحاً» [1]

''وہ نماز نہ توڑے جب تک آواز نہ سنے یا جب تک بو نہ محسوس کرے۔''

اس حدیث کی بعض روایات میں نماز کی بجائے مسجد کا ذکر ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ بندہ چاہے نماز کی حالت میں ہو یا اس کے علاوہ کسی اور حالت میں اور اسے اِس طرح وضو کے متعلق شک ہو جائے تو اس کے لیے وہی حکم ہے جو اس حدیث میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ''مشتبہ'' کیا ہے؟:

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ''مشتبہ'' سے مراد حلال وحرام کے درمیان والا مرتبہ ہے، یعنی ایک چیز یقینی طور پر حلال اور دوسری یقینی طور پر حرام ہوتی ہے اور ایک چیز ان دونوں کے درمیان بھی ہوتی ہے جس سے جو شخص بچ جاتا ہے تو وہ اپنے دین کو محفوظ کر لیتا ہے۔ بعض اوقات امام احمد رحمہ اللہ نے ''مشتبہ'' کی تشریح اس چیز کے ساتھ کی ہے جس میں حلال وحرام کو خلط ملط کر دیا گیا ہو۔ اسی سے ضمنی طور پر یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جس آدمی کی آمدنی میں حلال وحرام دونوں کی ملاوٹ ہو تو اس کے ساتھ کس طرح کا معاملہ رکھنا چاہیے؟

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب لا يتوضأ من الشك، رقم الحديث (137)، ومسلم، كتاب الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة، رقم الحديث 98 (361)

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر اس کی آمدنی زیادہ تر حرام ذریعے سے ہو تو اس سے بچنا چاہیے، ہاں اگر حرام کی ملاوٹ بہت کم ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح اگر اس کے بارے میں یہ واضح نہ ہو کہ حلال آمدنی زیادہ ہے یا حرام تو پھر بھی اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر اس کی آمدنی زیادہ تر حلال ذریعے سے ہو تو اس کے ساتھ معاملہ کرنا اور اس کے مال سے کھانا جائز ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشرکوں اور اہلِ کتاب کے ساتھ معاملہ کرتے تھے، حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ لوگ حرام سے کلی طور پر اجتناب نہیں کرتے۔

اگر کسی کی آمدنی کا معاملہ مشتبہ ہو تو پھر اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ جبکہ زہری اور مکحول رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ جب تک یہ واضح نہ ہو کہ بعینہٖ فلاں مال حرام ہے تو اس کے مال میں سے کھانا جائز ہے چاہے وہ مشتبہ کیوں نہ ہو۔ حنبل رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ اس مال کے متعلق کہ جس میں حلال و حرام مشتبہ ہو، کہتے ہیں: اگر مال بہت زیادہ ہو تو اس کے مالک کو چاہیے کہ وہ اس میں سے حرام مال کے بقدر مال نکال دے اور باقی مال کو استعمال کر لے۔ اور اگر مال کم ہو تو وہ پورے مال سے ہی اجتناب کرے، کیونکہ وہ کم مال سے اگر کچھ مال نکال کر استعمال کرنا چاہے گا تو اس کے لیے حرام سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔ بخلاف مالِ کثیر کے کہ جس میں حرام سے بچنا مشکل نہیں ہوتا۔ حنابلہ میں سے بعض اہلِ علم نے امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کو تحریم پر نہیں بلکہ ورع و تقوی پر محمول کیا ہے اور ان کے نزدیک مال چاہے قلیل ہو یا کثیر اس میں تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں سے حرام مال کے بقدر مال نکال دیا جائے۔ اور یہی قول احناف وغیرہ کا بھی ہے۔ اور ان میں سے بعض اہلِ ورع و تقوی، مثلاً: بشر الحافی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔

اور جب کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ بعینہٖ فلاں مال حرام ہے اور وہ حرام ذریعے سے ہی لیا گیا ہے تو اس کو لینا اس پر حرام ہو جاتا ہے۔ اِس پر ابن عبدالبر رحمہ اللہ وغیرہ نے اجماع ذکر کیا ہے۔

«لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ» کا معنی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ ''ان مشتبہ امور کو بہت سارے لوگ نہیں جانتے۔'' اس بات کی دلیل ہے کہ بعض لوگ ان مشتبہ امور سے واقف اور بہت سارے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ اور ناواقف لوگوں کی دو قسمیں ہیں:

1 وہ لوگ جو اشتباہ کی بنا پر ان امور میں توقف اختیار کرتے ہیں۔

2 وہ لوگ جو ان کے بارے میں غلط نظریہ رکھتے ہیں۔

بہت سارے لوگوں کا ان مشتبہ امور سے ناواقف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں یہ پتا نہیں ہوتا کہ حقیقت میں یہ حلال ہیں یا حرام! اور یہ فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان امور کا علم رکھتے ہیں۔ اور یہ واضح ترین دلائل میں سے ایک ہے جو اِس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ حلال وحرام کے ان مسائل میں جن میں اشتباہ پایا جاتا اور اختلاف واقع ہوتا ہے اللہ کے نزدیک صحیح موقف اختیار کرنے والا شخص ایک ہی ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے علاوہ کوئی بھی اس کا علم رکھنے والا نہیں ہوتا۔ اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی بھی دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کے حکم سے ناآشنا ہوتا ہے اگرچہ وہ اس کے بارے میں یہ سمجھتا ہو کہ اس کے پاس بھی ایک دلیل موجود ہے، حالانکہ وہ ایک مشتبہ چیز کو دلیل بنا رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہ اس مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ہاں ماجور ہوتا ہے اور اس کی غلطی قابلِ معافی ہوتی ہے۔

جو چراگاہ کے قریب چلا جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر گھس جائے گا!

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ ''جو شخص شبہات سے بچتا ہے وہ اپنی عزت اور اپنا دین محفوظ کر لیتا ہے۔ اور جو شخص شبہات میں واقع ہوتا ہے وہ حرام میں واقع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک چرواہا (کسی کی) چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے تو عین ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر چلا جائے۔''

اِس میں نبی ﷺ نے مشتبہ امور کے بارے میں لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ اور یہ تقسیم ان لوگوں کے اعتبار سے ہے جن کے لیے وہ امور مشتبہ ہوتے ہیں اور انھیں ان کا علم نہیں ہوتا۔ جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے کہ جس کو ان مشتبہ امور کا علم ہو اور وہ اپنے علم کے مطابق ان پر عمل بھی کرتا ہو تو یہ تیسری قسم ہے جسے ہم نے ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کا حکم بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ تیسری قسم ان تینوں اقسام میں سب سے افضل قسم ہے، کیونکہ اسے ان امور میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا علم ہوتا ہے جو دیگر لوگوں کے لیے مشتبہ ہوتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں اپنے علم کی اتباع بھی کرتا ہے۔

رہے وہ لوگ جنھیں مشتبہ امور میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا علم نہیں ہوتا تو ان کی دو قسمیں ہیں:

1 جو ان شبہات سے بچ جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کے لیے مشتبہ ہوتے ہیں، تو وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو نقص اور عیب سے بچا لیتا ہے۔ اور ''عزت'' وہ چیز ہے جس سے انسان کی تعریف ہوتی ہے یا

مذمت۔ اگر اس کو اچھے انداز میں ذکر کیا جائے تو تعریف اور اگر اسے برے انداز میں ذکر کیا جائے تو مذمت ہوتی ہے۔ اور یہ بعض اوقات خود انسان کے اپنے متعلق ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے بزرگوں یا گھر والوں کے متعلق ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو مشتبہ امور سے بچا لے اور ان سے پرہیز کرے تو وہ اپنی عزت کو ایک مضبوط قلعے میں اس عیب اور نقص سے محفوظ کر لیتا ہے جس کا سامنا اس آدمی کو کرنا پڑتا ہے جو ان مشتبہ امور سے اپنے آپ کو نہیں بچاتا۔ اور اس میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ جو آدمی شبہات کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنے آپ کو گویا خود ہی بے عزت کرتا ہے اور دوسروں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اس کی عزت کو نشانہ بنائیں۔ جیسا کہ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ ''جو آدمی خود ہی اپنے اوپر تہمتیں لگانے کا موقع دے تو وہ اس شخص کو ملامت نہ کرے جو اس پر تہمت لگائے یا اس کے بارے میں بدگمانی کرے۔''

(2) جو مشتبہ امور میں واقع ہو جاتا ہے باوجودیکہ وہ اس کے نزدیک مشتبہ ہوتے ہیں۔

باقی جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو یہ جانتا ہو کہ فلاں چیز حلال ہے، پھر وہ اس پر عمل کر لے اور لوگ اسے مشتبہ سمجھتے ہوں تو اس میں اس پر کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم اگر اسے اندیشہ ہو کہ اس پر عمل کرنے سے لوگ اسے نشانہ بنائیں گے اور وہ اپنی عزت کو بچانے کی خاطر اسے ترک کر دے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو جس نے آپ ﷺ کو ایک خاتون کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا، تو اسے کہا تھا: ''یہ صفیہ بنت حیی ہے، یعنی آپ ﷺ کی بیوی۔''[1]

وہ شخص جو مشتبہ امور کا ارتکاب کرے باوجودیکہ وہ اس کے نزدیک مشتبہ ہوں تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں جو ارشاد فرمایا کہ ''وہ حرام میں واقع ہو جاتا ہے۔'' تو اس کے دو معانی بیان کیے گئے ہیں:

[1] وہ مشتبہ امر کا ارتکاب اس طرح کرے کہ اسے یہ پتا ہو کہ اس کا ارتکاب اسے آہستہ آہستہ اس چیز تک پہنچا دے گا جس کے حرام ہونے کا اسے علم ہو۔ صحیحین کی اسی حدیث کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''جو شخص اس کام کی جسارت کرے کہ جس کے بارے میں اسے شک ہو کہ یہ گناہ کا کام ہے یا نہیں تو عین ممکن ہے کہ وہ اس حرام میں واقع ہو جائے جس کے حرام ہونے کا اسے واضح علم ہو۔''[2]

---

(1) صحيح البخاري، كتاب الاعتكاف، باب هل يخرج المعتكف لحوائجه، رقم الحديث (2035)، ومسلم، كتاب السلام، باب ما يستحب لمن رؤي خاليا بامرأة، رقم الحديث: 4 (1712)

(2) سنن النسائي، كتاب الأشربة، باب الحث على ترك الشبهات، رقم الحديث (5726)

2 وہ اس کام کا ارتکاب کرے جو اس کے نزدیک مشتبہ ہو اور اسے یہ پتا نہ ہو کہ یہ حلال ہے یا حرام، تو ایسے شخص کا حرام سے بچنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کام جو اس کے نزدیک مشتبہ ہے وہ درحقیقت حرام ہو، چنانچہ وہ جب اس پر عمل کرے گا تو حرام میں واقع ہو جائے گا اور اسے پتا بھی نہ چلے گا کہ وہ حرام کا ارتکاب کر چکا ہے۔

چرواہا اور چراگاہ:

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان کہ ''جیسا کہ ایک چرواہا (کسی کی) چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے تو عین ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر چلا جائے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور خبردار! اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی محرمات ہیں۔'' یہ ایک مثال ہے جو آپ ﷺ نے اس شخص کے لیے بیان کی ہے کہ جو شبہات میں واقع ہو جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ حرام میں واقع ہو جائے۔ بعض روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمھارے لیے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔''[1]

پھر آپ ﷺ نے مذکورہ مثال بیان فرمائی جس میں آپ ﷺ نے محرمات کو اس چراگاہ کی مثل قرار دیا جس کی بادشاہ حفاظت کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اس کے قریب آنے سے منع کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے شہر (مدینہ منورہ) کے اردگرد بارہ میل تک ایک حد مقرر کر دی تھی جس میں نہ کسی درخت کو کاٹا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس میں شکار کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی بعض ایسے مقامات کو جہاں گھاس چارہ اگتا تھا صدقے کے جانوروں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان حدود کی حفاظت کرنے اور اپنے بندوں کو ان کے قریب جانے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا فرمان ہے:

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾

[البقرۃ: ۱۸۷]

''یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، لہٰذا تم ان کے قریب بھی نہ جانا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ متقی بن جائیں۔''

[1] صحیح البخاري، کتاب البیوع، باب الحلال بین والحرام بین، رقم الحدیث (2051)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ اس نے لوگوں کے لیے حلال وحرام کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، لہٰذا وہ حرام کے قریب نہ جائیں اور حلال سے تجاوز نہ کریں۔ اسی طرح دوسری آیتِ کریمہ میں اس کا فرمان ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

[البقرۃ: ۲۲۹]

''یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، لہٰذا تم انھیں مت پھلانگنا اور جو بھی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوں گے۔''

نبی کریم ﷺ نے اِس حدیث میں واضح کر دیا کہ جو شخص چراگاہ کے آس پاس یا اس کے قریب چرائے تو اس کا اس میں داخل ہونے اور اس میں چرانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا جو آدمی حلال سے تجاوز کر کے شبہات میں واقع ہو جائے تو وہ حرام کے انتہائی قریب پہنچ جاتا ہے اور اس کا اس میں واقع ہونے کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اِس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام حرام کاموں سے دور رہنا ہی بہتر ہے، لہٰذا انسان کو اپنے اور ان کے درمیان پردہ رکھنا چاہیے۔

سدِ ذرائع کا اصول:

اسی حدیث سے وہ اہلِ علم بھی استدلال کرتے ہیں جو حرام کاموں تک پہنچانے والے تمام ذرائع اور وسائل کو روکنے اور ان کا سدِ باب کرنے کے قائل ہیں۔ یہ وہ اصول ہے جس کی بنا پر شریعت میں کئی چیزوں کو حرام کر دیا گیا ہے، مثلاً: جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے، اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں ملاقات کرنا حرام ہے، نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد نفلی نماز پڑھنا حرام ہے تاکہ طلوع یا غروب کے وقت نماز نہ پڑھی جائے۔ اسی طرح وہ شخص جس کو اپنی شہوت پر کنٹرول نہ ہو اسے روزہ کی حالت میں بیوی کی مقاربت سے منع کر دیا گیا ہے۔ نیز بہت سارے علماء نے حیض کی حالت میں عورت سے اس کی ناف اور اس کے گھٹنوں کے درمیان بغیر کسی حائل کے مقاربت کرنے سے منع کر دیا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کو اِس حالت میں حکم دیتے تھے کہ وہ لنگوٹ کس لیں، اس کے بعد آپ ﷺ کپڑے کے اوپر سے ان سے مقاربت کرتے تھے۔[1]

[1] صحيح البخاري، كتاب الحيض، باب مباشرة الحائض، رقم الحديث: (302)، ومسلم، كتاب الحيض، باب مباشرة الحائض فوق الإزار، رقم الحديث: 1 (293)

دل اعضاء کا بادشاہ:

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان: ''خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور وہ ہے دل۔'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندے کے اعضاء سے ہونے والی حرکات کی درستی اور اس کا حرام اور مشتبہ امور سے بچنا اس کے دل کی درستی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اس کا دل صحیح سالم ہو، اس میں اللہ کی محبت اور جس چیز سے وہ محبت کرتا ہے اس کی محبت کے سوا کچھ نہ ہو، اس میں اللہ کی خشیت ہو اور اس کے دل میں اس چیز میں واقع ہونے کا خدشہ ہر وقت رہتا ہو جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء کی حرکات درست رہتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ تمام حرام کاموں سے بچا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شبہات سے بھی بچنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ محرمات میں واقع نہ ہو جائے۔

اور اگر اس کا دل ہی فاسد ہو چکا ہو، اس پر نفسانی خواہشات کا اور من پسند چیزوں کی محبت کا غلبہ ہو، خواہ انھیں اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہو تو اس کے تمام اعضاء کی حرکات بھی فاسد ہو جاتی ہیں اور وہ گناہوں کے ارتکاب اور مشتبہ امور اور دلی خواہشات کی اتباع پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دل اعضاء کا بادشاہ ہے اور باقی اعضاء اس کی فوج ہیں جو اس کی اطاعت کرتے، اس کے احکام پر عمل درآمد کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اگر بادشاہ صالح ہو تو اس کی فوج بھی صالح ہوتی ہے اور اگر بادشاہ فاسد ہو تو اس کی فوج بھی اسی کی طرح فاسد ہوتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اطاعت گزار دل ہی کام آئے گا۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴾ [الشعراء: ۸۸۔۸۹]

''اس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ سوائے اس شخص کے جو اللہ کے پاس اطاعت گزار دل لے کر آئے گا۔''

اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

« لَا يَسْتَقِيمُ إِيْمَانُ عَبْدٍ حَتَّى يَسْتَقِيمَ قَلْبُهُ، وَلَا يَسْتَقِيمُ قَلْبُهُ حَتَّى يَسْتَقِيمَ لِسَانُهُ، وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ حَتَّى يَأْمَنَ جَارُهُ بَوَائِقَهُ » [1]

[1] مسند أحمد: (198/3) بإسناد حسن من حديث أنس بن مالك.

”کسی بندے کا ایمان مستقیم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل مستقیم نہ ہو۔ اور اس کا دل مستقیم نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زبان مستقیم نہ ہو۔ اور کوئی ایسا آدمی جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔“

ایمان کی استقامت سے مراد بندے کے اعضاء کے اعمال کی استقامت ہے۔ لہٰذا اس کے اعضاء کے اعمال دل کی استقامت کے ساتھ ہی مستقیم ہو سکتے ہیں۔ اور دل کی استقامت سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھرا ہوا ہو، اس میں اللہ کی اطاعت کرنے کی محبت اور نافرمانی کرنے کی کراہت ہو۔ یہی توحید کی حقیقت ہے اور یہی معنی ہے ”لا إله إلا الله“ کا۔ لہٰذا دلوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک ان کا معبود جس کی وہ عبادت کریں، جس کی معرفت حاصل کریں، جس سے محبت کریں اور جس سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اکیلا اللہ تعالیٰ نہ ہو کہ جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو آسمان اور زمین میں فساد ہی فساد ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء:٢٢]

”اگر زمین و آسمان میں کوئی اور معبود بھی ہوتا تو دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ آسمانی اور زمینی دونوں جہان درست نہیں رہ سکتے جب تک ان میں بسنے والے تمام لوگوں کی حرکات اور ان کے جسمانی اعمال حرکتِ قلب اور اس کے مقصد کے مطابق نہ ہوں۔ اگر اس کی حرکت اور اس کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی رضا ہو تو وہ خود بھی ٹھیک رہتا ہے اور پورے جسم کی حرکات بھی درست رہتی ہیں۔ اور اگر دل کی حرکت اور اس کا مقصد غیر اللہ کی رضا ہو تو وہ خود بھی فاسد ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق جسم کی تمام حرکات بھی بگڑ جاتی ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ وَ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَ أَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ أَنْكَحَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ إِيْمَانَهُ»[1]

”جو شخص اللہ کے لیے دے، اللہ کے لیے روکے، اللہ کے لیے محبت کرے اور اللہ کے لیے بغض رکھے تو وہ اپنے ایمان کو مکمل کر لیتا ہے۔“

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب دل اور اعضاء کی تمام حرکات اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں تو اس کے ساتھ بندے کا ایمان ظاہری و باطنی طور پر مکمل ہو جاتا ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب: حدثنا عمرو بن علي، رقم الحديث (2521) من حديث معاذ بن أنس الجهني، وأحمد في المسند (3/140-138)

امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''میں نے کبھی اپنی نظر نہیں اٹھائی اور نہ ہی اپنی زبان کو جنبش دی اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے کسی چیز کو پکڑا اور نہ ہی اپنے قدموں کو اٹھایا جب تک کہ میں یہ نہ دیکھ لوں کہ اس سے فرمانبرداری ہوگی یا نافرمانی؟ اگر فرمانبرداری ہو تو کر گزرتا ہوں اور اگر نافرمانی ہو تو چھوڑ دیتا ہوں۔''

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ کوئی بھی کام یا واضح طور پر حلال ہوگا، یا واضح طور پر حرام ہو گا، یا ان دونوں کے درمیان ہوگا۔
2. جس شخص کی زیادہ تر آمدنی حلال کی ہو تو اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے اور اس کے مال سے کھانا بھی۔
3. جب کسی متعین چیز کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ یہ حرام ہے تو اسے لینا بھی حرام ہو جاتا ہے۔
4. تمام محرمات سے دور رہنا ضروری ہے، لہٰذا مسلمان کو اپنے اور ان کے درمیان پردہ رکھنا چاہیے۔
5. یہ حدیث ''سدِ ذرائع'' کی ایک بنیادی دلیل ہے۔
6. دل اعضاء کا بادشاہ اور اعضاء اس کی فوج ہیں۔
7. مشتبہ امور تمام لوگوں کے نزدیک مشتبہ نہیں ہوتے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ان سے بہت سارے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔'' یہ نہیں فرمایا کہ تمام لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔
8. جس چیز میں بھی شک وشبہ ہو اس سے دور رہنا بہتر ہے تاکہ دین سلامت رہے۔

سوالات:

1. واضح طور پر حلال اور واضح طور حرام کی ایک ایک مثال پیش کریں۔
2. مشتبہ امور کے وجود کا سبب کیا ہے؟ اور کیا یہ شریعت میں عیب سمجھا جائے گا؟
3. اختلاف علماء کے اسباب کون سے ہیں؟
4. ''ہر چیز اپنی اصلیت پر باقی رہتی ہے۔'' یہ قاعدہ اس حدیث کے کن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے؟
5. امام احمد رحمہ اللہ نے مشتبہات کی کیا تفسیر کی ہے؟
6. کیا اس آدمی کے مال سے کھانا جائز ہے جس کی آمدنی میں حلال وحرام خلط ملط ہو؟

7 نبی کریم ﷺ کے اس فرمان: ''جو آدمی شبہات میں واقع ہو جائے تو وہ حرام میں واقع ہو جاتا ہے۔'' کا کیا مطلب ہے؟

8 ''انسان کا دل اس کے ان خیالات کا برتن ہے جو اس میں کسی کام کو کرنے یا اس کو چھوڑنے کی رغبت پیدا کرتے ہیں۔'' اِس عبارت کی تشریح کریں اور یہ بتائیں کہ اس کا مذکورہ حدیث سے کیا تعلق ہے؟



دین خیر خواہی کا نام ہے

7 سیدنا ابو رقیہ تمیم بن اوس الداری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ » ثَلَاثاً، قُلْنَا: لِمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: « لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُوْلِهِ، وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ »[1]

''دین خیر خواہی کا نام ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ ہم نے کہا: کس کے لیے اے اللہ کے رسول؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔''

راویِ حدیث:

سیدنا تمیم بن اوس بن خارجہ الداری ابو رقیہ رضی اللہ عنہ، پہلے نصرانی تھے، پھر مدینہ میں حاضر ہو کر ۹ ہجری میں اسلام قبول کیا۔ انھوں نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دجال اور جساسہ کا واقعہ بیان کیا تھا۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۸ احادیث روایت کیں۔ آپ عبادت گزار اور دلنشیں خطیب تھے۔ آپ کی وفات ۴۰ھ میں ہوئی۔[2]

مرتبۂ حدیث:

ابو داود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر فقہ حدیث کا دار و مدار ہے اور حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث عظیم الشان ہے اور محمد بن اسلم الطوسی نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث دین کا چوتھا حصہ ہے۔

نصیحت کی انواع:

بہت سی احادیث میں نصیحت کی تین انواع وارد ہوئی ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، رقم الحديث: 95 (55)

[2] معرفة الصحابة (448/1)، الإصابة (186/1)

① تمام مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا۔

② اربابِ اقتدار کی خیر خواہی کرنا۔

③ اربابِ اقتدار کی طرف سے عوام کی خیر خواہی کرنا۔

پہلی نوع کے متعلق صحیحین میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے نماز قائم کرنے، زکات ادا کرنے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔[1]

دوسری نوع کے بارے میں یہی حدیث ہے جو اس وقت ہمارے زیرِ بحث ہے۔ اور تیسری نوع کے بارے میں صحیحین میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس بندے کو اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کا ذمہ دار بنا دے، پھر وہ ان کی خیر خواہی نہ کرے تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''[2]

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنی امتوں کی خیر خواہی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، جیسا کہ نوح علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کے متعلق اس نے آگاہ کیا ہے۔

کمزوروں کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کرنا:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَي الْمَرْضٰى وَلَا عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [التوبة: ٩١]

''کمزور، مریض اور وہ لوگ جن کے پاس (شرکتِ جہاد کے لیے) خرچ کرنے کو کچھ نہیں (اور وہ پیچھے رہ جائیں) تو ان پر کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر خواہ ہوں۔''

یعنی جو شخص عذر کی بنا پر جہاد سے پیچھے رہ جائے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اپنے پیچھے رہنے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خیر خواہ ہو۔ کیونکہ منافق جھوٹے عذر بیان کرتے تھے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خیر خواہی کے بغیر ہی وہ جہاد سے پیچھے رہتے تھے۔

---

① صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب قول النبي ﷺ: الدين النصيحة، رقم الحديث (57) وله أطراف، ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، رقم الحديث: 97 (56)

② صحيح البخاري، كتاب الأحكام، باب من استرعى رعية فلم ينصح، رقم الحديث (7150)، ومسلم، كتاب الإيمان، باب استحقاق الوالي الغاش لرعيته النار، رقم الحديث: 227 (1429)

رسول اکرم ﷺ نے اِس حدیث میں آگاہ کیا ہے کہ ''دین خیرخواہی کا نام ہے۔'' جو اس بات کی دلیل ہے کہ خیرخواہی دین کی ان تینوں خصلتوں کو شامل ہے جو حدیثِ جبریل میں ذکر کی گئی ہیں، یعنی ایمان، اسلام اور احسان۔ اللہ کے لیے خیرخواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے واجبات کو مکمل طور پر ادا کیا جائے اور اسی کو احسان کہتے ہیں، لہٰذا اللہ کے لیے خیرخواہی اِس کے بغیر ناممکن ہے۔ اور یہ عملی طور پر اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمال درجے کی محبت نہ ہو۔ اور جب اِس طرح کی محبت ہو جاتی ہے تو اس کی بنا پر بندہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی خاطر نفلی عبادات میں اجتہاد کرتا ہے اور عبادات یوں سرانجام دیتا ہے کہ جیسے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہو۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ محرمات سے اجتناب کرتا اور مکروہات کو بھی ترک کر دیتا ہے۔

امام خطابی رحمہ اللہ کے نزدیک نصیحت کی تعریف:

''نصیحت'' وہ کلمہ ہے کہ جس کی تعبیر ایک جملے کے ساتھ کی جاتی ہے اور وہ ہے: جس کی خیرخواہی کرنا مقصود ہو اس کے لیے ارادۂ خیر کرنا۔ موصوف کا کہنا ہے کہ عربی زبان میں ''نصح'' کا معنی ہے: خلوص۔ جیسا کہ عرب میں کہا جاتا ہے: ''نصحت العسل'' (میں نے شہد کو صاف کیا۔)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے نصیحت کا معنی ہے: اس کی وحدانیت کے متعلق عقیدہ صاف رکھنا اور اس کی عبادت میں نیت کو (کھوٹ اور ملاوٹ سے) خالص (صاف اور پاک) کرنا۔ اور اس کی کتاب کے لیے نصیحت کا معنی ہے: اس پر ایمان لانا اور اس میں جو کچھ ہے اس پر عمل کرنا۔ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے نصیحت کا معنی ہے: ان کی نبوت کو تسلیم کرنا اور ان کے تمام اوامر ونواہی میں ان کی اطاعت کرنا۔ اور عام مسلمانوں کے لیے نصیحت کا معنی ہے: ان کی مصلحتوں کی طرف ان کی راہنمائی کرنا۔[1]

اللہ تعالیٰ کے لیے نصیحت کرنا:

جو نصیحت اللہ کے لیے ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ بندہ اللہ رب العزت کی محبت کے ساتھ اس کے احکامات پر عمل کرنے کا شدت سے اہتمام کرے، اس کے فرائض کو پورا کرے اور اس نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے ان سے اجتناب کرے۔

یاد رہے کہ بعض اوقات بندے سے تمام اعمال کی پابندی اٹھالی جاتی ہے، تاہم اللہ کے لیے نصیحت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ ایک بندہ اگر اِس طرح مریض ہو کہ وہ اپنے اعضاء کے ذریعے کچھ بھی نہ کر

[1] اعلام السنن للخطابي (1/193-189).

سکتا ہو، نہ زبان سے اور نہ ہی کسی اور عضو سے، لیکن اس کی عقل ٹھیک طرح سے کام کر رہی ہو تو اس حالت میں بھی اپنے دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے نصیحت اس سے ساقط نہیں ہوتی۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دل ہی دل میں اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو اور یہ نیت کرے کہ اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو اللہ کے فرائض کو ادا کرے گا اور اس نے جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے پرہیز کرے گا۔ اگر وہ اپنے دل میں اِس طرح کے جذبات نہیں رکھتا تو وہ اللہ کے لیے نصیحت کرنے والا نہیں ہو گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے جو نصیحت واجب ہے اسی کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے نافرمان کی نافرمانی پر راضی نہ ہو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار سے محبت کرنے والا ہو۔

اللہ کی کتاب کے لیے نصیحت کرنا:

اللہ تعالیٰ کی کتاب کے لیے نصیحت یہ ہے کہ وہ اس سے شدید محبت کرے اور اس کی عظمت کو اپنے دل میں بٹھائے کیونکہ وہ خالقِ کائنات کا کلام ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اس میں غور وفکر کرتے ہوئے اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اس کی تلاوت کے دوران ان آیات کے معانی کو دل میں اتارے جن کے متعلق اس کا خالق و مالک یہ پسند کرتا ہے کہ میرا بندہ انھیں اچھی طرح سمجھ لے اور سمجھنے کے بعد ان پر عمل کرے۔

ایک شخص کو اگر کوئی بندہ نصیحت کرے تو وہ اس کی نصیحت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس کی طرف سے کوئی مکتوب آئے تو وہ اسے بھی سمجھنے کا پورا اہتمام کرتا ہے تاکہ وہ اس پر عملدر آمد کر سکے۔ بالکل اسی طرح بندے کو اپنے رب کی کتاب کو بھی سمجھنے کا بھرپور اہتمام کرنا چاہیے تاکہ وہ اس کی منشا کے مطابق اس کے احکامات پر عمل کر سکے۔ نیز وہ اس سے جو کچھ سمجھے اسے دیگر لوگوں تک بھی پہنچائے اور ہمیشہ اس سے محبت کرتے ہوئے اسے بار بار پڑھتا رہے اور اس میں ذکر کیے گئے اخلاق و آداب کو اختیار کرے اور اسے اپنی زندگی کا دستور بنائے۔

رسول اکرم ﷺ کے لیے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد نصیحت کرنا:

رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں ان کے لیے نصیحت ہے: آپ کی اطاعت وفرمانبرداری، نصرت وتائید اور معاونت کی ہر ممکن کوشش کرنا، جب آپ مال خرچ کرنے کا مطالبہ کریں تو بے دریغ خرچ کرنا اور جان سے بڑھ کر آپ سے محبت کرنا۔

اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے لیے نصیحت ہے: آپ ﷺ کی سنتوں کا اہتمام کرنا، آپ کے اخلاق وکردار اور روز مرہ آداب میں آپ کی پیروی کرنا، دل کی گہرائیوں سے آپ کا احترام کرنا اور جو

شخص آپ کی سنتوں کی خلاف ورزی کرے اور دنیا کی خاطر اسے ترک کر دے اس پر ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے اس سے اعراض کرنا۔ اِس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے رشتہ داروں، مہاجرین وانصار اور جس نے بھی اسلام قبول کر کے دن اور رات کی کسی گھڑی میں آپ ﷺ کا ساتھ دیا، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کرنا اور اپنی وضع قطع اور لباس میں آپ ﷺ کی مشابہت کرنا۔

مسلمانوں کے اہلِ اقتدار کے لیے نصیحت کرنا:

مسلمانوں کے اہلِ اقتدار کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اصلاح، رشد وہدایت اور عدل وانصاف سے محبت ہو، قوم کو ان کی قیادت میں اکٹھا رکھنے کی رغبت ہو اور قوم کے انتشار سے نفرت ہو۔ اور جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم دیتے رہیں ان کی فرمانبرداری کرتے رہنا۔ اور جو شخص ان کے خلاف بغاوت کرے اس سے نفرت کرنا اور اطاعتِ الٰہی کے دائرے میں رہتے ہوئے انھیں مضبوط کرنا۔

عام مسلمانوں کے لیے نصیحت کرنا:

عام مسلمانوں کے لیے نصیحت یہ ہے کہ بندہ ان کے لیے ہر وہ چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ اور ان کے لیے ہر اس چیز کو ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہو۔ ان پر شفقت کرے، چھوٹوں پر ترس کھائے اور بڑوں کا احترام کرے۔ اگر انھیں کوئی غم لاحق ہو تو اسے بھی لاحق ہو، اگر وہ خوش ہوں تو یہ بھی ان کی خوشی پر اپنی خوشی کا اظہار کرے اگرچہ اس میں اس کے لیے دنیاوی لحاظ سے کوئی ضرر ہو۔ مثلاً: مسلمانوں کے لیے مختلف چیزوں کی قیمتیں کم کرنا، اگرچہ تاجر کے منافع میں کمی کیوں نہ آئے۔ اسی طرح ہر نقصان دہ چیز کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کرنا، ان کی اصلاح، الفت ومحبت اور ہمیشہ خوشحال رہنے کی محبت پیدا کرنا، نیز ان کے دشمنوں کے خلاف ان کا ساتھ دینا اور ہر تکلیف کو ان سے دور رکھنا بھی ان کے لیے نصیحت میں شامل ہے۔

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ کے نزدیک نصیحت کیا ہے؟:

ابو عمرو بن الصلاح رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''نصیحت'' ایک جامع لفظ اور کئی باتوں پر مشتمل ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ناصح ارادی اور عملی طور پر دوسروں کے لیے خیر وبھلائی کے تمام امور سرانجام دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے لیے

نصیحت ہے: اس کی توحید کو ماننا، اس کی ان صفات پر ایمان لانا جو کمال و بزرگی پر دلالت کرتی ہیں اور ان صفات سے اسے پاک تصور کرنا جو کسی نقص پر دلالت کرتی ہیں، اس کی نافرمانی سے اجتناب کرنا، اخلاص ومحبت کے ساتھ اس کی فرمانبرداری کرنا، اس کی رضا کے لیے محبت کرنا اور اسی کی رضا کی خاطر دشمنی کرنا، جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے خلاف جہاد کرنا۔ اور ان تمام امور کی طرف دعوت دینا اور لوگوں کو ان کی ترغیب دلانا۔

''اللہ کی کتاب کے لیے نصیحت ہے: اس پر ایمان لانا، اسے ایک مقدس اور عظیم کتاب تسلیم کرنا، اس کی تلاوت اس طرح کرنا جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، اس کے اوامر پر عمل کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا، اس کے علوم وامثال کو سمجھنا، اس کی آیات میں تدبر کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا۔ نیز غالی لوگوں کی تحریف سے اسے بچانا اور ملحد لوگوں کی طرف سے اسے نشانہ بنانے کی ناروا سعی کا مقابلہ کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

''اللہ کے رسول ﷺ کے لیے نصیحت بھی اس کے قریب قریب ہے۔ یعنی آپ ﷺ اور آپ کی شریعت پر ایمان لانا، آپ ﷺ کا احترام کرنا، مضبوطی سے آپ ﷺ کی فرمانبرداری کرنا، آپ ﷺ کی سنتوں کو زندہ کرنا، ترجیحی بنیادوں پر علومِ حدیث کا مطالعہ کرنا اور ان کی نشر واشاعت کرنا، جو شخص آپ ﷺ یا آپ ﷺ کی سنت کا دشمن ہو اس کے ساتھ دشمنی رکھنا اور جو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی سنت سے محبت کرنے والا ہو اس سے محبت کرنا، آپ ﷺ کے اخلاق کو اختیار کرنا، آپ ﷺ کے بتلائے ہوئے آداب پر عمل کرنا اور آپ ﷺ کے آل واصحاب رضی اللہ عنہم سے محبت کرنا...... وغیرہ

''مسلمانوں کے ذمہ داران کے لیے نصیحت ہے: حق پر ان سے تعاون کرنا، اس میں ان کی فرمانبرداری کرنا اور انھیں حق کی یاد دہانی کرانا۔ نرم اور اچھے انداز سے انھیں تنبیہ کرنا، ان کے خلاف میدان میں نہ کودنا، ان کے لیے توفیقِ باری تعالیٰ کی دعا کرنا اور دوسرے لوگوں کو اس کی ترغیب دلانا۔

''عام مسلمانوں کے لیے نصیحت ہے: ان کی مصلحتوں کی طرف ان کی راہنمائی کرنا، انھیں دین ودنیا کی تعلیم دینا اور ان کے عیبوں پر پردہ ڈالنا۔ ان کے لیے نقصان دہ امور کا سدِ باب کرنا، ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرنا اور ان کا دفاع کرنا، ان سے دھوکا اور حسد کرنے سے

پرہیز کرنا، ان کے لیے اس چیز کو پسند کرنا جس کو بندہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہو اور اس چیز کو ناپسند کرنا جس کو وہ خود اپنے لیے ناپسند کرتا ہو...... وغیرہ۔'' انتھی[1]

اسی طرح ان کے لیے نصیحت یہ بھی ہے کہ ان سے ہر تکلیف کو دور رکھا جائے، ان میں سے جو فقیر اور محتاج ہو اسے ترجیح دی جائے، ان میں جو جاہل ہو اسے تعلیم دی جائے اور ان میں سے جو آدمی اپنے قول وعمل میں حق سے انحراف کر لے تو اسے نرمی کے ساتھ حق کی طرف واپس لایا جائے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہوئے نرم رویہ اختیار کیا جائے، ان میں جو فساد پایا جاتا ہو اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے اگرچہ اسے دنیاوی اعتبار سے ضرر کیوں نہ پہنچے۔ جیسا کہ بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ ''میں چاہتا ہوں کہ پوری مخلوق اللہ کی فرمانبردار بن جائے اور میرے گوشت کو قینچیوں کے ساتھ کاٹ دیا جائے۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہا کرتے تھے:

''کاش! میں تم میں کتاب اللہ کو نافذ کروں اور تم اس پر عمل کرنے والے بن جاؤ۔ اور میں جب بھی تم میں کسی سنت کو نافذ کروں تو میرا ایک عضو گر جائے یہاں تک کہ شریعتِ محمدیہ کو نافذ کرتے کرتے میری روح نکل جائے۔''

علماء کا فرض:

اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کی انواع میں سے ایک نوع وہ ہے جو علماء کے ساتھ خاص ہے اور وہ ہے: گمراہ کن اور خلافِ کتاب وسنت نظریات کی تردید کتاب وسنت ہی کے ساتھ کرنا اور انہی دو کی روشنی میں برحق نظریات کی وضاحت کرنا۔ اسی طرح قرآن وحدیث کی روشنی میں علمائے کرام کے کمزور اقوال کی تردید کرنا۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کو بیان کرنا اور ضعیف احادیث کے بارے میں لوگوں کو متنبہ کرنا کہ ان میں فلاں فلاں راوی ناقابلِ حجت ہے، فلاں کی روایت قابلِ قبول اور فلاں کی روایت ناقابلِ قبول ہے۔ اور ثقہ راویوں میں سے جن راویوں سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی وضاحت کرنا۔

نصیحت کے متعلق علماء کے بعض اقوال:

حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں:

[1] صیانة صحیح مسلم من الإخلال والغلط وحمایته من الإسقاط والسقط (221۔ 224)

''آپ اپنے بھائی کی خیر خواہی کا حق ادا نہیں کر سکتے جب تک آپ اسے اس چیز کا حکم نہ دیں جس سے آپ خود عاجز آ چکے ہوں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض کا کہنا ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم چاہو تو میں تمھارے لیے اللہ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کو اس کے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ لوگ ہیں جو اس کے بندوں کے دلوں میں اللہ کی محبت پیدا کرتے اور انھیں اللہ کا محبوب بناتے ہیں اور خیر خواہی کے لیے زمین میں ہر ممکن کوشاں رہتے ہیں۔''

فرقد سبخی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا امراء کا امیر ہوتا ہے، قیامت کے روز وہ اولیں جماعتوں اور قریب ترین مجالس میں شامل ہوگا اور وہی اللہ کی محبت کا مستحق ہوگا۔ محبتِ الٰہی تمام عبادات کا مقصود و منتہی ہے۔ اور محبت کرنے والے اپنی طویل ترین جدوجہد سے نہیں اکتاتے، وہ اللہ اور اس کے ذکر سے محبت کرتے ہیں، مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کرتے ہیں، اس کے بندوں کے درمیان پند ونصائح کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، انھیں ان کے اعمال کے متعلق ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ جب پردے اٹھ جائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا! ایسے ہی لوگ اللہ کے اولیاء، اس کے محبوب اور برگزیدہ ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو حقیقی راحت اللہ کی ملاقات ہی میں نصیب ہوتی ہے۔''

ابن علیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ابوبکر مزنی رحمہ اللہ نے جو کہا ہے کہ ''سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں پر نماز، روزہ کی بنا پر نہیں بلکہ اس چیز کی بنا پر فوقیت لے گئے تھے جو ان کے دل میں تھی۔'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل میں اللہ جل شانہ کی جو سچی محبت تھی اور اس کی مخلوق کے لیے خیر خواہی کے جو سچے جذبات تھے درحقیقت وہ اسی کی بنا پر باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فوقیت لے گئے تھے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ہمارے ہاں جس شخص کو جو بلند مقام ومرتبہ نصیب ہوا اسے وہ نماز روزے کی کثرت کی بنا پر نہیں بلکہ اس شخص کی سخاوتِ نفس، طہارتِ قلب اور امت کے لیے نصیحت کی بنا پر نصیب ہوا۔''

یاد رہے کہ سلف صالحین جب کسی کو نصیحت کرنا چاہتے تو اسے خفیہ طور پر نصیحت کرتے، حتی کہ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو خفیہ طور پر نصیحت کرے تو وہ واقعتاً نصیحت ہے اور جو شخص لوگوں کے سامنے کسی کو نصیحت کرے تو وہ نصیحت نہیں بلکہ ڈانٹ ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنا اور اپنے علاوہ ہر ایک کا خیر خواہ ہو۔
2. نصیحت کے کچھ آداب ہیں جن کا لحاظ کرنا ضروری ہے تا کہ اس کے مقاصد پورے ہو سکیں۔
3. اس حدیث میں ''نصیحت'' کو دین اور اسلام کہا گیا ہے۔
4. اللہ کے لیے نصیحت مسلمان سے کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتی۔
5. نصیحت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جس کے لیے نصیحت کی جائے اس سے محبت بھی رکھی جائے۔
6. اللہ کے احکامات پر استقامت اختیار کرنا انسان کی اپنی ذات کے لیے نصیحت ہے۔
7. نصیحت حسبِ قدرت لازم ہے، اگر ناصح کو یہ پتا ہو کہ اس کی نصیحت کو قبول اور اس کے حکم پر عمل درآمد کیا جائے گا اور وہ اپنے اوپر کوئی خطرہ بھی محسوس نہ کرتا ہو تو اسے نصیحت ضرور کرنی چاہیے۔ اور اگر اسے اندیشہ ہو کہ نصیحت کی وجہ سے اسے اذیت پہنچائی جائے گی تو اسے نصیحت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔

سوالات:

1. امام خطابی رحمہ اللہ نے ''نصیحت'' کی جو لغوی واصطلاحی تعریف کی ہے اسے ذکر کریں۔
2. رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد نصیحت کی کیا صورتیں ہیں؟
3. مسلمانوں کے ذمہ داران اور عام مسلمانوں کے لیے نصیحت میں کیا فرق ہے؟
4. اللہ کے لیے نصیحت کے کیا تقاضے ہیں؟
5. اللہ کی کتاب کے لیے نصیحت کیسے ہوتی ہے؟



اسلام کا ایک کلی ضابطہ

8 سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ»[1]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نیز وہ نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو انھوں نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو مجھ سے محفوظ کر لیا، سوائے اِس کے کہ ان پر اسلام کا کوئی حق ہو اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔''

دلالتِ حدیث:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ ''انھوں نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو مجھ سے محفوظ کر لیا'' اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتال کا اور جو شخص اسلام قبول کرنے سے انکار کر دے اسے قتل کرنے کا حکم مل چکا تھا۔ اور یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد تھا۔

پہلے شہادتین پھر اسلام کے دیگر احکامات:

یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو بھی اسلام میں داخل ہونے کے ارادے سے آتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف سے شہادتین کے اقرار کو قبول کر لیتے اور اس کے ساتھ ہی وہ مسلمانوں کی صف میں شامل ہو جاتا اور اس کا خون محفوظ ہو جاتا۔

جب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے اس شخص کو اس وقت قتل کر دیا تھا جب انھوں نے اس پر تلوار اٹھائی تھی

[1] صحیح البخاري، کتاب الإیمان، باب ﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾، رقم الحدیث: (25) ومسلم، کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا ....، رقم الحدیث: 36 (22)

اور ان کے بقول اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر ”لا إلٰہ إلا اللہ“ پڑھا تھا تو آپ ﷺ نے اِس پر نہایت شدید ردعمل ظاہر کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ کیا تھا تو آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ اہلِ یمن کو سب سے پہلے شہادتین کے اقرار کی طرف بلائیں، پھر اگر وہ ایسا کرلیں تو انھیں نماز کے متعلق اور پھر زکات کے متعلق آگاہ کریں۔[1]

اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام میں داخل ہو جائے تو اس کے بعد اسے نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔ نبی کریم ﷺ سے جو بھی اسلام کے متعلق سوال کرتا تو آپ سب سے پہلے شہادتین کے اقرار کا، پھر اسلام کے باقی ارکان کا ذکر کرتے، جیسا کہ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو فرمایا تھا جب انھوں نے اسلام کے بارے میں سوال کیا۔ اسی طرح جب ایک اعرابی جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس نے اسلام کے متعلق پوچھا تھا تو اسے بھی آپ ﷺ نے وہی جواب دیا جو آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیا تھا۔

شہادتین کا اقرار خون اور مال کو محفوظ کر دیتا ہے:

مذکورہ دلائل سے معلوم ہوا کہ صرف شہادتین کے اقرار کے ساتھ ہی اقرار کرنے والا مسلمان ہو جاتا اور اس کا خون اور مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب وہ اسلام میں داخل ہو جائے، پھر نماز قائم کرے اور زکات ادا کرے اور اسلام کے دیگر احکامات پر عمل کرے تو اس کے لیے وہی حقوق واجب ہو جاتے ہیں جو دیگر مسلمانوں کے لیے ہوتے ہیں اور وہی فرائض اس پر عائد ہو جاتے ہیں جو دیگر مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اور اگر وہ ارکانِ اسلام میں سے کسی ایک کو قبول نہ کرے اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں جو ایک مضبوط جماعت کی شکل اختیار کرلیں تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ درج بالا حدیث کی بنا پر کافر سے اس وقت تک قتال کرنا ضروری ہے جب تک وہ شہادتین کے اقرار کے ساتھ ساتھ نماز قائم نہ کرے اور زکات ادا نہ کرے۔ انھوں نے اِس حدیث کو اِس بات کی حجت بنایا ہے کہ کافروں کو اصول وفروع سب کی طرف دعوت دینا لازم ہے۔ لیکن یہ بات محلِ نظر ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا کافروں کے خلاف طریقۂ قتال اِس کے برعکس ہے۔

چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنگِ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر انھیں علَم (پرچم) تھمایا اور فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدعاء إلی الشھادتین، رقم الحدیث: 29 (19)

''آگے بڑھو اور اِدھر اُدھر التفات مت کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمھیں فتح نصیب کر دے۔''

چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کچھ آگے جا کر رکے اور بغیر التفات کیے اونچی آواز سے کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! میں لوگوں سے کس بات پر قتال کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان سے اس بات پر قتال کرو کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر جب وہ ایسا کر لیں تو ان کے خون اور ان کے مال تجھ سے محفوظ ہو جائیں گے، اِلا یہ کہ شہادتین کی رو سے کوئی حق باقی رہ جائے تو ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔''[1]

اِس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے صرف شہادتین کے اقرار کو جانوں اور مالوں کی حفاظت کرنے والا قرار دیا۔ ہاں، اگر شہادتین کا کوئی حق باقی رہ جائے تو اور بات ہے اور شہادتین کے حق سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص قبولِ اسلام کے بعد نماز اور زکات کی فرضیت کو تسلیم نہ کرے تو اس کے خلاف قتال کیا جا سکتا ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اِس حدیث کو سمجھا۔

احکامِ دین سے انکاری لوگوں کے خلاف قتال:

وہ لوگ جو نماز قائم کرنے اور زکات دینے سے انکار کر دیں تو ان کے خلاف جنگ کرنے کی دلیل خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ﴾ [التوبة: ٥]

''پھر اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکات دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ﴾ [الأنفال: ٣٩]

''اور ان سے جہاد کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ جب کسی قوم کے خلاف جنگ کا ارادہ کر لیتے تو ان پر حملہ نہ کرتے یہاں تک کہ صبح کا وقت ہو جاتا، پھر اگر اذان سن لیتے تو حملہ نہ کرتے ورنہ ان پر حملہ کر دیتے، کیونکہ اذان کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب، رقم الحدیث: 33 (2405)

اس کے علاوہ آپ ﷺ اپنے فوجی دستوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ ''اگر تم موذن کی آواز سن لو یا صرف مسجد کو دیکھ لو تو کسی کو قتل نہ کرنا۔''[1]

یہ سب اِس بات کے دلائل ہیں کہ آپ ﷺ اسلام میں داخل ہونے والوں کی حالت کا جائزہ لیتے تھے، اگر وہ نماز قائم کرتے اور زکات ادا کرتے تو ان کے خلاف جنگ نہ کرتے اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے خلاف جنگ کرنے سے باز نہ آتے۔

اِس کے بارے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے مابین مناظرہ بھی ہوا جیسا کہ صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ وفات پا گئے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا اور عرب لوگوں میں سے بعض نے کفر کا ارتکاب کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کیسے اِن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہے ہیں جبکہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ ''لا إله إلا الله'' کہیں، چنانچہ جس نے ''لا إله إلا الله'' کہا اس نے مجھ سے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا، مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکات کے درمیان فرق کرے گا، کیونکہ زکات مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر لوگ مجھے ایک رسی بھی دینے سے انکار کر دیں جو کہ وہ رسول اکرم ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں ضرور ان سے اس رسی کے انکار پر لڑائی کروں گا۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ سخت موقف اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا سینہ قتال کے لیے کھول دیا تھا، چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حق پر ہیں۔''[2]

ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا الگ الگ نظریہ:

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو موقف اختیار کیا وہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے فرمان: « إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ » سے لیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ شہادتین کا اقرار کرنے والے سے بھی جنگ کی جا سکتی ہے

[1] سنن أبو داود، كتاب الجهاد، باب في دعاء المشركين، رقم الحديث: (2635)

[2] صحيح البخاري، كتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، رقم الحديث: (7285) ومسلم، كتاب الإيمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا ....، رقم الحديث: 32 (20)

اگر وہ مال کا لازمی حق ادا نہ کرے۔ جب کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ صرف شہادتین کا اقرار کرنے سے اقرار کرنے والے کا خون محفوظ ہو جاتا ہے اور یہ انھوں نے اسی حدیث کے ابتدائی حصے میں جو عموم پایا جاتا ہے اس سے اخذ کیا۔ جیسا کہ کئی لوگوں کا یہ گمان ہے کہ جو آدمی شہادتین کا اقرار کر لے تو وہ قیامت کے روز جہنم میں داخل نہیں ہوگا، انھیں بھی احادیث میں وارد بعض الفاظ کے عموم سے یہ گمان ہوا، حالاں کہ حقیقت یوں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف سے رجوع کر کے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف اختیار کر لیا تھا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ''میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکات کے درمیان فرق کرے گا، کیونکہ زکات مال کا حق ہے۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص نماز کا انکار کر دے اس سے بھی قتال کیا جائے گا، کیونکہ نماز جسم کا حق ہے، جیسا کہ زکات مال کا حق ہے اور اس سے انکار کرنے پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انکار کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔

منکرِ نماز سے قتال کرنے کی دلیل:

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منکرِ نماز سے قتال کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں اجماعی مسئلہ تھا، اسی لیے انھوں نے زکات کو نماز پر قیاس کرتے ہوئے منکرین زکات کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا، حالانکہ یہ مسئلہ اس حدیث میں نہیں تھا جس کو عمر رضی اللہ عنہ نے دلیل بنایا تھا، تاہم ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو موقف اختیار کیا وہ انھوں نے «إِلَّا بِحَقِّهَا» کے الفاظ سے اخذ کیا تھا، کیونکہ زکات بھی کلمۂ شہادت کے حقوق میں سے ایک حق تھا، اسی طرح باقی حقوق کا معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ تارکِ نماز سے قتال کی ایک اور دلیل صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''تمھارے اوپر کچھ حکمران ایسے ہوں گے جن کے کچھ کام تمھیں اچھے لگیں گے اور کچھ برے، لہٰذا جو شخص ان کے برے کاموں کا انکار کرے گا تو وہ بری ہو جائے گا، اور جو انھیں ناپسند کرے گا تو محفوظ رہے گا اور جو ان پر راضی ہو کر ان کی اتباع کرے گا تو وہ نہیں بچ سکے گا۔''
>
> صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟
>
> تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں تب تک ان سے قتال نہ کرنا۔''[1]

[1] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب الإنكار على الأمراء، رقم الحديث: 62 (1854)

جو گروہ تمام ارکانِ اسلام کا منکر ہو اس سے قتال کرنا:

جو لوگ تمام ارکانِ اسلام کے منکر ہوں ان کا حکم بھی وہی ہے جو نماز اور زکات کے منکر کا ہے، یعنی ان سے قتال کرنا۔ ابن شہاب رحمہ اللہ نے حنظلہ بن علی بن اسقع سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تو انھیں حکم دیا کہ وہ لوگوں سے پانچ چیزوں پر قتال کریں۔ جو آدمی ان میں کسی ایک کا منکر ہو تو تم ان سے قتال کرنا جیسا کہ تم تمام پانچوں چیزوں کے منکر سے قتال کرتے ہو۔ اور وہ یہ ہیں: شہادتین کا اقرار، نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور حج بیت اللہ کرنا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے تھے:

"اگر لوگ حج کرنا چھوڑ دیں تو ہم ان سے اس پر قتال کریں گے جیسا کہ ہم نماز اور زکات پر ان سے قتال کرتے ہیں۔"

یہ ساری بحث اس گروہ کے بارے میں ہے جو درج بالا فرائض میں سے کسی ایک کا منکر ہو۔

منکرِ نماز سے جنگ کرنا یا اسے قتل کرنا:

اگر نماز کا انکار کرنے والا شخص ایک ہی ہو تو اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہی رائے امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوعبید رحمہم اللہ وغیرہ کی ہے۔ اس کی دلیل صحیحین میں مروی سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں، شاید وہ نماز پڑھتا ہو۔"

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: کتنے نمازی ہیں جو اپنی زبان سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

"مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دلوں کا سراغ لگاؤں اور نہ ہی یہ کہ میں ان کے پیٹ پھاڑوں۔"[1]

---

[1] صحیح البخاري، کتاب المغازي، باب بعث علي بن أبي طالب، رقم الحدیث (4351) ومسلم، کتاب الزکاة، باب ذکر الخوارج وصفاتهم، رقم الحدیث: 144 (1064)

منکرِ زکات:

رہا منکرِ زکات تو اس کو قتل کرنے کے بارے میں ان حضرات کے دو قول ہیں جو منکرِ نماز کو قتل کرنے کے قائل ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اسے بھی قتل کر دیا جائے۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی مشہور روایت ہے۔ ان کی دلیل سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہی حدیث ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اسے قتل نہ کیا جائے۔ یہی قول امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔

منکرِ صیام:

رہا روزہ تو اس کے بارے میں مالک رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق احمد رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ اسے بھی قتل کر دیا جائے۔ جبکہ شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں کہ اسے قتل نہ کیا جائے۔ اِس قول کی دلیل سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہی حدیث ہے، کیونکہ اس میں اور اس جیسی دیگر احادیث میں روزے کا ذکر نہیں ہے۔ اسی لیے ابو طالب کی روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ روزے کے بارے میں کوئی چیز وارد نہیں ہے۔

منکرِ حج:

منکرِ حج کو قتل کرنے کے بارے میں بھی امام احمد رحمہ اللہ کی دو روایتیں ہیں، جبکہ ہمارے بعض حنبلی ساتھیوں نے اسے قتل کرنے کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کے قول کو اس بات پر محمول کیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو فریضۂ حج کی ادائیگی کو موخر کرتے ہوئے یہ عزم رکھتا ہو کہ اس نے حج بالکل کرنا ہی نہیں ہے، یا اسے غالب گمان ہو کہ وہ اس سال مر جائے گا، پھر بھی وہ حج ادا نہ کرنے پر تلا ہوا ہو۔ باقی جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ حج کا فریضہ فوری طور پر ادا کرنا ضروری نہیں ہے، اس میں تاخیر بھی کی جا سکتی ہے جیسا کہ بہت سارے علماء کا موقف ہے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

«إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ» کا معنی:

ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِلَّا بِحَقِّهَا» ''مگر اس کے حق کے ساتھ'' جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ ''لا إله إلا الله'' کہیں۔ پھر جب وہ یہ کلمہ کہیں، ہماری نماز ادا کریں، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کریں، ہمارے طریقے

کے مطابق ذبح کریں تو ان کے خون اور مال ہمارے اوپر حرام ہو جاتے ہیں، مگر اس کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔''[1]

ایک روایت میں « إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ » کے الفاظ ہیں، تو اس کے بارے میں پہلے یہ گزر چکا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اِس حق میں نماز اور زکات کو داخل کیا تھا۔ اور بعض علماء اس میں روزہ اور حج کو بھی داخل کرتے ہیں۔ اسی طرح اس میں ان محرمات کا ارتکاب کرنا بھی شامل ہے جس کی بنا پر مسلمان کا خون بہانا جائز ہو جاتا ہے اور وہ درج ذیل حدیث میں مذکور ہیں:

صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَّا بِإِحْدٰى ثَلَاثٍ: اَلثَّيِّبُ الزَّانِيْ، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِيْنِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ »[2]

''کوئی مسلمان جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اس کا خون حلال نہیں۔ ہاں تین میں سے ایک شخص کو قتل کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں: شادی شدہ زانی، قاتل اور دین (اسلام) کو چھوڑنے اور جماعت سے الگ ہونے والا۔''

« وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ » کا معنی:

اس کا معنی یہ ہے کہ شہادتین کا اقرار، نماز قائم کرنا اور زکات ادا کرنا، یہ تینوں اعمال بندے کے خون اور اس کے مال کو دنیا میں محفوظ کر دیتے ہیں، الا یہ کہ وہ ایسے گناہ کا ارتکاب کرے جس سے اس کا خون بہانا جائز ہو جائے، اِس صورت میں دنیا میں تو اس کو قتل کر دیا جائے گا تاہم آخرت میں اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔ اگر وہ سچا مومن ہے تو اسے اللہ تعالیٰ اس کے ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل کر دے گا اور اگر وہ جھوٹا ہے تو وہ منافقوں کے ٹولے کے ساتھ جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴾

[الغاشية: ٢١ـ ٢٦]

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الصلاة، باب استقبال القبلة، رقم الحدیث: (392)

[2] صحیح البخاري، کتاب الدیات، باب قول الله تعالیٰ: ﴿أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾، رقم الحدیث: (6878)، ومسلم، کتاب القسامة، باب ما یباح به دم المسلم، رقم الحدیث: 25 (1676)

''لہٰذا آپ وعظ ونصیحت کرتے رہیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ لوگوں پر داروغہ نہیں ہیں۔ تاہم جو شخص منہ پھیرے گا اور کفر کرے گا تو اللہ اسے سب سے بڑا عذاب دے گا۔ یقیناً انھیں ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔ پھر ہمیں ہی ان کا حساب لینا ہے۔''

آپ کا کام صرف لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنا اور انھیں اللہ کی طرف دعوت دینا ہی ہے۔ آپ کو ان پر مسلط نہیں کیا گیا کہ آپ ان کے دلوں میں زبردستی ایمان داخل کریں اور نہ ہی آپ اس کے مکلّف ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی ہے کہ تمام بندوں کو اسی کی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ان کا حساب اسی کے سپرد ہے۔

زندیق کی توبہ کی قبولیت:

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اسی حدیث سے ان اہلِ علم نے دلیل لی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ زندیق یعنی منافق اگر اسلام کی طرف واپس آجائے اور توبہ کر لے تو اس کی توبہ قابلِ قبول ہے۔ محض اس کے نفاق کی بنا پر اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منافقوں سے معاملہ کرتے تھے اور ان پر مسلمانوں کے احکام ظاہری طور پر جاری کرتے تھے، حالانکہ آپ کو ان میں سے بعض لوگوں کے بارے میں معلوم تھا کہ یہ باطنی طور پر منافق ہیں۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے اور اسے خطابی رحمہ اللہ نے اکثر علماء سے نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم

فوائدِ حدیث:

1. مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ہر اس شخص سے قتال کریں جو اللہ کی دعوت اور اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے سے منع کرے، چاہے وہ مشرکوں میں سے ہو یا اہلِ کتاب میں سے یا کوئی اور ہو۔
2. جو شخص ''لا إله إلا الله'' اخلاص کے ساتھ پڑھ لے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرے تو وہ محفوظ ہو گیا۔
3. جو آدمی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں سے کسی حق کے بارے میں تفریط کا شکار ہو تو اس سے قتال کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس حق کو ادا کر دے یا وہ ہلاک ہو جائے۔
4. مسلمانوں اور ان کے ذمہ دارانِ حکومت کی ظاہری حالت پر حکم لگایا جائے گا اور جہاں تک ان کی باطنی حالت کا تعلق ہے تو وہ اللہ کے سپرد ہے۔
5. ارکانِ اسلام میں سب سے پہلا اور سب سے اہم رکن شہادتین کا اقرار ہے۔

سوالات:

1 اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ﴾ کی تشریح کریں، نیز اس کا حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو تعلق ہے اس کی وضاحت کریں۔

2 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کے معانی کی وضاحت کریں: «عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ»

3 حدیث میں «النَّاسَ» سے کیا مراد ہے؟

4 درج ذیل عبارت کس کی ہے: "کیف تقاتل الناس؟" آپ کیسے اِن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہے ہیں؟ ...... اور یہ الفاظ کس کو کہے گئے تھے؟ اور کس موقع پر کہے گئے تھے؟ اور اس میں استفہام کا مقصد کیا ہے؟

5 عقل ونقل اور اجماع، ان تمام دلائل سے زکات کی فرضیت ثابت ہے۔ اِس کی وضاحت کریں۔

6 اختلافِ رائے سے دلی محبت متاثر نہیں ہوتی۔ اِس کی وضاحت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والے مناظرے کی روشنی میں کریں۔

7 قرآن وحدیث کی بہت ساری نصوص میں زکات نماز کے ساتھ ذکر کی گئی ہے، یہ کس بات کی دلیل ہے؟



زیادہ سوالات کرنے کی ممانعت

9 سیدنا ابو ہریرہ عبد الرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

« مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ، كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ، وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ »[1]

''میں تمھیں جس چیز سے منع کروں اس سے بچو اور جس چیز کا حکم دوں اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے زیادہ سوالات اور اپنے انبیاء سے اختلاف نے ہی ہلاک کیا تھا۔''

یہی حدیث صحیحین کی ایک اور روایت کے مطابق درج ذیل الفاظ کے ساتھ ہے:

« دَعُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[2]

''تم مجھے چھوڑ دو جب تک میں تمھیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے سوالات اور اپنے انبیاء سے اختلاف نے ہی ہلاک کیا تھا، لہٰذا جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے بچو اور جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو۔''

ایک روایت میں اِس حدیث کا سببِ ورود بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ روایت یوں ہے:

محمد بن زیاد رحمہ اللہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب توقيره ﷺ، رقم الحديث: 130 (1337)

[2] صحيح البخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، رقم الحديث (7288) ومسلم، كتاب الفضائل، باب توقيره ﷺ، رقم الحديث: 131 (1337) واللفظ للبخاري

«أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوْا»

''اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا تم حج کرو۔''

یہ سن کر ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال حج فرض ہے؟

آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کی، حتی کہ اس نے تین مرتبہ یہی سوال کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ»

''اگر میں ہاں کہتا تو ہر سال حج واجب ہو جاتا اور ایسا ہو جاتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔''

اِس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«ذَرُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوْهُ»[1]

''تم مجھے چھوڑ دو جب تک میں تمھیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے زیادہ سوالات اور اپنے انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے۔ لہٰذا جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو اور جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کروں تو اسے چھوڑ دو۔''

راوئ حدیث:

سیدنا عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی الیمانی، مشہور اور قابلِ قدر صحابی ہیں۔ مدینہ میں اس وقت پہنچے جب رسول اکرم ﷺ خیبر میں تھے۔ چنانچہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے اور اس کے بعد مستقل طور پر آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ حدیثِ نبوی کو حفظ اور روایت کرنے والے صحابی تھے۔ موصوف اسلام قبول کرنے کے بعد زیادہ تر مدینہ منورہ میں ہی رہے اور بعض مرتبہ (رسول اکرم ﷺ کی غیر موجودگی میں) اس کے امیر بھی بنے۔ اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور انھیں بقیع میں دفن کیا گیا۔ ان کے سنہ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ راجح یہ ہے کہ آپ ۵۹ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ ہیں۔

دلالتِ حدیث:

رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان اِس بات کی دلیل ہے کہ غیر ضروری سوال کرنا ممنوع ہے، خصوصاً وہ سوال جس کا جواب خود سائل کے لیے تکلیف دہ ہو۔ اسی طرح ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر یا محض مذاق اڑانے کی خاطر سوال کرنا بھی ممنوع ہے، جیسا کہ بہت سارے منافق وغیرہ اِس قسم کے سوالات کیا کرتے تھے۔ اسی کے قریب وہ سوال بھی ہے جو کسی ایسی چیز کے بارے میں ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مخفی رکھا ہے اور انھیں اس کی اطلاع نہیں دی، مثلاً: قیامت کے وقت اور روح کے متعلق سوال کرنا۔

اسی طرح یہ حدیث اِس بات کی بھی دلیل ہے کہ حلال وحرام کے متعلق زیادہ سوالات کرنا کہ جس کی وجہ سے کسی معاملے میں اور زیادہ سخت حکم نازل ہونے کا اندیشہ ہو، بھی حرام ہے، جیسا کہ حج کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ اور جب نبی اکرم ﷺ سے لعان کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اسے ناپسند کیا، پھر خود سائل کے گھر میں وہی واقعہ پیش آگیا جس کے بارے میں وہ اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی سوالات کر رہا تھا۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رسول اکرم ﷺ کے ادب کو ملحوظ رکھنا:

نبی کریم ﷺ قیل وقال، کثرتِ سوال اور ضیاعِ اموال سے منع کیا کرتے تھے۔[2]

آپ ﷺ سوال کرنے کی اجازت صرف دیہاتیوں اور باہر سے آنے والے وفود کو دیا کرتے تھے، جس سے آپ کا مقصد ان کی تالیفِ قلب کرنا ہوتا تھا۔ رہے مہاجرین وانصار اور مدینہ میں مقیم وہ حضرات جن کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا تو انھیں سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مدینہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سال مقیم رہا، مجھے ہجرت سے صرف اس چیز نے روکے رکھا کہ میں آپ ﷺ سے سوالات کر سکتا تھا، کیونکہ ہم میں سے کوئی شخص جب ہجرت کرتا تو وہ نبی کریم ﷺ سے کسی قسم کا سوال نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اِسی دوران آپ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

① صحیح مسلم، کتاب اللعان، رقم الحدیث: 10 (1495)

② صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب ما ینھی عن إضاعة المال، رقم الحدیث (408) ومسلم، کتاب الأقضیة، باب النھی عن کثرة المسائل من غیر حاجة، رقم الحدیث: 12 (593)

«اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ»[1]

''نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ چیز ہے جس کا تجھے کھٹکا رہے اور تو اِس بات کو ناپسند کرے کہ لوگوں کو اس کا پتا چل جائے۔''

اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا انس ﷺ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، اِس لیے ہمیں یہ اچھا لگتا تھا کہ دیہات والوں میں سے کوئی سمجھدار آدمی آئے اور وہ آپ ﷺ سے سوال کرے اور ہم سن رہے ہوں۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: ''تم مجھے چھوڑ دو جب تک میں تمھیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے زیادہ سوالات اور اپنے انبیاء سے اختلاف ہی نے ہلاک کیا۔'' اِس بات کی دلیل ہے کہ سوال کرنا ناپسندیدہ اور مذموم عمل ہے۔

مسلمان کا فرض:

بعض اوقات نبی کریم ﷺ سے جب کوئی سوال کیا جاتا تو آپ ﷺ سائل کو قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتے، جیسا کہ سیدنا عمر ﷺ نے کلالہ کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ فرمایا:

''تمھیں سورۃ النساء کی آخری آیت ہی کافی ہے۔''[3]

یاد رہے کہ ''کلالہ'' اس شخص کو کہتے ہیں جس کی نہ اولاد ہو اور نہ اس کا باپ زندہ ہو۔

رسول اکرم ﷺ نے اِس حدیث میں اشارہ کیا ہے کہ آپ کے احکامات پر عمل کرنے اور منہیات سے پرہیز کرنے میں ہی مشغول رہنا چاہیے، اِس طرح بندہ بے جا سوالات کرنے سے بچ جاتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ فرمایا:

''جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے بچو اور جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو۔''

لہٰذا مسلمان پر جس چیز کا اہتمام کرنا لازم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین وارشادات کی تلاش میں رہے، انھیں سمجھنے اور ان کے معانی ومفاہیم پر مطلع ہونے کی کوشش کرے۔ اگر ان

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تفسیر البر والإثم، رقم الحدیث: 15 (2553)

[2] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب السؤال عن أرکان الإسلام، رقم الحدیث: 10 (12)

[3] صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب میراث الکلالة، رقم الحدیث: 9 (1617)

کا تعلق علمی امور سے ہو تو ان کی تصدیق کرے اور اگر ان کا تعلق عملی امور سے ہو تو حتی الامکان ان پر عمل کرنے کی سعی کرے۔ احکامات کو عملی جامہ پہنائے اور منہیات سے اجتناب کرے اور وہ اپنی تمام تر توانائیاں اسی چیز میں صرف کرے۔

یہی حال تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اور اچھے طریقے سے ان کی پیروی کرنے والوں کا، یہ تمام حضرات کتاب وسنت سے علم نافع کے حصول کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

رہا وہ شخص جو اوامر ونواہی کا سماع صرف اس لیے کرے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق ایسے امور کو فرض کر لے جو کبھی واقع ہو سکتے ہیں اور کبھی واقع نہیں ہو سکتے تو وہ اِس حدیث کی نہی میں شامل ہے، کیونکہ وہ شخص اللہ کے احکامات کی اتباع کرنے میں پوری طرح سنجیدہ نہیں ہوتا۔

کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے ہی اس کے متعلق سوال کرنا:

ایک آدمی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حجرِ اسود کے استلام کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا استلام کرتے اور اس کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس آدمی نے کہا: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں حجرِ اسود کی طرف بڑھوں اور دیگر لوگ میرے اوپر غالب آجائیں؟ آپ کا کیا خیال ہے اگر شدید ازدحام کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکوں!! تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ ''آپ کا کیا خیال ہے؟'' تو اِس کو تم یمن میں چھوڑ آؤ، کیونکہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ نے اس کا استلام بھی کیا اور اس کا بوسہ بھی لیا۔''[1]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مقصد یہ ہے کہ تمھیں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کی فکر ہونی چاہیے، نہ یہ کہ تم کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے ہی مفروضے بناتے رہو کہ اگر تم عاجز آ جاؤ یا وہ تمھارے لیے مشکل ہو جائے تو پھر کیا ہوگا! کیونکہ ایسا کرنے سے اتباع کرنے کا جو پختہ عزم ہوتا ہے وہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ دین کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور علم دین کے متعلق سوال کرنا تبھی قابلِ تعریف ہے جب عمل کرنے کی نیت سے ہو، نہ کہ جھگڑا اور جدال کرنے کی نیت سے۔

اسی لیے بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کسی کام کے واقع ہونے سے پہلے اس کے متعلق سوال کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور اگر ان سے ان کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ جواب ہی نہیں دیتے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الحج، باب تقبيل الحجر، رقم الحديث: (1611)

اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے جب کسی کام کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ کہتے تھے: کیا ایسے ہو گیا ہے؟ اگر انھیں کہا جاتا کہ نہیں، تو وہ کہتے: اسے چھوڑ دو جب تک وہ واقع نہ ہو جائے۔

اور ہیثم بن جمیل کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے کہا: ابو عبداللہ! ایک شخص سننِ نبویہ کا عالم ہو تو کیا وہ ان کے بارے میں جدال کر سکتا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں، وہ صرف ان کے متعلق آگاہ کر سکتا ہے، اگر اس سے ان سنتوں کو قبول کر لیا جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے خاموش ہو جانا چاہیے۔

اور میمونی کہتے ہیں کہ انھوں نے امام احمد رحمہ اللہ سے سنا کہ ان سے ایک مسئلے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: کیا یہ مسئلہ واقع ہو چکا ہے یا ابھی تمھارا اس سے پالا نہیں پڑا؟

فرضی مسائل میں لوگوں کی اقسام:

اِس بارے میں لوگوں کی کئی اقسام ہیں:

- اہل الحدیث کے پیروکاروں میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے مسائل کا دروازہ بالکل ہی بند کر دیا جس کے نتیجے میں وہ دین کو کم ہی سمجھ سکے اور ان کے ہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کا علم نہایت ہی محدود رہا۔ انھوں نے احادیث کو دوسروں کے لیے روایت تو کیا لیکن وہ خود انھیں سمجھنے سے قاصر رہے۔
- اہل الرائے کے فقہاء میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے مسائل کے پیش آنے سے قبل ہی انھیں از خود پیدا اور فرض کرنے میں بہت زیادہ وسعت سے کام لیا، ان میں سے بعض پیش آ گئے اور بعض پیش ہی نہیں آئے۔ پھر انھوں نے از خود فرض کیے ہوئے مسائل کا حل نکالنے میں بھی خوب تکلف سے کام لیا، ان کے مابین بحث و تکرار اور جدال تک نوبت پہنچ گئی اور دلوں میں کدورتوں، نفرتوں اور بغض اور دشمنی کے جذبات بھر گئے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے اور نیچا دکھانے کی کوششیں شروع ہو گئیں اور لوگوں کے سامنے فخر و غرور کا مظاہرہ کیا گیا اور ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی سعیِ مذموم کی گئی۔ اِس طریقہ کار کی ربانی علماء نے مذمت کی ہے اور احادیثِ نبویہ میں بھی اسے معیوب بلکہ حرام قرار دیا گیا ہے۔
- اہل الحدیث کے وہ فقہاء جو حدیث پر عمل کرنے والے ہیں، انھیں سب سے زیادہ اِس بات کی فکر لاحق ہوتی ہے کہ وہ کتاب اللہ کے معانی اور اس کی تفسیر پر مشتمل صحیح احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

وتابعین رحمہم اللہ کے آثار کو تلاش کریں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے صحیح اور ضعیف کو پہچانیں، پھر صحیح احادیث جن مسائل پر مشتمل ہوں انھیں سمجھیں اور اچھی طرح انھیں ذہن نشین کریں۔ اسی طرح تفسیر وحدیث، مسائلِ حلال وحرام اور سنت، زہد اور رقائق وغیرہ جیسے مختلف علوم کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کے کلام سے بھی استفادہ کریں۔ یہی طریقہ امام احمد رحمہ اللہ اور ان جیسے دیگر ربانی علمائے کرام کا ہے۔

جو شخص بھی طلبِ علم کے اِس طریقۂ کار کو اختیار کرتا ہے وہ پیش آمدہ تمام مسائل کا حل ڈھونڈ لیتا ہے، کیونکہ اکثر وبیشتر مسائل کے اصول مذکورہ بالا طریقۂ کار میں مل جاتے ہیں۔

واقعات کی کثرت کا سبب اور اس کا حل:

ہم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اِس حدیث کی تشریح کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص ان مسائل میں زیادہ مشغول نہیں رہتا جس کے نظائر کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں ملتے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے کلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو سمجھنے میں ہی اپنی ہمت صرف کرتا ہے اور اس کے ذریعے وہ اوامر پر عمل کرنا اور نواہی سے بچنا چاہتا ہے تو وہ یقیناً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر عمل پیرا ہوتا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے جو اِس حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اور جو آدمی اس دین کو سمجھنے کا اہتمام نہیں کرتا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا اور ان فرضی مسائل کو پیدا کرنے میں لگا رہا جو واقع ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے اور محض اپنی رائے پر مبنی ان کے جوابات کا تکلف کرتا رہا تو اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ اِس حدیث کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور اس میں جو نہی وارد ہوئی ہے وہ اس کا ارتکاب کر رہا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ترک کر رہا ہے۔

یہ جان لیجیے کہ جن واقعات ومسائل کا کتاب وسنت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے ان میں سے اکثر وبیشتر اس لیے پیش آتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا اور نہ ان کے نواہی سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ وہ شخص جو کوئی بھی عمل کرنا چاہتا ہو، اگر وہ اس کے متعلق پہلے یہ معلوم کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کیا حکم دیا ہے، پھر وہ اس پر عمل کرے اور اس کے بارے میں اس نے کس چیز سے منع کیا ہے، پھر وہ اس سے پرہیز کرے تو تمام واقعات ومسائل کتاب وسنت کے مطابق ہی پیش آئیں۔ لیکن [illegible] اس عمل کر [illegible] شخص اپنی رائے اور خواہش کے مطابق ہی عمل کرتا ہے تو عموماً [illegible]

ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ایسے واقعات ومسائل کو کتاب وسنت میں ثابت شدہ احکامات کی طرف لوٹانا مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ ان سے بہت دور ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے اس حکم پر عمل کرتا اور اس نہی سے اجتناب کرتا ہے جس کا ذکر اِس حدیث میں آیا ہے اور باقی تمام چیزوں کو چھوڑ کر اسی میں اپنے آپ کو مشغول رکھتا ہے تو اسے دنیا وآخرت میں نجات نصیب ہونے والی ہے۔ اور جو آدمی اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان نظریات وخیالات میں مشغول رہتا ہے جنھیں وہ اچھا تصور کرتا ہے تو وہ اس محذور میں واقع ہو جاتا ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے اِس حدیث میں ڈرایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب اپنے زیادہ سوالات اور انبیاء سے اپنے اختلاف کے پیشِ نظر، نیز رسولوں کے لیے اپنی عدمِ اطاعت کے نتیجے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

فرمانِ نبوی: «فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ» کا مفہوم:

''لہٰذا میں جب کسی چیز سے منع کروں تو اس سے بچو اور جب کسی کام کا حکم دوں تو حسبِ استطاعت اس پر عمل کرو۔''

بعض علماء نے اِس سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ نہی امر سے زیادہ سخت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے منہیات میں سے کسی کے ارتکاب کی رخصت نہیں دی، جبکہ امر پر عمل درآمد کو استطاعت سے مشروط کر دیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ارتکابِ نواہی فعلِ اوامر سے زیادہ شدید ہے۔ یہ بات امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ اور امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''عبادت کرنے والوں کی سب سے افضل عبادت یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں منع کیا ہو۔''

ترکِ محرمات فعلِ طاعات پر مقدم ہے:

معلوم یوں ہوتا ہے کہ ترکِ محرمات کو فعلِ طاعات سے افضل قرار دینے کے بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے اس میں طاعات سے مراد نفلی عبادات ہیں۔ ورنہ وہ عبادات جو فرض یا واجب کا درجہ رکھتی ہیں وہ یقیناً ترکِ محرمات سے افضل ہیں، کیونکہ اعمال کو بجا لانا ہی اصل مقصد ہے اور جہاں تک محرمات کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں شرعاً یہ مطلوب ہے کہ ان کا وجود ہی نہ ہو، اسی لیے ان میں نیت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، جبکہ اعمال کو بجا لانے میں نیت ضروری ہوتی ہے۔ اسی لیے بعض اعمال کا چھوڑنا کفر بن جاتا

ہے، مثلاً: توحید کو چھوڑنا یا ارکانِ اسلام میں سے کسی ایک کو ترک کرنا، جیسا کہ پہلے (حدیث نمبر 3 میں) بھی گزر چکا ہے، اس کے برخلاف منہیات کا ارتکاب بذاتہ کفر کا تقاضا نہیں کرتا۔

ابن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ایک ایسا درہم جس میں شبہہ پایا جاتا ہوا سے میں واپس کر دوں تو یہ مجھے زیادہ محبوب ہے ایک لاکھ، دو لاکھ.......... سات لاکھ دراہم کا صدقہ کرنے سے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہتے ہیں: تقویٰ رات کے قیام اور دن کے روزے کا نام نہیں، بلکہ تقویٰ اس چیز کا نام ہے کہ اللہ کے فرائض کو ادا اور اس کی محرمات کو ترک کیا جائے۔ اِس کے ساتھ اگر کوئی اور عملِ خیر بھی ہو تو یہ ایک خیر کے ساتھ دوسری خیر ہے۔

سلف صالحین کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ محرمات چاہے کم کیوں نہ ہوں ان کے ارتکاب سے بچنا نفلی عبادات میں کثرت سے افضل ہے، کیونکہ ارتکابِ محرمات سے پرہیز کرنا فرض ہے جبکہ نفلی عبادات میں کثرت ایک نفلی چیز ہے۔

تاہم بعض متاخرین کا کہنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد:

«فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

اس لیے فرمایا کہ اوامر کی اتباع بغیر عمل کے ممکن نہیں اور عمل کے لیے کچھ شروط اور اسباب ہوتے ہیں جن کے بغیر وہ مکمل نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض شروط واسباب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی استطاعت نہیں ہوتی، چنانچہ اوامر پر عمل درآمد کو استطاعت سے مشروط کر دیا گیا۔ اللہ رب العزت نے بھی تقویٰ کو استطاعت کے ساتھ مشروط کیا ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦]

''چنانچہ جہاں تک تمھاری استطاعت ہو تم اللہ سے ڈرو۔''

اسی طرح حج کو بھی صاحبِ استطاعت پر فرض کیا:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ [آل عمران: ٩٧]

''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج، جو لوگ اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں، فرض کیا ہے۔''

جہاں تک نواہی کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں اصلاً مطلوب یہ ہے کہ ان کا وجود ہی نہ ہو، لہٰذا

انھیں ان کی اصلی حالت (عدمِ وجود) پر باقی رکھنا چاہیے اور اِس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی استطاعت نہ ہو۔

خلاصہ تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اعمال میں سے کسی ایسے عمل کا مکلف نہیں بناتا جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں، اسی لیے اس نے ان پر ترس کھاتے ہوئے کئی اعمال کو ان سے اس لیے ساقط کر دیا کہ ان میں مشقت پائی جاتی تھی۔ رہ گئیں منہیات تو محض شہوات واسباب کی قوت کی بنا پر ان کا ارتکاب کرنے سے اللہ تعالیٰ کسی کا عذر قبول نہیں کرتا، بلکہ اس نے انھیں پابند کیا ہے کہ وہ ہر حال میں ان سے اپنا دامن بچائیں۔ البتہ اس نے ضرورت کی بنا پر صرف زندہ رہنے کے لیے بعض حرام چیزوں کا کھانا مباح کیا ہے، نہ کہ لذت وشہوت کے حصول کے لیے۔ اسی سے امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کی صحت کا یقین ہو جاتا ہے کہ نہی، امر سے زیادہ سخت ہے۔

جس امر پر مکمل طور پر عمل نہ ہوسکتا ہو اسے بالکل ہی ترک کرنا درست نہیں ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ:

«وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

اِس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص کسی امر پر مکمل طور پر عمل کرنے سے تو عاجز ہو، لیکن کسی حد تک اس پر عمل کرسکتا ہو تو اسے حسبِ امکان اس پر عمل ضرور کرنا چاہیے۔ اور یہ چند مسائل میں بالکل واضح ہے۔ مثلاً: طہارت میں ایک انسان کچھ اعضاء کو دھوسکتا ہو اور باقی اعضاء کو پانی نہ ہونے یا بعض اعضاء کے بیمار ہونے کی بنا پر دھونے سے عاجز ہو تو وہ حسبِ طاقت اعضاء کو دھو لے گا اور باقی اعضاء کا تیمم کر لے گا۔ اِس میں وضو اور غسل دونوں برابر ہیں جیسا کہ مشہور مسئلہ ہے۔

اسی طرح نماز میں اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے عاجز ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے، اگر اس سے بھی عاجز ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''نماز کھڑے ہو کر پڑھا کرو، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو پر لیٹے لیٹے ہی پڑھ لیا کرو۔''[1]

[1] صحيح البخاري، كتاب تقصير الصلاة، باب إذا لم يطق قاعدا صلى على جنب، رقم الحديث: (1117)

اور اگر وہ لیٹے ہوئے بھی نماز نہ پڑھ سکے تو نیت کر کے صرف اشارے کے ساتھ ہی پڑھ لے، اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی، جیسا کہ مشہور مسئلہ ہے۔

اسی طرح زکات الفطر میں اگر کوئی شخص ایک مکمل صاع دینے کی طاقت نہ رکھتا ہوتو وہ اتنا ہی دے دے جس پر قدرت رکھتا ہو۔ صحیح مسلک کے مطابق یہ اس پر لازم ہے۔ تاہم جو آدمی پورے دن کا روزہ نہ رکھ سکتا ہو، بلکہ اس کے کچھ حصہ میں روزہ رکھ سکتا ہوتو اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اتنے ہی حصے کا روزہ رکھے، کیونکہ دن کے کچھ حصے کا روزہ رکھنا اصلاً عبادت ہی نہیں ہے۔

اسی طرح کفارہ میں اگر ایک شخص پورا غلام آزاد کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہوتو اس پر بھی یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ غلام ہی آزاد کرے، کیونکہ آزادی کو حصوں میں تقسیم کرنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر استطاعت ہوتو پورا غلام ہی آزاد کرنا چاہیے۔

فوائدِ حدیث:

1. اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح رسول اکرم ﷺ کی اطاعت بھی واجب ہے۔
2. سنتِ نبویہ قرآن مجید کا تکملہ ہے اور یہ دونوں شریعت کے اصلی مصدر ومنبع ہیں۔
3. اسلام ان امور میں بحث کرنے سے منع کرتا ہے جو واقع ہی نہیں ہوئے اور جن پر عمل کا انحصار نہیں ہوتا۔
4. مسلمان کو اوامر پر عمل کرنے اور نواہی سے اجتناب کرنے میں ہی جدو جہد کرنی چاہیے۔
5. جس امر پر مکمل طور پر عمل نہ ہو سکتا ہو اسے بالکل ہی ترک کرنا درست نہیں ہے۔
6. جو شخص میسر وآسان کام کرلے تو اس سے مشکل کام ساقط ہو جاتا ہے۔
7. علم ہی عمل کا راستہ ہے۔

سوالات:

1. اِس حدیث کا سببِ ورود ذکر کریں۔
2. مسلمان کو کس بات کا اہتمام کرنا چاہیے؟
3. زیادہ سوال کرنے سے نبی کریم ﷺ سے منع کیا، اِس سلسلے میں لوگوں کی کئی اقسام ہیں، انھیں ذکر کریں۔

4 لوگ ان واقعات میں کب مبتلا ہوتے ہیں جن کی کتاب وسنت میں کوئی اصل ہی نہیں ہوتی ؟

5 اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان کی طاقت کے مطابق اوامر پر عمل کرنے کا پابند کیا ہے، اِس کی وضاحت دلائل کے ساتھ کریں۔

6 اطاعت میں کیا افضل ہے، ترکِ محرمات یا فعلِ طاعات؟ وضاحت کیجیے۔



دعا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے

10 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ وَلَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ أَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ، فَقَالَ تَعَالَىٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ [المؤمنون: ٥١] وَقَالَ تَعَالَىٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧٢] ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ: يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِّيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟»[1]

''اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک چیز کو قبول کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی وہی حکم دیا ہے جو کہ رسولوں کو دیا ہے۔ چنانچہ اس کا فرمان ہے:

''اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرتے رہو، تم جو کچھ بھی کرتے ہو میں یقیناً اس کو خوب جانتا ہوں۔''

اسی طرح فرمایا:

''اے ایمان والو! ہم نے تمھیں جو پاکیزہ چیزیں عطا کیں ان میں سے کھاؤ اور اگر تم اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر بھی ادا کیا کرو۔''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کر کے پراگندہ اور غبار آلود حالت میں آسمان کی طرف ہاتھوں کو بلند کر کے دعا کرتا ہے: اے میرے رب! اے میرے رب! حالانکہ اس کا کھانا، اس کا پینا اور اس کا لباس حرام کمائی سے ہوتا ہے اور اس کے جسم کی پرورش حرام رزق سے ہوئی ہوتی ہے تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے!''

[1] صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب، رقم الحديث: 65 (1015)

« إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ » کا معنی:

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام نقائص وعیوب سے پاک ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۖ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ [النور: ٢٦]

''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے، اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، یہ (پاکیزہ) لوگ ان باتوں سے بَری ہیں جو وہ (خبیث لوگ ان کی بابت) کہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت اچھا رزق ہے۔''

اِس آیتِ کریمہ میں ''طیبات'' اور ''طیبون'' سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ بے حیائی کی میل وغیرہ سے پاک ہیں۔

اور آپ ﷺ کے اس ارشاد « لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا » کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقات میں سے صرف وہ قبول کرتا ہے جو پاک اور حلال ہو۔ اسی معنی میں آپ ﷺ کا ایک اور ارشاد یوں ہے:

« مَا تَصَدَّقَ أَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ إِلَّا أَخَذَهَا الرَّحْمٰنُ بِيَمِينِهِ وَإِنْ كَانَتْ تَمْرَةً .... »[1]

''کوئی شخص پاکیزہ مال سے کوئی صدقہ نہیں کرتا اور اللہ تعالی پاکیزہ مال ہی قبول فرماتا ہے مگر وہ رحمان اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے، چاہے وہ کھجور کا ایک دانہ ہو۔''

اموال، اعمال اور اقوال سب میں طیب ہی قابلِ قبول ہے:

بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث جس پر ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں اس میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد: « لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا » عام ہے اور اس کا مفہوم کئی چیزوں کو شامل ہے۔ چنانچہ اعمال میں سے صرف وہ عمل قابلِ قبول ہے جو اسے فاسد کرنے والے تمام امور، مثلاً: ریاکاری اور من پسندی وغیرہ سے پاک ہو۔ اموال میں سے بس وہ مال قابلِ قبول ہے جو پاک اور حلال ہو۔ اسی طرح اقوال اور اعتقادات میں

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب، رقم الحدیث: 63 (1014)

بھی طیب، یعنی پاک قول اور پاک عقیدہ ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول کیا جاتا ہے۔ گویا ان تمام امور میں طیب بھی ہوتا ہے اور خبیث بھی۔ پہلا قابلِ قبول اور دوسرا نا قابلِ قبول۔

مومن پورے کا پورا پاک ہوتا ہے۔ اس کا دل بھی، زبان بھی اور جسم بھی۔ دل ایمان کا مسکن ہوتا ہے، زبان پر ذکرِ الٰہی ہوتا ہے اور دیگر جسمانی اعضاء کے ذریعے اعمالِ صالحہ سرانجام پاتے ہیں جو کہ ایمان ہی کا ثمرہ ہوتے اور اس میں شامل ہوتے ہیں۔

اِس حدیث میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی عمل اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا اور نہ ہی وہ پاک ہوتا ہے جب تک عمل کرنے والے کا کھانا، پینا اور پہننا حلال نہ ہو۔ اور حرام کھانا، پینا اور لباس پہننا عمل کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ ''اللہ تعالیٰ طیب (پاکیزہ) کو ہی قبول کرتا ہے۔'' دو آیاتِ کریمہ کا ذکر فرمایا، جن میں اللہ تعالیٰ نے رسولوں اور ان کی امتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ پاکیزہ، یعنی حلال چیزیں ہی کھائیں۔ نیز عملِ صالح کریں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کھانا حلال ہوگا تب تک عمل بھی صالح اور مقبول ہوگا۔ اور اگر کھانا حلال نہ ہو تو عمل کیسے مقبول ہو سکتا ہے؟! اس کے بعد آپ ﷺ نے بطورِ مثال دعا کا ذکر فرمایا اور اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ حرام کے ساتھ کیسے قبول ہو سکتی ہے! یہ دلیل ہے اس بات کی کہ حرام کے ساتھ پرورش ہو تو کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں ہوتا۔

قبولیتِ عمل سے کیا مراد ہے؟:

اِس بارے میں علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ جو شخص حرام مال کے ساتھ حج کرے یا حرام لباس میں نماز پڑھے تو کیا اس کا فریضۂ حج اور فریضۂ نماز ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اِس کے متعلق امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایات مروی ہیں۔

مذکورہ احادیث اسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حرام کے ساتھ کوئی عمل قبول نہیں کیا جاتا، تاہم قبولیت سے مراد بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل پر راضی ہوگیا، پھر وہ اسی بنا پر عمل کرنے والے کی فرشتوں کے سامنے مدح وثنا بھی کرتا ہے اور فخر بھی۔ اور بعض اوقات اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے کو اس پر اجر وثواب ملتا ہے۔ اور بعض اوقات اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذمے جو فرض تھا وہ ادا ہوگیا۔

لہٰذا اگر یہاں قبولیت کا پہلا یا دوسرا معنی مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کا فریضہ حج یا فریضہ نماز تو ادا ہوگیا، تاہم اسے اس پر نہ اجر وثواب ملے گا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اس کے عمل سے راضی ہو کر اس کی مدح وثنا کرے گا۔

اسی معنی میں کئی احادیث وارد ہیں۔

مثلاً: آقا سے بھاگے ہوئے غلام کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ [1]

اسی طرح وہ بیوی جس سے اس کا خاوند ناراض ہو، اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ شخص جو کسی نجومی کے پاس جائے اور وہ جو شراب نوشی کرے، تو ان دونوں کی چالیس دن تک نمازیں قبول نہیں کی جاتیں۔ ان تمام احادیث میں عدمِ قبولیت سے مراد قبولیت کا پہلا اور دوسرا معنی ہے۔ واللہ اعلم

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴾ [المائدة: ٢٧] ''اللہ صرف پرہیزگاروں سے قبول کرتا ہے۔'' میں بھی یہی معنی مقصود ہے۔ واللہ اعلم

سلف صالحین اِسی آیتِ کریمہ کی بنا پر اپنے اعمال کے بارے میں بڑے خوفزدہ رہتے تھے کہ کہیں وہ ان لوگوں میں سے نہ ہوں جن سے اللہ تعالیٰ قبول ہی نہیں کرتا اور جب امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ''المتقین'' کا کیا معنی ہے؟ تو انھوں نے کہا: متقی وہ ہوتا ہے جو چیزوں کے متعلق ڈرتا رہتا ہے اور حرام چیز میں واقع نہیں ہوتا۔

مالِ حرام کے ساتھ صدقہ کرنا:

حرام مال کے ساتھ صدقہ کرنا ناقابلِ قبول ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طَهُورٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُولٍ» [2]

''اللہ تعالیٰ اس نماز کو قبول نہیں کرتا جو بغیر وضو کے پڑھی جائے اور اس صدقہ کو قبول نہیں کرتا جو خیانت کے مال سے کیا جائے۔''

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[1] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب تسمى العبد الآبق كافرا، رقم الحديث: 124 (70)

[2] صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، رقم الحديث: 1 (224)

«مَا تَصَدَّقَ أَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ إِلَّا أَخَذَهَا الرَّحْمٰنُ بِيَمِينِهِ»[1]

''جو شخص بھی پاکیزہ مال سے صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ لے لیتا ہے۔''

جان لیجیے کہ حرام مال کے ساتھ صدقہ دو طرح سے ہوتا ہے:

1. خیانت کرنے والا یا مال چھیننے والا یا ان جیسا کوئی اور آدمی اپنے اوپر ہی حرام مال سے صدقہ کرے۔ مذکورہ احادیث میں یہی شخص مراد ومقصود ہے کہ اِس جیسے انسان سے صدقہ قبول نہیں کیا جاتا، یعنی اسے اجر نہیں ملتا بلکہ وہ کسی اور کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کر کے گناہگار ہوتا ہے اور اصل مالک کو بھی اس سے کوئی اجر نہیں ملتا، کیونکہ اس کی نیت صدقہ کرنے کی نہیں ہوتی۔ علماء کی ایک جماعت اسی بات کی قائل ہے جن میں حنبلیوں میں سے ابن عقیل رحمہ اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ابن عامر نے ایک مرتبہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے غلام کو آزاد کرنے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: تمھاری مثال اس آدمی کی سی ہے جو کسی حاجی سے اس کا اونٹ چھین کر اس پر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے چلا جائے، بھلا بتلاؤ کیا اس کا جہاد قابلِ قبول ہوگا؟!
2. مال چھیننے والا شخص اگر چھینا ہوا مال اس کے مالک کو یا اس کے ورثاء کو لوٹانے سے عاجز آ جائے تو اس کی طرف سے اسے صدقہ کر دے۔ یہ اکثر علماء کے نزدیک جائز ہے جن میں امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال:

ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زہری، ثوری، اوزاعی اور اللیث رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ جس آدمی نے غنیمت کے مال میں خیانت کی ہو اور تقسیم سے پہلے ہی اس میں سے کچھ رکھ لیا ہو، پھر اسلامی فوج کے تمام لوگ اِدھر اُدھر بکھر جائیں اور وہ ان تک نہ پہنچ سکتا ہو تو اس کا پانچواں حصہ حاکم وقت کو دینے کے بعد وہ باقی مال کا صدقہ کر دے۔

[1] صحیح البخاري، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب، رقم الحدیث: 1410 ومسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب، رقم الحدیث: 63 (1014)

یہی مسلک سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ اور یہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف سے ملتا جلتا ہے جن کا کہنا ہے کہ جس مال کے مالک کا کچھ بھی پتا نہ چل رہا ہو تو اسے صدقہ کر دیا جائے۔

ابن عبد البر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ گری ہوئی چیز کا اعلان کرنے کے باوجود اگر اس کے مالک کا کچھ بھی پتا نہ چل رہا ہو تو اسے صدقہ کرنا جائز ہے۔ اور اس کے صدقہ کیے جانے کے بعد اگر اس کا مالک مل جائے تو اسے اختیار ہے کہ وہ یا تو صدقے کی نیت کر کے اس کا اجر وثواب لے لے یا پھر اس کی قیمت ادا کرنے کا مطالبہ کرے۔ یہی حکم چھینے ہوئے مال کا بھی ہے۔ انتہی

قبولیتِ دعا کے اسباب اور اس کے بعض آداب:

اِس حدیث کے ان الفاظ: ''اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کر کے پراگندہ اور غبار آلود حالت میں آسمان کی طرف ہاتھوں کو بلند کر کے دعا کرتا ہے: اے میرے رب، اے میرے رب! حالانکہ اس کا کھانا، اس کا پینا اور اس کا لباس حرام کمائی سے ہوتا ہے اور اس کے جسم کی پرورش حرام رزق سے ہوئی ہوتی ہے تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟!'' میں آدابِ دعا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ اسباب ذکر کیے گئے ہیں جو دعا کی قبولیت کا موجب بنتے ہیں اور ان چیزوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کی وجہ سے دعا رد کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبولیتِ دعا کے چار اسباب ذکر فرمائے:

① لمبا سفر:

سفر چاہے مختصر کیوں نہ ہو قبولیتِ دعا کا موجب بنتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيهِنَّ: دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ، وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهِ»[1]

''تین دعائیں بلا شک قبول کی جاتی ہیں: مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور اپنی اولاد کے لیے والد کی دعا۔''

---

① سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب دعوة الوالد ودعوة المظلوم، رقم الحديث: (3862)، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة، باب ما جا في دعوة الوالدين، رقم الحديث: (1910)، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب الدعاء بظهر الغيب، رقم الحديث: (1536)

اور جب سفر لمبا ہو تو اس میں دعا کی قبولیت کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں مسافر کو زیادہ مدت تک اپنے وطن سے دور رہنے اور مشقتیں برداشت کرنے کی وجہ سے انکساری حاصل ہوتی ہے اور انکساری قبولیتِ دعا کے اہم اسباب میں سے ایک ہے۔

② لباس میں سادگی، بکھرے ہوئے بال اور غبار آلود حالت:

انسان کی مذکورہ ظاہری حالت بھی دعا کی قبولیت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''بہت سے بکھرے اور غبار آلود بالوں والے، پرانے لباس میں ملبوس اور جنھیں لوگ دروازوں سے دھکے دے کر نکالتے ہیں، ان میں سے کئی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کو قسم بھی دیں تو اللہ ان کی قسم کو ضرور پورا کرتا ہے۔''[1]

اسی طرح جب نبی کریم ﷺ نمازِ استسقاء کے لیے نکلے تو نہایت سادگی، تواضع اور عاجزی وانکساری کی حالت میں نکلے۔[2]

③ آسمان کی طرف ہاتھوں کو پھیلانا:

یہ بھی دعا کے ان آداب میں سے ہے کہ جن کی بنا پر اس کی قبولیت کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي إِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْنِ »[3]

''بے شک اللہ تعالیٰ بہت حیا کرنے والا اور نہایت مہربان ہے اور کوئی آدمی جب اس کی طرف ہاتھ بلند کرتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ وہ انھیں خالی اور ناکام واپس لوٹا دے۔''

---

① رواه مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الضعفاء والخاملين، رقم الحديث: 38 (2622) ومسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها، باب النار يدخلها الجبارون ....، رقم الحديث: 48 (2854)

② رواه الترمذي، كتاب الجمعة، باب ما جاء في صلاة الإستسقاء، رقم الحديث (557)

③ مسند أحمد (438/5)، سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب في دعاء النبي ﷺ، رقم الحديث: (3565)، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب الدعاء، رقم الحديث (1488)، ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب رفع اليدين في الدعاء، رقم الحديث (3865) وصححه الألباني.

اور نمازِ استسقاء میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھایا کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی بھی نظر آنے لگی تھی۔[1]

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے بدر کے دن بھی مشرکین کے خلاف فتح یاب ہونے کے لیے دعا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ بلند کیے حتی کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر گر گئی۔[2]

④ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے بار بار دعا کرنا:

یہ قبولیتِ دعا کے بڑے اسباب میں سے ایک ہے۔

عطا رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"جب بھی کوئی بندہ تین بار یوں کہتا ہے: یا رب! یا رب! تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھتا ہے۔"

ان کی یہ بات جب حسن رحمہ اللہ کے سامنے ذکر کی گئی تو انھوں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا: تم قرآن نہیں پڑھتے؟ پھر انھوں نے یہ آیات تلاوت کیں:

﴿ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴾

[آل عمران: ۱۹۱۔ ۱۹۵]

ان آیاتِ کریمہ میں بار بار ﴿ رَبَّنَاۤ ﴾ کے ساتھ دعا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اس طرح دعا کرتے ہیں ان کا رب ان کی دعائیں قبول کر لیتا ہے۔

---

① مسلم، كتاب صلاة الاستسقاء، باب رفع اليدين في الدعاء في الاستسقاء، رقم الحديث: 5 (895)

② مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر، رقم الحديث: 58 (1763)

دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بننے والے امور:

جہاں تک ان امور کا تعلق ہے کہ جو دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بنتے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے اِس حدیث میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور وہ ہیں: حرام کھانا، حرام پینا، حرام لباس پہننا اور حرام مال کے ساتھ اپنی پرورش کرنا۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے آپ کی دعا کیسے قبول کی جاتی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: میں نے جو بھی لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھایا ہے اس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ یہ کہاں سے آیا اور کہاں سے نکلا ہے!

فرمانِ رسول ﷺ: «فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لَهُ» کا مطلب:

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''اس کی دعا کیسے قابلِ قبول ہو سکتی ہے!'' اِس میں استفہام سے مراد تعجب کا اظہار کرنا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسے شخص سے دعا کی قبولیت بہت دور ہے۔ تاہم یہ اس بارے میں واضح نہیں ہے کہ اس کی دعا بالکل ہی ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ حرام کھانے پینے اور پہننے میں توسع اختیار کرنا اور اسی کے ساتھ اپنی پرورش کرنا قبولیتِ دعا کے سامنے رکاوٹ بننے والے امور میں سے ایک ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اِس رکاوٹ کے موثر ہونے میں کوئی اور چیز مانع ہو۔

اسی طرح موانعِ قبولیت میں عملی محرمات کا ارتکاب کرنا اور واجباتِ دین کو ترک کرنا بھی شامل ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ترک کرنے کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کی دعا قبول نہیں کی جاتی۔ اِس کے برعکس نیکیاں سرانجام دینا قبولیتِ دعا کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے وہ لوگ جن کے غار میں داخل ہونے کے بعد غار کے منہ پر ایک چٹان آ گئی تھی اور وہ اندر بند ہو کر رہ گئے تھے تو انھوں نے اپنے ان نیک اعمال کا وسیلہ بنایا تھا جو انھوں نے خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کیے تھے، پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جو قبول کر لی گئی۔[1]

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص بغیر عمل کے دعا کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے

---

[1] رواه البخاري، كتاب الإجارة، باب من استأجر أجيرا فترك الأجير أجره فعمل فيه، رقم الحديث (2272)، ومسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة، باب قصة أصحاب الغار الثلاثة، رقم الحديث (2743)

جو بغیر کمان کے تیر پھینکے۔ اور سفیان رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ آپ دعا کیوں نہیں کرتے؟! تو انھوں نے کہا: گناہوں کو ترک کرنا ہی دعا ہے۔

بعض شعراء نے یہی مفہوم یوں بیان کیا ہے ؎

نَحْنُ نَدْعُو الْإِلٰهَ فِيْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ نَنْسَاهُ عِنْدَ كَشْفِ الْكُرُوْبِ

كَيْفَ نَرْجُوْ اِسْتِجَابَةً لِدُعَاءٍ قَدْ سَدَدْنَا طَرِيْقَهَا بِالذُّنُوْبِ

"ہم اللہ تعالیٰ کو ہر پریشانی میں پکارتے ہیں، پھر جب پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں تو اسے بھلا دیتے ہیں۔ ہم کیسے قبولیت کی امید رکھتے ہیں جبکہ ہم نے اس کا راستہ گناہوں کے ذریعے بند کر دیا ہے!"

فوائدِ حدیث:

1. اللہ تعالیٰ تمام نقائص وعیوب سے پاک ہے۔
2. مومن کے عمل کے پاک ہونے کا سب سے بڑا وسیلہ حلال کھانا پینا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا عمل بڑھتا اور پرورش پاتا ہے۔
3. حرام خوری عمل کو فاسد کر دینے کا سبب بنتی ہے اور اس کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔
4. اللہ تعالیٰ کا تقرب پاک اور حلال چیز کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔
5. حلال کھایئے، آپ کی دعا قبول کی جائے گی۔
6. دعا کے کچھ آداب ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

سوالات:

1. آیتِ کریمہ: ﴿ يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ [المؤمنون: ۵۱] کس بات کا حکم دے رہی ہے اور کیا اس قسم کا خطاب اللہ نے رسولوں کے علاوہ عام لوگوں سے بھی کیا ہے؟ اپنے جواب کی وضاحت کریں۔
2. حدیثِ نبوی: « لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ » کی تشریح کریں اور اس کا درج بالا حدیث سے جو تعلق ہے اس کی وضاحت کریں۔

3 درج ذیل مسائل میں علماء کی آراء ذکر کریں:

- جس شخص نے حرام مال کے ساتھ حج کیا!
- غصب کرنے والے نے غصب کیے ہوئے مال کا اس کے مالک کی طرف سے صدقہ کیا!

4 اِس حدیث میں سے آدابِ دعا کا استنباط کیجیے۔

5 «فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لَهُ» میں استفہام کون سا ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟



یقین شک کے ساتھ ختم نہیں ہوتا

11 سیدنا ابو محمد حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما جو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور آپ کے پیارے پھول تھے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اچھی طرح ذہین نشین کر لیا تھا:

«دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ» [1]

''جس چیز میں شک ہو اس کو چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کر لو جس میں شک نہ ہو۔''

یاد رہے کہ یہ حدیث ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جس میں قنوتِ وتر کا ذکر بھی ہے۔

سنن ترمذی وغیرہ میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَإِنَّ الْكَذِبَ رِيبَةٌ»

''سچ اطمینان کا اور جھوٹ شک وشبہ کا باعث ہوتا ہے۔''

جبکہ صحیح ابن حبان میں یہ الفاظ ہیں:

«فَإِنَّ الْخَيْرَ طُمَأْنِينَةٌ وَإِنَّ الشَّرَّ رِيبَةٌ» [2]

''خیر کا کام سکونِ قلب کا اور برائی کا کام اضطراب وپریشانی کا سبب بنتا ہے۔''

راویِ حدیث:

حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما، ابو محمد، نواسہ وشبیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی ولادت تین ہجری میں ہوئی، آپ نے اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اپنے بھائی حسین رضی اللہ عنہ سے، جب کہ ان سے بہت سارے تابعین نے احادیث روایت کیں۔ طبرانی میں آپ کی مرویات کی تعداد ۳۴ ہے۔

آپ ہی کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ .... الخ۔''

آپ کی وفات ۴۹ھ اور ایک قول کے مطابق ۵۰ھ میں ہوئی۔ [3]

---

[1] رواه النسائي، كتاب الأشربة، باب الحث على ترك الشبهات، رقم الحديث (5711) والترمذي، كتاب صفة القيامة، باب فضل كل قريب هين سهل، رقم الحديث (2518) مطولا.

[2] صحيح ابن حبان (498/2)

[3] الأحاديث الواردة في شأن السبطين، رسالة ماجستير، عثمان محمد الخميس، جامعة الكويت (1/26-22)

مومن کا دل اس کی نشانی ہے:

اِس حدیث کا معنی یہ ہے کہ شبہات میں انسان کو توقف کرنا اور ان سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ کیونکہ جو چیز واضح طور پر حلال ہوتی ہے اس کے متعلق مومن کے دل میں کوئی شک وشبہہ یعنی قلق اور اضطراب وغیرہ نہیں ہوتا، بلکہ نفس کو سکون اور دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ جبکہ شبہات کے متعلق دلوں میں قلق اوراضطراب پایا جاتا ہے جوشک وشبہہ کا موجب بنتا ہے۔

اسلام میں اشیائے خورونوش کونرخوں کے اضافے تک ذخیرہ کرنا ممنوع ہے:

حجاج بن دینار رحمہ اللہ نے کچھ غلہ ایک آدمی کے ہاتھ بصرہ شہر کی طرف بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ جس دن بصرہ میں داخل ہو اسی دن کے نرخ کے مطابق جاتے ہی اسے فروخت کر دے۔ وہ جب بصرہ میں پہنچا تو اس نے حجاج کو ایک خط روانہ کیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں جب بصرہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ غلہ کا نرخ کم ہے۔ اس لیے میں نے اسے روک لیا اور جب اس کا نرخ زیادہ ہوا تو میں نے اسے زیادہ نرخ میں بیچ دیا ہے۔ حجاج نے اسے جواب لکھا کہ تم نے ہم سے خیانت کی ہے اور ہم نے جو حکم دیا تھا اس کی سراسر خلاف ورزی کی ہے۔ لہٰذا جب تمھیں میرا یہ خط ملے تو غلے کی پوری قیمت کو بصرہ کے فقراء پر صدقہ کر دینا، یوں ہوسکتا ہے کہ میں بچ جاؤں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا کوئی شخص حالتِ احرام میں شکار کا گوشت کھا سکتا ہے؟ تو انھوں نے کہا: ''احرام کے چند ہی دن ہیں، لہٰذا تمھیں جس چیز میں شک ہو اسے چھوڑ دو۔'' یعنی جس چیز کے بارے میں یہ شبہہ ہو کہ پتا نہیں یہ حلال ہے یا حرام تو اسے ترک کر دو، کیونکہ اہلِ علم کے مابین اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ حالتِ احرام میں اگر کوئی شخص خود تو شکار نہ کرے لیکن شکار کرنے والا اسے شکار کا گوشت پیش کرے تو کیا وہ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

رخصت پر عمل کرنا افضل ہے:

اِس حدیث سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ علمائے کرام کے اختلاف سے خروج کرنا ہی افضل ہے، کیونکہ اِس طرح بندہ شبہات سے بچ جاتا ہے، لیکن حنبلیوں میں سے محققین علماء کا خیال ہے کہ یہ علی الاطلاق درست نہیں ہے، کیونکہ بعض اختلافی مسائل ایسے ہیں کہ جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت

ثابت ہے اور اس کا معارض ثابت نہیں ہے، چنانچہ اس رخصت پر عمل کرنا اسے چھوڑنے سے بہتر ہے، خواہ وہ رخصت بعض علماء تک نہ پہنچی ہو اور اس کی وجہ سے انھوں نے اسے قبول نہ کیا ہو۔ اس کی مثال وہ شخص ہے جس کو طہارت کا یقین اور وضو ٹوٹنے کا شک ہو۔ تو اس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''وہ نماز توڑ کر نہ جائے جب تک آواز نہ سنے یا بو نہ پائے۔''[1]

خاص طور پر اگر اس کو یہ شک نماز کی حالت ہی میں ہو تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ نماز توڑ دے، کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع کیا ہے، اگرچہ اِس حالت میں بعض علماء نماز توڑنا واجب قرار دیتے ہیں۔

رخصت پر کب عمل نہ کیا جائے؟:

اگر رخصت کا معارض دوسری سنت سے یا اس کے خلاف امت کے عمل سے ثابت ہو تو اِس صورت میں رخصت پر عمل نہ کرنا بہتر ہے۔ اسی طرح اگر اس پر محض چند لوگوں نے ہی عمل کیا ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد سے مختلف اسلامی ملکوں میں اس کے خلاف عمل چلا آ رہا ہو تو اسی چیز کو قبول کرنا چاہیے جس پر مسلمانوں کا عمل چلا آ رہا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس امت کو اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ اس میں اہلِ باطل اہلِ حق پر مکمل طور پر غالب آ جائیں۔ لہٰذا جو عمل پہلی تین فضیلت والی صدیوں میں غالب رہا وہی حق ہے اور اس کے علاوہ ہر عمل باطل ہے۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ شبہات سے توقف کرنے کے متعلق زیادہ باریک بینی وہ آدمی کر سکتا ہے جس کے اپنے تمام احوال درست ہوں اور تقویٰ و پرہیزگاری میں اس کے اعمال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں۔

کبائر کے ارتکاب کے ساتھ صغیرہ گناہوں سے بچنا پرہیزگاری نہیں ہے:

جو شخص کھلم کھلا محرمات کا ارتکاب کرتا ہو اور وہ یہ چاہے کہ باریک شبہات سے بچ جائے تو ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے، بلکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہے گا تو اس کا یہ طرزِ عمل قطعی طور پر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ جیسا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب اہلِ عراق میں سے کسی نے مچھر کے خون کے متعلق سوال کیا تو انھوں

[1] البخاري، كتاب الوضوء، باب الوضوء من الشك حتى يستيقن، رقم الحديث (137)، وله أطراف، ومسلم، كتاب الحيض، باب الدليل على من تيقن الطهارة ثم .... رقم الحديث: 98 (361)

نے کہا: دیکھو! یہ لوگ مجھ سے مچھر کے خون کے بارے میں پوچھتے ہیں، حالانکہ یہ تو حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل ہیں، جب کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے سنا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دونوں (حسن و حسین رضی اللہ عنہما) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔''[1]

خیر میں اطمینان اور شر میں شک ہوتا ہے:

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان ''خیر میں اطمینان اور شر میں شک ہوتا ہے۔'' سے مراد یہ ہے کہ جب اشتباہ ہو جائے تو خیر پر دل مطمئن ہو جاتے ہیں اور شر کے متعلق شک سا رہتا ہے اور دلوں کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اِس میں اشارہ ہے اِس بات کی طرف کہ جب اشتباہ ہو رہا ہو تو اس وقت دلوں کی حالت کا جائزہ لینا چاہیے۔

سچ میں اطمینان اور جھوٹ میں شک ہوتا ہے:

دوسری روایت کے یہ الفاظ ''سچ میں اطمینان اور جھوٹ میں شک ہوتا ہے۔'' ان میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر بندے کی بات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ سیدنا وابصہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ « وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتَوْكَ » ''اگر چہ لوگ تمھیں بار بار فتوے کیوں نہ دیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔''[2] بلکہ صرف اس آدمی کی بات پر اعتماد کرنا چاہیے جو سچ بولے۔

سچ کی علامت یہ ہے کہ اس پر دل مطمئن ہو جاتے ہیں، جبکہ جھوٹ کے بارے میں شک سا رہتا ہے اور دلوں کو اطمینان نہیں ہوتا اور وہ اس سے نفرت کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے عہد میں جب لوگ آپ کا کلام اور آپ کی دعوت کو سنتے تو انھیں یقین ہو جاتا کہ آپ سچے ہیں اور حق لے کر آئے ہیں۔ اور جب مسیلمہ کذاب کی باتیں سنتے تو وہ پہچان لیتے کہ یہ جھوٹا ہے اور جس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے وہ باطل ہے۔ چنانچہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ انھوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے مسیلمہ کذاب کی باتیں سنیں اور اس کا یہ دعویٰ بھی سنا کہ اس پر یہ کلام نازل کیا گیا ہے: ''يَا وَبِرُ يَا وَبِرُ! لَكَ أُذُنَانِ وَصَدْرٌ، وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ يَا عَمْرُو'' تو انھوں نے فوراً کہا: میں یہ جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔

---

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب رحمة الولد وتقبيله ومعانقته، رقم الحديث (5994)

[2] مسند أحمد: (228/4)

اشیاء کا ان کی بالمقابل چیزوں سے پتا چلتا ہے:

بعض متقدمین کا کہنا ہے کہ آپ اپنے دل میں کسی بھی چیز کا تصور کریں اور اس کے بارے میں غور وفکر کریں، پھر اس کی ضد (بالمقابل چیز) کو بھی اس کے سامنے لے آئیں، جب آپ ان دونوں کے درمیان امتیاز کریں گے تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے! سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے! مثال کے طور پر آپ حضرت محمد ﷺ کا تصور کریں، پھر آپ ﷺ کو جو قرآن دیا گیا اس کے بارے میں غور وفکر کریں، مثلاً: آپ یہ آیت پڑھیں:

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴾ [البقرة: ١٦٤]

”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں ان چیزوں کو لیے چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اللہ کے نازل کردہ آسمانی پانی میں کہ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی زندہ کیا اور ان ہر قسم کے جانوروں میں جو اس نے زمین میں پھیلائے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان پابند کر دیے گئے ہیں (ان سب میں) ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو عقل رکھتے ہیں۔“

اس کے بعد آپ حضرت محمد ﷺ کی ضد، یعنی آپ ﷺ کے بالمقابل مسیلمہ کذاب کا تصور کریں اور جو کچھ اس نے کہا اس کے بارے میں غور وفکر کریں، مثلاً: اس نے سجاح سے شادی کرنے کے بعد اسے کہا: ”أَلَا يَا رَبَّةَ الْمَخْدَعِ، قَدْ هُيِّئَ لَكِ الْمَضْجَعِ“

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید بڑا متوازن اور پسندیدہ کلام ہے جو دل پر اثر کرتا اور کانوں میں رس گھولتا ہے۔ جبکہ مسیلمہ کا کلام بالکل بے اثر، بے ربط اور بے حیائی پر مشتمل ہے۔ یوں آپ کو یقین ہو جائے گا کہ محمد ﷺ برحق ہیں اور وحی لے کر آئے ہیں، جبکہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور باطل لے کر آیا ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. بندے کو اپنا ہر معاملہ یقین پر مبنی کرنا چاہیے اور اسے دین میں بصیرت حاصل کرنی چاہیے۔
2. اقوال واعمال میں سے جو ممنوع ہو یا بدعت ہو اور بندے کو اس کے بارے میں اشتباہ ہو رہا ہو تو اسے ترک کر دینا اس پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔
3. صدق اور حق پر دل مطمئن ہوتے ہیں اور نفس کو ان سے سکون ملتا ہے۔
4. جھوٹ اور باطل سے دل پریشان ہوتے ہیں اور نفس اس سے نفرت کرتا ہے۔
5. یہ حدیث جامع کلمات میں سے ہے اور اِس بارے میں فیصلہ کن ہے کہ بندے کو جس دینی یا دنیاوی امر میں تردد ہو رہا ہو وہ اسے چھوڑ دے۔
6. پرہیز گاری تمام صغیرہ وکبیرہ گناہوں کو چھوڑنے کا نام ہے۔

سوالات:

1. بعض لوگوں کا خیال ہے کہ درج بالا حدیث پر عمل کرتے ہوئے رخصت پر عمل نہ کرنا افضل ہے، تو کیا ان کی یہ رائے درست ہے؟ اپنے جواب کی وضاحت کریں۔
2. رخصت پر عمل کب ترک کیا جائے؟
3. کون سے دینی ودنیاوی امور میں اِس حدیث پر عمل کرنا ممکن ہے؟ چند مثالیں دیجیے۔
4. وہ کون سے معیار ہیں کہ جن کی بنا پر ہم جائز اور ناجائز کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں؟



دوسروں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمان کا ادب

12 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»[1]

''آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اس معاملے کو چھوڑ دے جس سے اس کا تعلق نہیں۔''

بعض وہ احادیث جن کا اسلام میں بڑا مرتبہ ہے:

یہ حدیث ادب کے اصولوں میں سے ایک عظیم اصول پر مشتمل ہے۔ امام ابوعمرو بن الصلاح رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کے مالکیوں کے امام ابو محمد بن ابی زید سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: خیر کے آداب مجموعی طور پر چار احادیث سے ماخوذ ہیں:

1. حدیثِ نبوی: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ»[2]
''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ خیر کی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔''
2. درج بالا حدیث: «مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»
3. وہ حدیث جس میں نبی کریم ﷺ نے ایک سائل کو بار بار یہ وصیت کی تھی کہ «لَا تَغْضَبْ» یعنی ''غصہ نہ کیا کرو۔''[3]
4. حدیثِ نبوی: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ» ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''[4]

---

[1] حسن. رواه الترمذي، كتاب الزهد، باب فيمن تكلم بكلمة يضحك بها الناس، رقم الحديث (2317)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر، رقم الحديث: (6018) ومسلم، كتاب اللقطة، باب الضيافة ونحوها، رقم الحديث: 14 (48)

[3] أخرجه البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم الحديث (6116) من حديث أبي هريرة رضي الله عنه

[4] أخرجه البخاري، كتاب الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه، رقم الحديث (13) ومسلم، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من خصال الإيمان ....، رقم الحديث: 71 (45)

حدیث کا مفہوم:

جو شخص ایک اچھا مسلمان ہو وہ بے مقصد قول وفعل کو ترک کر دیتا ہے اور صرف ان اقوال وافعال پر اکتفا کرتا ہے جو اس کے لیے نہایت ہی لائقِ اہتمام اور مقصود ومطلوب ہوتے ہیں۔ تاہم اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ ہر اس چیز کو چھوڑ دے اور اس کا کوئی اہتمام نہ کرے جس کے لیے اس کا دل نہ چاہے، یا اس کا نفس اس کی خواہش نہ رکھتا ہو، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو چیز اسلامی شریعت کے لحاظ سے اس کے لیے قابلِ اعتنا نہ ہو وہ اس کے قریب نہ جائے، اسی لیے اس کو اسلام کے حسن سے قرار دیا، یعنی آدمی جب عمدہ اور اچھی صورت میں مسلمان ہوتو وہ ان تمام اقوال وافعال کو چھوڑ دیتا ہے جو اسلامی لحاظ سے اس کے لیے بے مقصد ہوں، کیونکہ ''اسلام'' ایک تو واجباتِ دین پر عمل کرنے کا تقاضا کرتا ہے، جیسا کہ حدیثِ جبریل کی شرح میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور دوسرا دینِ کامل میں ترکِ محرمات بھی شامل ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ»[1]

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دیگر مسلمان محفوظ رہیں۔''

اللہ تعالیٰ سے حیا:

جب کوئی شخص اچھا مسلمان ہوتو اس کا اسلام اس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ تمام محرمات، مشتبہات، مکروہات اور غیر ضروری وفضول مباحات کو چھوڑ دے، کیونکہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جن سے مسلمان کا کوئی تعلق نہیں، بشرطیکہ وہ مکمل مسلمان ہو اور درجۂ احسان کو پہنچ چکا ہو، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں کرتا ہو کہ جیسے وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ اس کو نہیں دیکھ رہا تو کم از کم اسے اس بات پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت اِس طرح کرے کہ وہ اسے اپنے قریب تصور کر رہا ہو، یا اپنے آپ کو اس سے قریب سمجھ رہا ہو، اپنے دل سے گویا اس کا مشاہدہ کر رہا ہو اور اسے یقینِ کامل ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی عبادت پر مطلع ہے تو وہ ایک اچھا مسلمان ہوتا ہے اور اِس سے اس پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ہر اس چیز کو ترک کر دے جو اسلامی لحاظ سے اس کے لیے غیر متعلقہ ہو اور وہ صرف اس چیز میں مشغول ہو جو اسلامی لحاظ سے اس سے متعلق ہو۔ ان دونوں چیزوں کی بنا پر بندے میں اللہ تعالیٰ سے شرم وحیا کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہر اس چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اس کے لیے شرمناک ہو۔

---

[1] البخاري، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم الحديث: (10)، ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام، رقم الحديث: 65 (41)

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اتنی شرم کرو جتنا وہ تم سے قریب ہے اور اس سے اتنا ڈرو جتنی وہ تم پر قدرت رکھتا ہے۔

یاد رہے کہ سب سے زیادہ غیر متعلقہ چیزوں کا تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ چنانچہ لغو اور بے ہودہ گفتگو سے اپنی زبان کو محفوظ رکھنا چاہیے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''جو شخص اپنے کلام اور اپنے عمل کو شمار کرتا رہے تو اس کا کلام کم ہوتا ہے اور وہ صرف اس امر کے متعلق بولتا ہے جو اس سے متعلق ہوتا ہے۔''

موصوف نے بالکل صحیح کہا ہے، کیونکہ اکثر لوگ اپنے کلام کو شمار نہیں کرتے، اسی لیے وہ بے تکی باتیں کرتے ہیں اور ذرا بھی احتیاط نہیں کرتے۔

یہی بات سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر بھی مخفی رہ گئی تھی جب انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں کیا اس پر ہمارا مؤاخذہ کیا جائے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

« ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ وَ عَلَى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ »[1]

''معاذ! تمھاری ماں تمھیں گم پائے! لوگوں کو ان کے نتھنوں کے بل جہنم میں ان کی زبانوں سے نکلنے والا کلام ہی تو گرائے گا۔''

« ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ » ''تمھاری ماں تمھیں گم پائے۔'' اس میں گویا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ پر ان کے بے تکے سوال کی وجہ سے موت کی بددعا کی جو کہ ہر ایک پر آتی ہے اور یوں اِس بددعا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ اگر تم ایسے ہو تو پھر تمھارا مر جانا ہی تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تم اپنی زبان سے زیادہ برائیاں نہ کما سکو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ ان الفاظ میں سے ہوں جو عرب لوگوں کی زبانوں پر غیر ارادی طور پر آجاتے تھے ان میں بددعا کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں: « تَرِبَتْ يَدَاكَ » ''تمھارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔''[2]

---

[1] الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم الحديث: (2616) وقال: حديث حسن صحيح، وابن ماجه، كتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتن، رقم الحديث: (3973)، وأحمد في المسند (231/5)

[2] النهاية: (217/1)

غیر متعلقہ امور میں کلام نہ کرنے اور ان میں خاموش رہنے کے نتائج وثمرات:

① لوگوں کی زیادہ تر سرگوشیاں خیر سے خالی ہوتی ہیں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾

[النساء: ۱۱٤]

''ان کے اکثر مشوروں میں خیر نہیں ہوتی الا یہ کہ کوئی شخص لوگوں کو خفیہ طور پر صدقہ کرنے یا بھلے کام کرنے یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے۔''

② عظمت وسربلندی:

عمرو بن قیس الملائی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ایک آدمی لقمان کے پاس سے گزرا جنھیں لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس نے ان سے کہا: کیا آپ فلاں قبیلے میں غلام نہ تھے؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: آپ ہی وہی شخص ہیں جو فلاں فلاں پہاڑ کے پاس جانور چراتے تھے؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: تو پھر کیسے آپ اِس بلند مقام تک پہنچ گئے؟ انھوں نے کہا: سچ بولنے اور غیر متعلقہ چیزوں پر خاموش رہنے کی بدولت۔''

③ کرامت:

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''بنو اسرائیل میں دو آدمی تھے جو اِس قدر عبادت گزار تھے کہ اس کی وجہ سے وہ پانی پر چلا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ سمندر کے پانی پر چل رہے تھے کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا جو فضا میں چل رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سے کہا: اے اللہ کے بندے! آپ اس مقام تک کیسے پہنچ گئے؟ اس نے کہا: میں نے دنیا سے بہت تھوڑا لیا ہے، شہوات سے اپنے آپ کو روکے رکھا ہے، اپنی زبان کو بے مقصد امور میں گفتگو کرنے سے بچایا ہے، میرے رب کے ہاں جو نعمتیں ہیں، میں نے بس انھی کی رغبت رکھی ہے اور خاموشی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کو قسم بھی دوں تو وہ میری قسم کو ضرور پورا کرتا ہے اور اگر میں دعا کروں تو وہ مجھے ضرور عطا کرتا ہے۔''

④ موت کے وقت پر رونق چہرہ:

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے تو ان کے چہرے پر بڑی چمک دمک تھی، لوگوں نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا: میری دو عادتیں انتہائی پختہ تھیں اور وہ یہ ہیں کہ میں غیر متعلقہ امور میں گفتگو نہیں کرتا تھا اور میرا دل مسلمانوں کے متعلق بالکل صاف تھا۔

مورق العجلی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ایک کام ایسا ہے جس کی طلب مجھے کئی سالوں سے ہے اور میں اسے حاصل نہیں کر سکا، لیکن میں اس کی طلب ہرگز چھوڑنے والا نہیں۔ لوگوں نے کہا: وہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: غیر متعلقہ امور کے بارے میں خاموش رہنا۔''

⑤ اللہ تعالیٰ کا بندے سے اعراض:

ابو عبیدہ رحمہ اللہ حسن رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: بندے سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اسے بے مقصد چیزوں میں مشغول کر دے۔

سہل التستری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''جو شخص غیر متعلقہ امور میں گفتگو کرتا ہو وہ سچ بولنے سے محروم ہو جاتا ہے۔''

معروف رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''بندے کا غیر متعلقہ امور میں گفتگو کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے رسوائی ہے۔''

اسلام کا حسن:

یہ حدیث اِس بات کی دلیل ہے کہ آدمی کا غیر متعلقہ امور کو چھوڑ دینا اس کے اسلام کے حسن سے ہے، لہٰذا جب وہ انھیں ترک کر دے اور صرف ان امور پر توجہ دے جو اس سے متعلق ہوں تو اس کے اسلام کا حسن مکمل ہو جاتا ہے۔ اور احادیث میں اس شخص کی بڑی فضیلت ذکر کی گئی ہے جو اچھا مسلمان ہو۔ اس کی نیکیوں کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ اور بظاہر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کے ثواب کا کئی گنا تک بڑھنا نیکیاں کرنے والے شخص کے اسلام کے حسن کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص اپنا اسلام اچھا کر لیتا ہے تو وہ جو بھی نیکی کرتا ہے اسے دس سے

لے کر سات سو گنا تک لکھا جاتا ہے اور وہ جو بھی برائی کرتا ہے تو وہی ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔"[1]

لہٰذا نیکی کا دس گنا تک بڑھایا جانا تو ضروری ہے، اِس سے زیادہ اضافہ اسلام کے حسن اور نیت کے اخلاص کے بقدر ہوتا ہے۔ نیز اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اِس عمل کی ضرورت اور فضیلت کتنی زیادہ ہے، مثلاً: جہاد، حج، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں میں خرچ کرنا۔ ان میں خرچ کرنے کی ضرورت کے اوقات کو بھی مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ اِس کی دلیل عطیہ سے مروی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے کہ آیت:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٦٠] دیہاتیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جب ان سے کہا گیا کہ مہاجرین کے لیے کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا: ان کے لیے اِس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ٤٠]

"اور اگر ایک نیکی ہو تو وہ اسے کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور اپنی طرف سے اجرِ عظیم بھی عطا کرتا ہے۔"

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث اصولِ ادب میں سے ایک اصول پر مشتمل ہے۔
2. جو شخص اپنے کلام کو شمار کرتا رہتا ہو تو اس کا کلام صرف اس کے متعلقہ امور کے بارے ہی میں ہوتا ہے۔
3. غیر متعلقہ امور پر خاموش رہنے کے لیے جہاد کرنا پڑتا ہے۔
4. فضول گفتگو غیر متعلقہ امور میں مشغول رہنے کے مترادف ہے۔
5. جب آدمی کا اسلام اچھا ہو (یعنی وہ اچھا مسلمان ہو) تو وہ ہر بے مقصد قول و فعل کو ترک کر دیتا ہے۔

سوالات:

1. نبی کریم ﷺ کے اس فرمان «تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ» کا کیا معنی ہے؟
2. بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی آدمی کے غیر متعلقہ امور میں داخل ہے، تو آپ ان کی تردید کیسے کریں گے؟

[1] مسلم، کتاب الإیمان، باب إذا هم العبد بحسنة، رقم الحدیث: 205 (129)

3 غیر متعلقہ امور پر خاموش رہنے کے تین ثمرات ذکر کریں۔

4 اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا جذبہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اور اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

5 جس شخص کا اسلام اچھا ہو تو اس کی نیکیوں کو کئی گنا تک بڑھا دیا جاتا اور اس کے گناہوں کو مٹا دیا جاتا ہے، اس کی دلیل قرآن وسنت سے پیش کریں۔



مومن اپنے بھائی کے لیے کیا پسند کرے؟

(13) سیدنا ابو حمزہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو کہ رسول اکرم ﷺ کے خادم تھے، بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ»①

''تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

راوی حدیث:

سیدنا انس بن مالک بن نضر بن ضمضم بن عدی بن نجار الانصاری الخزرجی، رسول اکرم ﷺ کے صحابی اور خادم، آپ مدینہ میں پیدا ہوئے اور کم سنی ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پا گئے۔ پھر دمشق چلے گئے اور وہاں سے بصرہ منتقل ہو گئے۔ آپ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«اَللّٰهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ، وَوَلَدَهُ، وَبَارِكْ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتَهُ»

''اے اللہ! اس کے مال و اولاد کو زیادہ کر دے اور اسے جو کچھ تو نے دیا ہے اس میں برکت دے۔''

آپ ۹۱ھ یا ۹۲ھ یا ۹۳ھ میں بصرہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر واقع ''الطف'' میں اپنے گھر میں فوت ہوئے۔ آپ بصرہ میں فوت ہونے والے آخری صحابی تھے۔ انھوں نے بہت زیادہ احادیث روایت کیں جن کی تعداد ۲۲۶۸ ہے۔

نفیِ ایمان سے کیا مراد ہے؟:

یہ حدیث مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

«لَا يَبْلُغُ عَبْدٌ حَقِيقَةَ الْإِيمَانِ حَتّٰى يُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ مِنَ الْخَيْرِ»②

① أخرجه البخاري، كتاب الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه، رقم الحديث: (13) ومسلم، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من خصال الإيمان ....، رقم الحديث: 71 (45)

② مسند أحمد (206/3) بلفظ مقارب، وابن حبان في صحيحه (471/1) رقم الحديث: (235)

''بندہ ایمان کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ لوگوں کے لیے بھی اسی خیر کو پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔''

یہ روایت صحیحین کی مذکورہ روایت کا معنی واضح کرتی ہے کہ نفیِ ایمان سے مراد حقیقتِ ایمان کو نہ پہنچنا ہے، کیونکہ کئی مرتبہ ایمان کی نفی اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے بعض ارکان وواجبات میں سے کوئی ایک نہیں ہوتا۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ»[1]

''کوئی زانی جب زنا کرتا ہے تو وہ اس وقت ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا، اور کوئی شخص جب شراب نوشی کرتا ہے تو اس وقت وہ ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا، اور کوئی چور جب چوری کرتا ہے تو وہ اس وقت ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا۔''

کبیرہ وصغیرہ گناہوں کے مرتکب کے بارے میں علماء کی رائے:

کبیرہ گناہوں کے مرتکب کے بارے میں علماء کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں کہ اسے ناقص ایمان والا مومن کہا جائے یا اسے مومن نہ کہا جائے، بلکہ صرف مسلمان ہی کہا جائے؟ یہ دونوں اقوال ان سے مروی ہیں اور یہی دو امام احمد رحمہ اللہ سے بھی منقول ہیں۔

جہاں تک صغیرہ گناہوں کے مرتکب کا تعلق ہے تو اس سے کلی طور پر ایمان کی نفی نہیں کی جا سکتی، بلکہ اسے ناقص ایمان والا مومن کہا جائے گا اور اس کے ایمان میں نقص اس کے گناہوں کے بقدر ہو گا۔

کامل مومن لوگوں کے لیے وہی چیز پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے:

سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ایمان قمیص کی مانند ہے جسے انسان کبھی پہن لیتا اور کبھی اتار دیتا ہے۔'' اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ ایمان کی تمام خصلتوں کو اختیار کر لیتا ہے تو اسے پہن لیتا ہے اور جب ان میں کمی کرتا ہے تو وہ اسے اتار دیتا ہے۔

یہ سب اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مکمل ایمان وہ ہوتا ہے جس کے ارکان وواجبات میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ ایمان کی واجب خصلتوں میں سے ایک خصلت یہ ہے کہ بندہ اپنے مومن بھائی کے لیے

[1] أخرجه البخاري، كتاب المظالم، باب النهبى، رقم الحديث (2475، 6810) ، ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي، رقم الحديث: 100 (57)

اس چیز کو پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو اور اس چیز کو ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہو۔ اگر اس میں یہ خصلت نہ ہو تو اس کی وجہ سے اس کے ایمان میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

«أَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا»[1]

''تم لوگوں کے لیے بھی وہی چیز پسند کیا کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، اِس طرح تم سچے مسلمان بن جاؤ گے۔''

اِس خصلت کے بعض ثمرات:

1 جنت کا داخلہ:

نبی کریم ﷺ نے ایک صحابی کو اسی خصلت کے نتیجے میں جنت کی خوشخبری دی۔ جیسا کہ مسند احمد میں یزید بن اسد القسری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: ''کیا تم جنت کو پسند کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: جی ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَأَحِبَّ لِأَخِيكَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ»[2]

''تب تم اپنے بھائی کے لیے اسی چیز کو پسند کیا کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔''

2 جہنم سے دوری:

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ وَيُدْخَلَ الْجَنَّةَ فَلْتَأْتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ»[3]

''جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ اسے جہنم کی آگ سے دور رکھا جائے اور اسے جنت میں داخل کر دیا جائے تو اس کی موت اِس حالت میں آنی چاہیے کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور وہ لوگوں سے ایسا سلوک کرتا ہو جو ان کی طرف سے اپنے لیے پسند کرتا ہو۔''

---

[1] رواه الترمذي، كتاب الزهد، باب من اتقى محارم الله، رقم الحديث (2305) وفيه انقطاع حيث لم يسمع الحسن البصري من أبي هريرة. وابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم الحديث (4216)

[2] مسند أحمد (70/4)

[3] مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخلفاء، رقم الحديث: 46 (1844)

3 مسلمانوں کے لیے خیر کو پسند کرنا:

اسی بارے میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا:

«يَا أَبَا ذَرٍّ، إِنِّي أُرَاكَ ضَعِيفًا، وَإِنِّي أُحِبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِي، لَا تَأَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ، وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ»[1]

''اے ابوذر! میں تمھیں کمزور سمجھتا ہوں اور میں تمھارے لیے وہ چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ لہٰذا تم دو آدمیوں کے امیر نہ بننا اور یتیم کے مال کی ذمہ داری قبول نہ کرنا۔''

نبی کریم ﷺ نے انھیں اس سے اس لیے منع کیا کہ آپ انھیں کمزور سمجھتے تھے اور آپ اِس چیز کو ہر کمزور کے لیے پسند کرتے تھے۔ جب کہ خود آپ ﷺ نے لوگوں کے امور کی ذمہ داری سنبھالی، کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدرت عطا کی تھی اور انھیں حکم دیا تھا کہ آپ تمام لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیں اور ان کے دینی وسیاسی امور کے ذمہ دار بنیں۔

ایک مرتبہ محمد بن واسع رحمہ اللہ اپنا ایک گدھا بیچنے کے لیے گئے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا: کیا آپ اسے میرے لیے پسند کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا: اگر میں اسے پسند کرتا ہوتا تو اسے بیچتا؟

یہ ان کی طرف سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے صرف وہ چیز پسند کرتے ہیں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور یہ سب عام مسلمانوں کے لیے خیر خواہی کے باب میں سے ہے جو کہ دین کے احکام میں شامل ہے۔

مومن اپنے مومن بھائی کی خوشی وغمی میں اس کے ساتھ ہوتا ہے:

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى»[2]

''مومنوں کی مثال، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے، ایک دوسرے پر ترس کھانے اور ایک دوسرے پر شفقت کرنے میں ایک جسم کی مانند ہے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم اس کے لیے بخار کے ساتھ تڑپ اٹھتا ہے اور اس کی وجہ سے بیدار رہتا ہے۔''

---

[1] مسلم، كتاب الإمارة، باب كراهة الإمارة بغير ضرورة، رقم الحديث: 17 (1825)

[2] البخاري، كتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، رقم الحديث (6011)، ومسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تراحم المؤمنين، رقم الحديث: 66 (2586) واللفظ له.

یہ حدیث اِس بات کی دلیل ہے کہ مومن کو ہر وہ چیز بری لگتی ہے جو اس کے مومن بھائی کو بری لگتی ہو اور وہ ہر اس چیز پر غمزدہ ہوتا ہے جس سے اس کا بھائی غمزدہ ہوتا ہو۔ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ، جس پر ہم اِس وقت گفتگو کر رہے ہیں، اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مومن کو ہر وہ بات اچھی لگتی ہے جو اس کے مومن بھائی کو اچھی لگتی ہو اور وہ اپنے مومن بھائی کے لیے ہر اس خیر کو پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور یہ سب تبھی ممکن ہے جب مومن کا سینہ دھوکے، خیانت اور حسد کے جذبات سے بالکل پاک ہو، کیونکہ حسد حاسد سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے اوپر کسی کی فوقیت یا اپنے سے کسی کی مساوات کو برداشت نہ کرے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ بس وہی اپنی خوبیوں کے ساتھ لوگوں پر ممتاز اور منفرد حیثیت کا حامل ہو، جبکہ ایمان کا تقاضا اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو خیر دی ہے اس میں کمی کے بغیر تمام مومن شریک ہوں۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس شخص کی تعریف کی ہے جو زمین میں بڑائی، کبر و غرور اور فساد کا طلبگار نہیں ہوتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ ﴾ [القصص: ۸۳]

''وہ آخرت کا گھر (جنت) ہم اسے دیں گے جو زمین پر اپنی بڑائی اور فساد نہیں چاہتے۔''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین میں سے عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ کا کہنا ہے کہ زمین میں بڑائی سے مراد: تکبر کرنا اور بادشاہوں کے ہاں عہدہ و منصب کا طلب کرنا ہے۔ اور فساد فی الأرض سے مراد: گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے۔ تاہم ایک حدیث میں اِس بات کی دلیل موجود ہے کہ جو شخص حسن و جمال میں اپنے اوپر کسی کی فوقیت کو ناپسند کرتا ہو وہ گناہگار نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اس وقت آپ کے پاس مالک بن مرارہ رہاوی رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ اسی دوران میں، میں نے ان کی زبانی سنا کہ وہ کہہ رہے تھے: اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے کہ مجھے کتنا جمال دیا گیا ہے، تو میں لوگوں میں سے کسی کے بارے میں پسند نہیں کرتا کہ وہ دو تسموں یا اس سے زیادہ کے ساتھ مجھ سے آگے نکل جائے، کیا یہ تکبر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، یہ تکبر نہیں ہے۔ تکبر تو وہ شخص کرتا ہے جو حق کو ٹھکرا دے اور لوگوں کو حقیر تصور کرے۔''[1]

[1] مسند أحمد (385/1) أبو داود، كتاب اللباس، باب ما جاء في الكبر، رقم الحديث: (4092) بلفظ « الكبر » بدل « البغي »

اِس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے وضاحت کر دی ہے کہ کوئی حسین وجمیل شخص اگر یہ ناپسند کرتا ہو کہ حسن وجمال میں کوئی دوسرا شخص اس سے فوقیت لے جائے تو یہ تکبر نہیں ہے۔ اِس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے تکبر کی وضاحت بھی کر دی کہ اس سے مراد حق بات کو ٹھکرانا، یعنی جب وہ اپنی خواہش کے خلاف ہو تو اس سے اپنے آپ کو بڑا تصور کرنا اور اسے قبول کرنے سے انکار کرنا ہے۔ اسی بنا پر بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ ''تواضع'' یہ ہے کہ آپ حق کو قبول کریں، اسے جو بھی لے کر آئے، خواہ وہ آپ سے چھوٹا کیوں نہ ہو اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو کامل اور دوسروں کو ناقص تصور کرے۔

لوگوں کے لیے خیر کی محبت ان کے عیبوں کی اصلاح پر آمادہ کرتی ہے:

مومن کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ مومنوں کے لیے اس چیز کو پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو اور ان کے لیے اس چیز کو ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہو۔ اور اگر وہ اپنے مسلمان بھائی میں کوئی دینی عیب دیکھے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ سلف صالحین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اللہ کے لیے محبت کرنے والے لوگ اللہ کے نور کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اللہ کے نافرمانوں پر شفقت کرتے ہیں۔ ان کے اعمال کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کی ذات پر ترس کھاتے ہوئے اور ان کے جسموں پر جہنم کی آگ کا خوف کھاتے ہوئے انھیں وعظ ونصیحت کرتے ہیں تاکہ وہ نافرمانیوں سے باز آجائیں۔

رشک نہ کہ حسد:

کوئی مومن اس وقت تک سچا مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ لوگوں کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ اگر وہ کسی دوسرے شخص میں کوئی ایسی خوبی دیکھے جو اس میں نہ ہو تو وہ اس جیسی خوبی کے حصول کی تمنا کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اگر وہ خوبی دینی ہو تو اس جیسی خوبی کی تمنا کرنا اچھی بات ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے لیے شہادت کی تمنا کی تھی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

«لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ»[1]

''صرف دو آدمی ہی قابلِ رشک ہیں: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا (اسے حفظ کرنے

[1] البخاري، كتاب التوحيد، باب قول النبي ﷺ: «رجل آتاه الله القرآن»، رقم الحديث (7529، 5025)، ومسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فضل من يقوم بالقرآن، رقم الحديث: 266 (815)

کی توفیق دی) اور وہ اس کے ساتھ دن اور رات کے اوقات میں قیام کرتا ہے، اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور وہ اسے دن اور رات کے اوقات میں خرچ کرتا ہے۔"

اور اگر وہ خوبی دنیوی ہو تو اس کی تمنا کرنے میں کوئی خیر نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ ﴾ [القصص: ۷۹۔ ۸۰]

"وہ اپنی قوم کے سامنے پورے تزک واحتشام کے ساتھ نکلا، تو جو لوگ دنیاوی زندگی کے خواہاں تھے، انھوں نے کہا: اے کاش! ہمارے پاس بھی ویسی ہی جائیداد ہوتی جیسی قارون کو دی گئی ہے، یقیناً وہ بڑی قسمت والا ہے۔ اور جو لوگ علم والے تھے انھوں نے کہا: تمھارے حال پر افسوس ہے! اللہ کا ثواب زیادہ بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرے۔"

دوسرے لوگ آپ جیسے ہوں یا آپ سے بہتر؟:

فضیل رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ لوگ آپ جیسے ہو جائیں تو آپ نے اپنے رب کے لیے خیر خواہی کا حق ادا نہیں کیا! چہ جائیکہ کہ آپ یہ پسند کریں کہ لوگ آپ سے کم تر ہوں!

مومن کو ہمیشہ اپنے آپ کو بلند درجات سے کم تر ہی سمجھنا چاہیے، اِس سے اسے دو اہم فائدے حاصل ہوں گے: اپنے آپ کو ناقص سمجھنا اور زیادہ سے زیادہ خوبیوں کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہنا۔ لہٰذا جو آدمی خود اپنے آپ سے ہی راضی نہ ہو تو وہ دوسرے مسلمانوں کے بارے میں یہ کیسے چاہے گا کہ وہ اس جیسے ہو جائیں! یقیناً وہ یہ چاہے گا کہ وہ اس سے بہتر ہو جائیں، اس لیے وہ انھیں نصیحت کرے گا اور وہ اپنے لیے یہ چاہے گا کہ اب جس حالت میں ہے وہ اِس سے بہتر حالت میں ہو جائے، لیکن اِس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسے جو چیز اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر عنایت کی ہو اس میں وہ لوگوں کی مشارکت کو پسند ہی نہ کرے، کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ "میں کتاب اللہ کی ایک آیت کو پڑھتا ہوں تو میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ کاش! سارے لوگ وہ چیز جان لیں جو میں اِس آیت کے حوالے سے جانتا ہوں۔" امام شافعی رحمہ اللہ کہتے تھے: "میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ بھی اِس علم کو حاصل کر لیں اور پھر میری طرف کچھ بھی منسوب نہ کیا جائے۔"

فوائدِ حدیث:

1. تکمیل ایمان کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مسلمان جو خیر و بھلائی اپنے لیے پسند کرتا ہو وہی خیر و بھلائی اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے بھی پسند کرے۔
2. اپنے بھائی کے لیے خیر کو پسند کرنے سے مسلمان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس چیز کو ناپسند کرے جس سے اسے اذیت پہنچے۔
3. اِس حدیث میں تواضع اور اچھے اخلاق کی ترغیب دی گئی ہے۔
4. مسلمان کا مسلمان پر ایک حق یہ ہے کہ وہ اسے نصیحت کرے اور اس سے دھوکا نہ کرے۔

سوالات:

1. راویِ حدیث کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ ذکر کریں۔
2. ''اسلام'' ایک معاشرتی دین ہے۔ اِس حدیث سے آپ نے جو کچھ سمجھا ہے اس کی روشنی میں اِس کی وضاحت کریں۔
3. الفاظِ نبویہ: «لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ» کا کیا معنی ہے؟ (وہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا۔ وہ ناقص ایمان والا ہوتا ہے۔ وہ نہ مسلمان ہے اور نہ ہی وہ مومن ہے۔)
4. ایمان قول وعمل کا نام ہے۔ یہ مفہوم آپ اِس حدیث سے کیسے سمجھ سکتے ہیں؟
5. درج ذیل کی تعریف کریں:

- تواضع: ....
- تکبر: ....
- حسد: ....
- غمط: ....



اسلام، نفس، دین اور معاشرے کی حفاظت کرتا ہے

(14) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَّا بِإِحْدٰى ثَلَاثٍ: اَلثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ»[1]

''کسی ایسے مسلمان کا خون حلال نہیں جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ ہاں تین میں سے ایک شخص کو قتل کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں: شادی شدہ زانی، قاتل اور دینِ (اسلام) کو چھوڑنے اور جماعت سے الگ ہونے والا۔''

حقِ اسلام:

اِس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ تینوں خصلتوں میں سے ہر خصلت حقِ اسلام ہے کہ جس کی بنا پر شہادتین کا اقرار کرنے والے آدمی کا خون بہانا اور اسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ اور اِس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

(1) شادی شدہ زانی:

تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ شادی شدہ سے مراد وہ شخص ہے جو نکاحِ صحیح کے ساتھ ایک بار دخول کر چکا ہو یا وہ عورت جس کو نکاحِ صحیح کے ساتھ دخول ہو چکا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز رضی اللہ عنہ اور غامدیہ رضی اللہ عنہا کو رجم کیا تھا۔[2]

اور قرآن مجید میں یہ الفاظ بھی تھے جو بعد میں منسوخ کر دیے گئے:

---

(1) البخاري، كتاب الديات، باب قول الله تعالىٰ: ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾، رقم الحديث (6878)، ومسلم، كتاب القسامة، باب ما يباح به دم المسلم، رقم الحديث: 25 (1676)

(2) مسلم، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنا، رقم الحديث: 22 (1695)

«اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ إِذَا زَنَیَا فَارْجِمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَکَالًا مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ»

''شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت جب زنا کریں تو انھیں ہر حال میں رجم کر دو، یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔''

جبکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رجم کے حکم کا استنباط قرآن مجید کی اِس آیت سے کیا ہے:

﴿ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ﴾ [المائدة: ١٥]

''اے اہل کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آ چکا ہے جو تمھارے لیے تمھاری ان بہت سی باتوں کی وضاحت کرتا ہے جنھیں تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں کو چھوڑ بھی دیتا ہے۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''پس جو شخص رجم کا انکار کرے تو اس نے گویا قرآن کا یوں انکار کر دیا کہ اسے پتا بھی نہ چلا۔'' پھر انھوں نے مذکورہ آیت پڑھی اور فرمایا: ''وہ جو کچھ چھپاتے تھے اس میں رجم بھی شامل ہے۔''

اور حدیثِ جابر میں دو یہودیوں کو رجم کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اسی حدیث میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ﴾ [المائدة: ٤٢]

''اگر یہ آپ کے پاس آ جائیں تو ان کے مابین فیصلہ کرو یا ان سے اعراض کرو۔ اور اگر آپ اعراض کریں گے تو بھی وہ آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ ہاں اگر آپ ان کے مابین فیصلہ کریں تو انصاف سے فیصلہ کیجیے۔''[1]

2 جان کے بدلے جان:

''جان کے بدلے جان'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک مکلف آدمی جب کسی جان کو عمداً ناحق قتل کرے تو اس کے بدلے میں اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اسی بات پر دلالت کرتا ہے:

﴿ وَ كَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ [المائدة: ٤٥]

''اور ہم نے ان پر تورات میں یہ بات لکھ دی تھی کہ جان کے بدلے جان ہوگی۔''

---

[1] أبو داود، کتاب الحدود، باب رجم الیهودیین، رقم الحدیث: (4452)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى ﴾ [البقرة: ١٧٨]

''اے ایمان والو! تم پر قتل (کے مقدمات) میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔''

تاہم ﴿ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ کے عموم سے کچھ صورتیں مستثنیٰ بھی ہیں اور وہ یہ ہیں:

1 والد اور اس کے بیٹے کے درمیان قصاص نہیں ہے:

اگر والد اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو جمہور اہلِ علم کا مسلک یہ ہے کہ اسے اس کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی بات سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ جبکہ مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر وہ اسے جان بوجھ کر قتل کرے اور اس کے ارادۂ قتل میں کوئی شک وشبہہ نہ ہو، مثلاً: وہ اسے ذبح کر دے تو اسے اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور اگر وہ اسے کسی عصا وغیرہ سے مارے جس کے نتیجے میں وہ مر جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

2 آزاد اور غلام کے درمیان قصاص نہیں ہے:

اگر ایک آزاد آدمی ایک غلام کو قتل کر دے تو اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے غلام کے علاوہ کسی اور کے غلام کو قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ یہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں کا مسلک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہ وہ اپنے غلام کو قتل کرے یا دوسرے کے غلام کو، دونوں حالتوں میں اسے قتل کیا جائے گا۔ یہ مسلک ثوری رحمہ اللہ سے مروی ہے اور اہل الحدیث کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے:

«مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهُ جَدَعْنَاهُ» [1]

''جو آدمی اپنے غلام کو قتل کرے گا تو ہم اسے قتل کر دیں گے اور جو اس کی ناک یا ہونٹ وغیرہ کو کاٹے گا تو ہم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔''

[1] سنن أبي داود، كتاب الديات، باب من قتل عبده أو مثل به ......، رقم الحديث (4515)، ابن ماجه، كتاب الديات، باب هل يقتل الحر بالعبد، رقم الحديث (2663)، الترمذي، كتاب الديات، باب ما جاء في الرجل يقتل عبده، رقم الحديث (1414)، مسند أحمد (5/19-18,11-10)

امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث میں طعن کیا ہے۔

جبکہ اِس بات پر تمام اہلِ علم کا اجماع ہے کہ غلاموں اور آزاد لوگوں کے مابین اطراف (آنکھ، ناک، کان اور دانت وغیرہ) کا قصاص نہیں ہے، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ عمل ہے۔ نیز قرآن مجید کے الفاظ ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ آزاد لوگوں کے ساتھ خاص ہیں، کیونکہ اس کے بعد اطراف میں قصاص کا ذکر ہے جو کہ آزاد لوگوں کے ساتھ ہی مختص ہے۔

3 مسلمان اور کافر کے مابین قصاص نہیں ہے:

اگر ایک مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے اور وہ حربی ہو تو اس کے بدلے میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اِس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ حربی کا قتل بلاشک جائز ہے۔ اور اگر وہ ذمی یا معاہد ہو تو اس کے بارے میں بھی جمہور اہلِ علم یہی کہتے ہیں کہ اس کے بدلے میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ صحیح بخاری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ»[1] ''کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔''

مرد و عورت کے مابین قصاص میں مساوات:

اگر ایک مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اِس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے اس یہودی کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا جس نے ایک بچی کو قتل کر دیا تھا۔[2]

3 مرتد کو قتل کیا جائے گا:

دین کو چھوڑنے اور جماعت سے الگ ہونے والے شخص سے مراد وہ آدمی ہے جو اسلام کو چھوڑ کر اس سے مرتد ہو جائے اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتین کا اقرار کرنے والوں میں سے جن کو مستثنیٰ کرتے ہوئے قتل کرنا جائز قرار دیا ان میں سے ایک یہ شخص بھی ہے، کیونکہ وہ مرتد ہونے سے قبل یقیناً اہلِ شہادتین ہی میں سے تھا، لیکن جب مرتد ہوا تو واجب القتل ٹھہرا۔ اسی لیے اسے توبہ کرنے کا موقع دیا جائے گا اور اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اسلام کی طرف واپس

---

[1] البخاري، كتاب الديات، باب لا يقتل المسلم بالكافر، رقم الحديث (6915) مطولًا

[2] البخاري، كتاب الديات، باب إذا قتل بحجر أو عصا، رقم الحديث (6877) ومسلم، كتاب القسامة، باب ثبوت القصاص في القتل بالحجر، رقم الحديث: 15 (1672)

لوٹ آئے۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شہادتین کا اقرار بھی کرتا ہو اور اسلام کا دعویدار بھی ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دین کا تارک اور جماعت سے الگ ہونے والا بھی ہو، مثلاً: وہ ارکانِ اسلام میں سے کسی ایک کا انکار کر دے، یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو گالی گلوچ کرے، یا بعض فرشتوں یا بعض نبیوں یا بعض آسمانی کتابوں کو، یہ جاننے کے باوجود کہ ان کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، ماننے سے انکار کر دے۔

صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ»[1] ''جو شخص اپنا دین تبدیل کر لے تو اس کو قتل کر دو۔''

اکثر علماء کے نزدیک اِس میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اگر عورت مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ جنگ کے دوران کافروں کی عورتوں کو قتل نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف ان کے مردوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک اچانک آنے والا کفر اصلی کفر کی مانند ہی ہے۔

جبکہ جمہور اہلِ علم ان دونوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اچانک آنے والا کفر زیادہ سنگین ہے، کیونکہ اس سے پہلے اسلام ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے مرتد ہونے پر وہ شخص بھی قتل کر دیا جاتا ہے جو حربی لوگوں میں سے قتل نہیں کیا جاتا، مثلاً: بوڑھا، اپاہج اور اندھا، جنھیں جنگ میں قتل نہیں کیا جاتا۔

مرتد کی توبہ قابلِ قبول ہے:

نبی کریم ﷺ کے یہ الفاظ: «اَلتَّارِكُ لِدِينِهِ وَالْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ» ''دین کا تارک اور جماعت سے الگ ہونے والا'' اِس بات کی دلیل ہیں کہ اگر وہ توبہ کر لے اور اسلام کی طرف واپس لوٹ آئے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ دین کی طرف واپس لوٹنے کے بعد اس کا تارک نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ جماعت کو چھوڑنے والا ہوگا۔

رہا مرتد تو وہ اس لیے قتل کیا جائے گا کہ اس میں وہ وصف موجود ہے جس کی بنا پر اس کا خون بہانا حلال ہے اور وہ ہے اس کا دین کو ترک کرنا اور جماعت کو چھوڑنا۔ لہٰذا اگر وہ دینِ اسلام کی طرف واپس لوٹ آئے اور مسلمانوں کی جماعت میں ہی رہے تو وہ وصف ختم ہو جائے گا جس کے ساتھ اس کا خون بہانا جائز ٹھہرا تھا، لہٰذا وہ مباح الدم نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

[1] البخاري، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين، باب حكم المرتد والمرتدة، رقم الحديث (6922)

تارکِ نماز:

بہت سارے علماء کے نزدیک تارکِ نماز کو قتل کیا جائے گا، باوجودیکہ وہ اسے کافر نہیں کہتے اور یہ مسئلہ حدیث نمبر آٹھ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔

مسلمانوں کے حکمران کے خلاف بغاوت کرنے والا:

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلَى رَجُلٍ وَّاحِدٍ، يُرِيدُ أَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ، أَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوهُ»[1]

''جو شخص تمھارے پاس اس وقت آئے جب تم ایک حکمران پر متفق ہو، تاکہ وہ تمھارے درمیان انتشار پیدا کرے اور تمھاری جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو تم اسے قتل کر دینا۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: «فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ» ''وہ کوئی بھی ہو اس کا سر تن سے جدا کر دو۔''[2]

جاسوس:

کوئی مسلمان اگر مسلمانوں کے خلاف کافروں کے لیے جاسوسی کرے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ جن اہلِ علم نے اس کو قتل کرنا جائز قرار دیا ہے انھوں نے اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے جب اہلِ مکہ کو ایک خط بھیجا تھا جس میں انھوں نے انھیں نبی کریم ﷺ کی ان کی طرف روانگی کی خبر دی تھی اور انھیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی تلقین بھی کی تھی تو اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں قتل کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ تب رسول اکرم ﷺ نے جواب دیا تھا کہ ''وہ بدری صحابی ہیں۔''[3]

رسول اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر ان کا خون بہانا جائز ہو، بلکہ آپ ﷺ نے انھیں قتل نہ کرنے کی ایک علت بیان کی اور وہ یہ تھی کہ وہ بدری صحابی ہیں اور تمام اہلِ بدر کو اللہ تعالیٰ معاف کر چکا ہے۔ یہ علت بعد میں آنے والے لوگوں میں نہیں پائی جاتی۔

---

[1] مسلم، كتاب الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين، رقم الحديث: 60 (1852)

[2] مسلم، كتاب الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين، رقم الحديث: 59 (1852)

[3] حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا پورا قصہ دیکھیے: البخاري، كتاب الجهاد، باب الجاسوس، رقم الحديث (3007)، ومسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل أهل بدر، رقم الحديث: 161 (2414) من حديث علي رضی اللہ عنہ مطولاً.

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اِس بات پر مشتمل ہے کہ کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں، سوائے اس کے کہ وہ تین میں سے کسی ایک کام کا ارتکاب کرے: یا تو وہ اپنے دین کو چھوڑ دے اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے، یا وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے، یا وہ کسی جان کو ناحق قتل کرے۔ یہی وہ تین انواع ہیں جن میں کسی مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے، اِس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے۔

شادی شدہ زانی کو قتل کرنے کی حکمت:

شادی کرنے کے بعد کسی کی عزت کو پامال کرنا انتہائی سنگین گناہ ہے، کیونکہ شادی شدہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہوتا ہے کہ وہ شادی کے بعد جائز طریقے سے اپنی شہوت کو پورا کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس پر اکتفا نہیں کرتا اور حرام طریقہ اختیار کرتا ہے تو یقیناً وہ زندہ رہنے کا حقدار نہیں ہے۔ اب (رجم کے ذریعے) اس کا خون بہانا لازم ہے۔

کیا ڈاکا زنی کرنے والے کا خون بھی مباح ہے؟

محض ڈاکا زنی کی بنا پر ڈاکو کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ ڈاکا زنی کے دوران ان لوگوں کا قتل بھی ممکن ہوتا ہے جنھیں قتل کرنا حرام ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان قابلِ غور ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾

[المائدۃ: ۳۲]

”جس شخص نے کسی دوسرے کو جان کے بدلہ کے علاوہ یا زمین میں فساد بپا کرنے کی غرض سے قتل کیا تو اس نے گویا سب لوگوں کو مار ڈالا۔“

اِس آیت کریمہ میں کسی جان کا قتل دو اسباب کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے: قتل اور فساد فی الأرض۔ اور فساد فی الأرض میں ڈاکا زنی، مرتد ہونا اور بدکاری کرنا بھی شامل ہے۔

قرآن مجید کی توہین کرنے والا:

اگر کوئی شخص قرآن مجید کی توہین کرے اور اسے گندی چیزوں میں پھینک دے، یا دین میں جو احکامات بدیہی طور پر معلوم ہوتے ہیں، مثلاً: نماز وغیرہ کہ جن میں سے کسی ایک کا انکار دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے، اگر کوئی شخص اس کا انکار کر دے تو یقیناً وہ بھی واجب القتل ہوتا ہے۔

بدعت کی طرف دعوت دینے والا:

اسی طرح جو شخص بدعت کی طرف دعوت دینے والا ہو تو اس کے بارے میں بھی بہت سارے علماء نے یہی کہا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے، کیونکہ ایسا کرنا دین سے نکلنے کے مترادف ہے اور اس کی طرف ایک وسیلہ بھی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنی بدعت کے ساتھ مخفی ہو اور کسی کو اس کی طرف دعوت نہ دیتا ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو چھپے ہوئے منافقوں کا ہے۔ جب وہ اس کی طرف باقاعدہ طور پر دعوت دے تو اس کا جرم سنگین ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے امت کے دین کو بگاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے خارجیوں سے قتال کرنے اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔[1]

اور خوارج کے بارے میں اہلِ علم کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کا کیا حکم ہے، چنانچہ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ وہ کفار ہیں اور ان کا قتل بھی ان کے کفر کی وجہ سے ہو گا اور بعض کا کہنا ہے کہ انھیں اِس لیے قتل کیا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کا خون بہا کر اور انھیں کافر قرار دے کر زمین میں فساد بپا کرتے ہیں۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ اور بعض حنبلیوں کا مسلک ہے اور وہ اجازت دیتے ہیں کہ ان کے خلاف جنگ کی ابتدا کی جاسکتی ہے اور ان میں جو زخمی ہو اسے مارا جاسکتا ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ اگر وہ اپنے نظریات کی طرف دعوت دیں تو ان سے قتال کیا جائے گا اور اگر وہ اپنے نظریات کا اعلان تو کریں، لیکن دوسرے لوگوں کو ان کی طرف دعوت نہ دیں تو ان سے قتال نہیں کیا جائے گا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ان سے قتال کی ابتدا نہیں کی جاسکتی جب تک وہ خود اس کی ابتدا نہ کریں، یا وہ ایسا کام نہ کریں جس کی بنا پر ان سے قتال کرنا جائز ہو جائے، مثلاً: ناجائز طور پر قتل کرنا وغیرہ۔

کیا یہ نصوص محکم ہیں یا منسوخ؟

بہت سارے علماء درج بالا نصوص میں سے بہت سی نصوص کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ساتھ منسوخ ہیں، لیکن اِس قول میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

1. سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ درج بالا نصوص سے متاخر تھی، جبکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ پرانے مہاجروں میں سے ایک تھے۔ اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان نصوص

[1] البخاري، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين، باب قتل الخوارج والملحدين، رقم الحديث (6930-6931) ومسلم، كتاب الزكاة، باب التحريض على قتل الخوارج، رقم الحديث: 154 (1066)

کو روایت کیا ہے ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے بہت بعد میں اسلام قبول کیا، مثلاً:
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

2. خاص کو عام کے ساتھ منسوخ نہیں کیا جاتا اگرچہ عام اس سے متاخر کیوں نہ ہو۔ یہی جمہور علماء کا صحیح مسلک ہے۔ کیونکہ خاص کی اپنے معنی پر دلالت نصی ہوتی ہے، جبکہ عام کی اپنے معنی پر دلالت اکثر علماء کے نزدیک ظاہری ہوتی ہے، لہٰذا ظاہر ایک نص کے حکم کو منسوخ نہیں کر سکتا۔

فوائدِ حدیث:

1. حدیث میں جو جرائم مذکور ہیں ان کی سزا میں مرد وعورت سب برابر ہیں۔
2. قتلِ عمد میں جانیں برابر ہوتی ہیں، لہٰذا ہر مقتول کے لیے اس کے قاتل سے بدلہ لیا جائے گا۔
3. یہ حدیث انسانی ضرورتوں کی حفاظت کرنے کا حکم دیتی ہے اور وہ ہیں: جان، عزت اور دین کی حفاظت اور یہی چیزیں اسلام کا وہ حق ہیں جن کی بنا پر کسی کا خون بہانا جائز ہوتا ہے۔
4. اِس حدیث نے ان جرائم کی تحدید کر دی ہے جن کی سزا قتل ہے۔ اور انھی جرائم پر ان جرائم کو بھی قیاس کیا جائے گا جو ان جرائم تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں جن کی سزا متعین کر دی گئی ہے۔
5. قصاص میں فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے زندگی ہے۔

سوالات:

1. ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ کے عموم سے کچھ صورتیں مستثنیٰ ہیں، انھیں ذکر کریں۔
2. ڈاکا زنی کرنے والے شخص کو قتل کرنا جائز ہے، اس کے اسباب ذکر کریں۔
3. جن اعمال کی وجہ سے کسی مسلمان کو مرتد قرار دیا جا سکتا ہے ان میں سے تین ذکر کریں۔
4. بدعت کی طرف دعوت دینے والے شخص کا کیا حکم ہے؟



ایمان اور مکارمِ اخلاق

(15) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ»[1]

''جو شخص اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ خیر ہی کی بات کرے، ورنہ خاموش رہے۔ اور جو شخص اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ اور جو شخص اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''

اس حدیث کو امام بخاری و مسلم رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مختلف طرق کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں: «فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ» ''تو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔''[2]

جب کہ بعض طرق میں پڑوسی کے بجائے یہ الفاظ ہیں: «فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ» ''تو وہ اپنے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔''[3]

کلام یا خاموشی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ ....'' یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ خصلتیں ایمان کی خصلتوں میں سے ہیں اور یہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں۔

---

(1) البخاري، كتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر......، رقم الحديث (6018-6019) ومسلم، كتاب الإيمان، باب الحث على إكرام الجار، رقم الحديث: 74 (47)

(2) البخاري، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم الحديث (6475) ومسلم، كتاب الإيمان، باب الحث على إكرام الجار، رقم الحديث: 75 (47)

(3) البخاري، كتاب الأدب، باب إكرام الضيف، رقم الحديث (6138)

نبی کریم ﷺ نے ایمان کی تشریح صبر اور سماحت کے ساتھ بھی کی ہے جس کے بارے میں حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صبر سے مراد گناہوں سے بچنا اور سماحت سے مراد نیکیاں کرنا ہے۔ اعمالِ ایمان بعض اوقات حقوق اللہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، مثلاً: فرائض وواجبات کو ادا کرنا اور محرمات کو ترک کرنا۔ اسی میں خیر کی بات کرنا اور باقی ہر بات سے خاموشی اختیار کرنا بھی شامل ہے۔ اور بعض اوقات وہ حقوق العباد کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، مثلاً: مہمان کا اکرام کرنا، پڑوسی کی عزت افزائی کرنا اور اس کو اذیت سے بچانا۔

سو یہ تین امور ہیں جن کا مومن کو حکم دیا گیا ہے:

1- خیر کی بات کرنا اور باقی ہر بات سے خاموشی اختیار کرنا:

ایک حدیث میں آیا ہے کہ زبان کی استقامت خصالِ ایمان میں سے ہے۔ جیسا کہ مسند احمد میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَسْتَقِيمُ إِيمَانُ عَبْدٍ حَتَّى يَسْتَقِيمَ قَلْبُهُ، وَلَا يَسْتَقِيمُ قَلْبُهُ حَتَّى يَسْتَقِيمَ لِسَانُهُ»[1]

''کسی بندے کا ایمان سیدھا نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل سیدھا نہ ہو اور اس کا دل سیدھا نہیں ہوسکتا جب تک اس کی زبان سیدھی نہ ہو۔''

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَمَتَ نَجَا»[2] ''جو شخص خاموش رہے وہ نجات پا جاتا ہے۔''

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بے شک ایک بندہ ایک لفظ بولتا ہے جس کے بارے میں اسے پتا نہیں ہوتا کہ اس میں کیا وبال ہے! لیکن وہ اس کی وجہ سے مشرق ومغرب کے درمیان جو مسافت ہے اس سے بھی زیادہ جہنم میں نیچے چلا جاتا ہے۔''[3]

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ ''وہ خیر کی بات کرے یا خاموش رہے۔'' اس میں خیر ہی کی بات کرنے کا اور اس کے سوا ہر بات سے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی ایسا کلام نہیں

---

[1] مسند أحمد (198/3)

[2] مسند أحمد (159/2)

[3] البخاري، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم الحديث (6477) ومسلم، كتاب الزهد، باب التكلم بالكلمة، رقم الحديث: 49 (2988)

پایا جاتا جس کا بولنا اور اس سے خاموش رہنا برابر ہو، بلکہ یا تو وہ کلامِ خیر ہوگا جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یا وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کلام ہوگا جس سے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ [ق: ۱۷۔ ۱۸]

''جب عمل جمع کرنے والے دو فرشتے دائیں اور بائیں بیٹھے تمام اعمال جمع کرتے رہتے ہیں۔ آدمی جب بھی کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے تو اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے، جو اسے لکھ لیتا ہے۔''

سلف صالحین کا اِس بات پر اجماع ہے کہ جو فرشتہ دائیں جانب ہوتا ہے وہ اس کی نیکیوں کو لکھتا ہے اور جو اس کی بائیں جانب ہوتا ہے وہ اس کی برائیوں کو لکھتا ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ إِلَى الصَّلَاةِ، فَلَا يَبْصُقْ أَمَامَهُ، فَإِنَّمَا يُنَاجِي اللّٰهَ مَا دَامَ فِي مُصَلَّاهُ، وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، فَإِنَّ عَنْ يَمِينِهِ مَلَكاً »[1]

''تم میں سے کوئی شخص جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ اپنے سامنے نہ تھوکے، کیونکہ وہ جب تک اپنی جائے نماز میں کھڑا رہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اپنی دائیں جانب تھوکے کیونکہ اس کے دائیں جانب ایک فرشتہ ہوتا ہے۔''

کیا ہر چیز لکھی جاتی ہے؟:

علمائے کرام کے مابین اِس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ انسان جو کچھ بولتا یا جو کچھ لکھتا ہے کیا سب لکھا جاتا ہے یا صرف وہ چیز لکھی جاتی ہے جس میں جزا یا سزا ہوتی ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ''انسان کی ہر بات نوٹ کی جاتی ہے چاہے وہ خیر ہو یا شر، حتی کہ اس کی یہ باتیں بھی لکھی جاتی ہیں کہ میں نے کھایا، میں نے پیا، میں گیا، میں آیا۔ حتی کہ جب جمعرات کا دن آتا ہے تو اس کے قول و عمل کو پیش کیا جاتا ہے، پھر جس میں خیر یا شر کا پہلو ہوتا ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے اور باقی سب کچھ مٹا دیا جاتا ہے۔

---

[1] البخاري، كتاب الصلاة، باب دفن النخامة في المسجد، رقم الحديث (416)، ومسلم، كتاب المساجد، باب النهي عن البصاق في المسجد، رقم الحديث: 50 (547)

اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ [الرعد: ۳۹]

''اللہ جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہے برقرار رکھتا ہے اور اصلی کتاب اسی کے پاس ہے۔''

اور یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی گدھے پر سوار ہوا تو وہ پھسل گیا، اس نے کہا: گدھا ہلاک ہو۔ چنانچہ دائیں جانب والے فرشتے نے کہا: نہ یہ نیکی ہے جس کو میں نوٹ کروں اور بائیں جانب والے فرشتے نے کہا: نہ یہ برائی ہے جس کو میں لکھ لوں تو اللہ تعالیٰ نے بائیں جانب والے فرشتے کی طرف وحی کی کہ جس چیز کو دائیں جانب والا فرشتہ چھوڑ دے اسے تم لکھ لیا کرو۔ لہٰذا اس نے برائیوں میں یہ لکھ دیا: گدھا ہلاک ہو۔

اِس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو نیکی نہ ہو وہ برائی ہوتی ہے، اگرچہ اس پر سزا نہ ملے۔ کیونکہ بعض برائیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کوئی سزا نہیں ہوتی اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کی بنا پر انھیں معاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جن اوقات میں کوئی شخص ان برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے وہ ان اوقات کو برباد کرنے کی وجہ سے قیامت کے روز حسرت وافسوس کا اظہار کرے گا اور یہ بھی ایک قسم کی سزا ہی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو لوگ کسی ایسی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوں جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہو تو وہ گویا ایک مردہ گدھے کی لاش پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ مجلس ان کے لیے باعثِ حسرت ثابت ہوگی۔''[1]

اسی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس گفتگو میں خیر کا کوئی پہلو نہ ہو اس سے خاموش رہنا ہی بہتر ہے، الا یہ کہ گفتگو کرنا نہایت ہی ضروری ہو جائے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جس کا کلام زیادہ ہو اس کی غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں اور جس کی غلطیاں زیادہ ہوں اس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اور جس کے گناہ زیادہ ہوں اس کے لیے جہنم کی آگ ہی بہتر ہے۔''

---

[1] مسند أحمد (389/2)، أبو داود، كتاب الأدب، باب كراهية أن يقوم الرجل من مجلسه ولا يذكر الله، رقم الحديث (4855)، النسائي في الكبرىٰ، كتاب عمل اليوم والليلة، باب من جلس مجلسا لم يذكر الله فيه، رقم الحديث (10241) مع اختلاف يسير في لفظه عند النسائي.

ایک شخص نے سلمان سے کہا: مجھے وصیت کیجیے۔ انھوں نے کہا: ''تم بالکل خاموش رہا کرو۔'' اس نے کہا: جو شخص بالکل ہی خاموش رہے تو وہ لوگوں میں زندگی ہی نہیں گزار سکتا! انھوں نے کہا: ''اگر تمھیں بولنا ہی ہو تو حق کے ساتھ بولنا ورنہ خاموش رہنا۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں! زمین پر سب سے زیادہ عرصہ جو چیز جیل خانے میں جکڑ کر رکھے جانے کے قابل ہے وہ زبان ہے۔''

مقصد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر کے بارے میں ہی گفتگو کرنے اور جو خیر نہ ہو اس کے بارے میں خاموش رہنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا نہ تو ہمیشہ کلام کا حکم ہے اور نہ ہی ہمیشہ خاموش رہنے کا۔ بلکہ خیر کے بارے میں گفتگو کرنا اور شر سے خاموش رہنا لازم ہے۔

شر سے خاموش رہنا ایک اچھی عادت ہے:

سلف صالحین شر سے اور بے مقصد بات سے خاموش رہنے کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے، کیونکہ بے مقصد گفتگو کو چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے، اسی لیے لوگ اِس قسم کی گفتگو بہت زیادہ کرتے ہیں، چنانچہ سلف صالحین جدوجہد کرتے تھے اور اپنے آپ کو بے مقصد گفتگو سے خاموش رہنے پر مجبور کرتے تھے۔

ابن مبارک رحمہ اللہ سے لقمان علیہ السلام کے اِس مقولہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ ''اگر کلام چاندی ہے تو خاموشی سونا ہے۔'' تو انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ کی اطاعت کے متعلق گفتگو کرنا چاندی ہے تو اللہ کی معصیت کے بارے میں گفتگو نہ کرنا سونا ہے۔ اِس بات کی دلیل ہے کہ معاصی سے باز رہنا طاعات پر عمل کرنے سے افضل ہے۔

ایک مرتبہ سیدنا احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے اِس بارے میں مذاکرہ کیا کہ کیا خاموشی افضل ہے یا بولنا؟ تو ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ''خاموشی افضل ہے۔'' تو سیدنا احنف رضی اللہ عنہ نے کہا: بولنا افضل ہے، کیونکہ خاموشی کی فضیلت خاموش رہنے والے تک ہی رہتی ہے، جبکہ اچھی گفتگو کا فائدہ نہ صرف گفتگو کرنے والے کو ہوتا ہے، بلکہ سننے والا بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس بیٹھے ہوئے ایک عالم نے کہا: علم ہونے کے باوجود خاموش رہنے والا شخص ایسے ہی ہے جیسے علم پر مبنی گفتگو کرنے والا شخص ہو۔ تو انھوں نے کہا: مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز ان دونوں میں سے وہ شخص زیادہ بہتر حالت میں ہوگا جو علم پر مبنی گفتگو کرنے والا ہو، کیونکہ اس کا فائدہ

لوگوں کو ہوتا ہے اور خاموش رہنے والے کی خاموشی کا فائدہ بس اسی کو ہوتا ہے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! گفتگو کرنے کی وجہ سے جو فتنہ ہوگا اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ تب سیدنا عمر رحمہ اللہ بہت زیادہ رونے لگے۔

ایک دن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اِس قدر موثر خطبہ دیا کہ لوگوں کے دل نرم ہوگئے اور وہ رونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے خطبہ روک دیا۔ انھیں کہا گیا: کاش آپ اپنی گفتگو مکمل کریں، شاید اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے ذریعے فائدہ پہنچائے۔ تو انھوں نے کہا: بولنا فتنہ ہے اور عمل کرنا مومن کے لیے صرف بولنے سے بہتر ہے۔

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے بہت پہلے امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو خواب میں دیکھا تھا اور اسی مسئلے میں ان کی گفتگو کو بھی سنا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان سے اس سلسلے میں بات چیت بھی کی تھی اور ان کی گفتگو سے میں نے یہ سمجھا تھا کہ خیر کے بارے میں گفتگو کرنا خاموشی سے افضل ہے۔ شاید انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران سلیمان بن عبدالملک کا بھی ذکر کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ انھیں یہ بات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بتائی تھی۔

سلیمان بن عبدالملک کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ''خاموشی عقل کی نیند اور بولنا اس کی بیداری ہے۔''

کیا خوب کہا ہے عبیداللہ بن ابی جعفر نے، جو کہ اپنے زمانے میں اہلِ مصر کے فقیہ تھے اور ان کا حکماء میں شمار ہوتا تھا: ''جب آدمی کسی مجلس میں گفتگو کر رہا ہو اور اسے اپنی گفتگو اچھی لگنے لگے تو اسے خاموش ہو جانا چاہیے۔ اور جب وہ خاموش بیٹھا ہو اور اسے اپنی خاموشی بھلی لگنے لگے تو اسے گفتگو شروع کر دینی چاہیے۔'' بہرحال ہمیشہ خاموش رہنا اور اسے عبادت تصور کرنا درست نہیں ہے۔ خاص طور پر عبادات میں، مثلاً: حج، اعتکاف اور روزہ وغیرہ میں خاموش رہنا تو ممنوع ہے۔ اسی لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو جس نے خاموشی کے ساتھ حج کیا، کہا تھا: ''یہ جائز نہیں ہے اور جاہلیت کے امور میں سے ہے۔''[1]

2- پڑوسی کا حق اور اس کا تقدس:

اِس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے مومنوں کو جو دوسرا حکم دیا ہے وہ ہے: پڑوسی کی عزت افزائی کرنا اور بعض روایات میں اسے اذیت پہنچانے سے منع فرمایا۔ پڑوسی کو اذیت پہنچانا حرام ہے، کیونکہ کسی عام آدمی کو ناجائز طور پر تکلیف پہنچانا تو حرام ہے ہی لیکن پڑوسی کے حق میں اس کی حرمت اور زیادہ سخت ہے۔

[1] البخاري، كتاب مناقب الأنصار، باب أيام الجاهلية، رقم الحديث (3834)

صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہ کہ تم اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔'' کہا گیا: پھر کون سا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے بیٹے کو اس لیے قتل کر دو کہ وہ (بڑا ہو کر) تمھارے ساتھ کھائے گا۔'' کہا گیا: پھر کون سا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو۔''[1]

مسند احمد میں سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: حرام ہے، اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور وہ قیامت تک حرام رہے گا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کسی آدمی کا اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے کہیں زیادہ سنگین گناہ ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم چوری کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' تو انھوں نے کہا: حرام ہے، اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور وہ قیامت تک حرام رہے گی۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کسی آدمی کا اپنے پڑوسی کے گھر سے چوری کرنا دس گھروں میں سے چوری کرنے سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔''[2]

صحیح بخاری میں سیدنا ابو شریح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتا، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتا، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتا۔'' پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔''[3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو بتایا گیا کہ فلاں عورت رات کو قیام کرتی اور دن کو روزہ رکھتی ہے۔ اِس کے علاوہ اور کئی نیک کام اور صدقہ وغیرہ بھی کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کے ساتھ اپنے پڑوسیوں کو ایذا بھی پہنچاتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ وہ جہنم والوں میں سے ہے۔'' پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کو بتایا کہ فلاں عورت صرف فرض نمازیں پڑھتی ہے، رمضان کے روزے رکھتی ہے، پنیر کے ٹکڑوں کے ساتھ صدقہ کرتی ہے، اس کے

---

[1] البخاري، كتاب التفسير، باب قوله تعالىٰ: ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا﴾ رقم الحديث (4477)، ومسلم، كتاب الإيمان، باب كون الشرك أقبح الذنوب، رقم الحديث: 141 (86)

[2] مسند أحمد (8/6)

[3] رواه البخاري، كتاب الأدب، باب إثم من لا يأمن جاره بوائقه، رقم الحديث (6016)

علاوہ کوئی اور عبادت نہیں کرتی لیکن وہ کسی پڑوسی وغیرہ کو ایذا نہیں پہنچاتی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جنت والوں میں سے ہے۔''[1]

رہا پڑوسی کا اکرام اور اس سے اچھا سلوک تو شریعت میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا﴾ [النساء: ٣٦]

''اور تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، نیز رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، پہلو کے ساتھی، مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور شیخی خوروں کو پسند نہیں کرتا۔''

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بندے پر اپنے حق کا اور بندوں کے حقوق کا ذکر کیا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ اپنی دعا میں یوں کہا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ جَارِ السُّوْءِ فِي دَارِ الْمُقَامَةِ، فَإِنَّ جَارَ الْبَادِيَةِ يَتَحَوَّلُ»[2]

''میں اپنی مستقل رہائش گاہ پر برے پڑوسی سے تیری پناہ چاہتا ہوں، کیونکہ دیہات کا پڑوسی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔''

پڑوسیوں میں حسنِ سلوک کا سب زیادہ مستحق کون؟:

مسند بزار میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''پڑوسی تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک، وہ جس کے لیے صرف ہمسایہ ہونے کا حق ہوتا ہے اور اس کا حق سب سے کم ہوتا ہے۔ دوسرا، وہ جس کے دو حق ہوتے ہیں اور تیسرا وہ جس کے تین حقوق ہوتے ہیں اور وہ حق کے لحاظ سے سب سے افضل پڑوسی ہوتا ہے۔ چنانچہ جس پڑوسی کا ایک ہی حق ہوتا ہے وہ مشرک پڑوسی ہے جو رشتہ دار نہیں ہوتا، اس کے لیے صرف ہمسایہ

---

[1] رواہ أحمد في المسند: (440/2) والحاکم في المستدرك (166/4)

[2] ابن حبان في صحيحه، (307/3)، رقم الحديث (1033)، البخاري في الأدب المفرد، باب الجار السوء، رقم الحديث (117) بلفظ: "فإن جار الدنيا يتحول"، وإسناده حسن.

ہونے کا حق ہے اور جس کے لیے دو حق ہیں وہ وہ مسلمان پڑوسی ہے جس کے لیے ایک تو ہمسایہ ہونے اور دوسرا مسلمان ہونے کا حق ہے اور جس کے لیے تین حقوق ہیں وہ وہ مسلمان پڑوسی ہے جو قرابت دار بھی ہو۔ اس کے لیے ایک تو ہمسایہ ہونے، دوسرا مسلمان ہونے اور تیسرا قرابت دار ہونے کا حق ہے۔''[1]

یہ حدیث دیگر کئی طرق سے بھی مروی ہے، ان میں سے کچھ متصل ہیں اور کچھ مرسل، لیکن سب کے سب محدثین کے کلام سے خالی نہیں ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا: میرے دو پڑوسی ہیں، لہٰذا میں ان میں سے کس کو ہدیہ دوں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کے گھر کا دروازہ تم سے زیادہ قریب ہو۔''[2]

پڑوس کی حد:

سلف صالحین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ پڑوس کی حد چالیس گھروں تک ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر جانب (دائیں، بائیں، سامنے اور پیچھے) سے چالیس گھروں تک پڑوس ہوتا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ اسی بات کے قائل ہیں۔

بوقتِ ضرورت پڑوسی سے ہمدردی:

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی ایک صورت یہ ہے کہ جب وہ ضرورت مند ہو تو اس سے ہمدردی کی جائے۔ مسند احمد میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَشْبَعُ الْمُؤْمِنُ دُونَ جَارِهِ»[3] ''مومن اپنے پڑوسی کو چھوڑ کر سیر نہیں ہوتا۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے میرے خلیل جناب محمد ﷺ نے وصیت کی کہ ''جب تم شوربے والا سالن بناؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈال لیا کرو، پھر معروف طریقے کے مطابق اپنے پڑوسیوں کو بھی اس میں سے دیا کرو۔''[4]

---

[1] أخرجه البزار، كشف الأستار (280/2)

[2] البخاري، كتاب الشفعة، باب أي الجوار أقرب، رقم الحديث (2259)

[3] مسند أحمد (54/1) وفيه ضعف.

[4] مسلم، كتاب البر والصلة، باب الوصية بالجار، رقم الحديث: 143 (2625)

اور سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک بکری ذبح کی، پھر اپنے گھر والوں سے پوچھا: کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی کچھ دیا؟ یہ سوال انھوں نے تین بار کیا۔ اس کے بعد کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ ''مجھے جبریل علیہ السلام نے پڑوسی کے متعلق اتنی مرتبہ وصیت کی ہے کہ مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ شاید وہ اسے وارث قرار دے دیں گے۔''[1]

صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اپنے پڑوسی کو اس سے منع نہ کرے کہ وہ اس کی دیوار میں لکڑی گاڑے۔''[2]

پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''تمھیں میں اِس حکم سے اعراض کرتے ہوئے کیوں دیکھتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں یہ لکڑیاں تمھارے کندھوں کے درمیان ماروں گا۔''

امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اِس حدیث کی بنا پر پڑوسی پر لازم ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں لکڑی گاڑنے کا موقع دے، اگر اس کو اس کی ضرورت ہو اور اس کا نقصان نہ ہو۔

پڑوسی کو نقصان پہنچانا ممنوع ہے:

امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ پڑوسی کو اپنی ملکیتِ خاص میں اِس طرح تصرف نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے اس کے پڑوسی کا نقصان ہو۔ لہٰذا ان کے نزدیک پڑوسی سے ہر قسم کی اذیت کو دور رکھنا واجب ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ خود تو فائدہ اٹھائے اور اس کے پڑوسی کا نقصان ہو چاہے فائدہ اٹھانے والا اپنی ملکیتِ خاص سے ہی فائدہ کیوں نہ اٹھا رہا ہو۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک پڑوسی پر واجب ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ہر وہ چیز مہیا کرے جس کا وہ محتاج ہو اور اسے اس کے مہیا کرنے میں کوئی نقصان نہ ہو۔ ان دونوں باتوں سے اعلیٰ درجہ اِس بات کا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی اذیتوں پر صبر کرے اور اذیت کا مقابلہ اذیت سے نہ کرے۔

حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں:

---

[1] مسند أحمد (160/2) والترمذي، كتاب البر والصلة، باب ما جاء في حق الجوار، رقم الحديث (1943)، وهو في الصحيحين من حديث عائشة بدون القصة

[2] البخاري، كتاب المظالم، باب لا يمنع جار جاره أن يغرز خشبة، رقم الحديث (2463) ومسلم، كتاب المساقاة، باب غرس الخشب في جدار الجار، رقم الحديث: 136 (1609) واللفظ له.

''اچھا پڑوس یہ نہیں ہے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، بلکہ اچھا پڑوس یہ ہے کہ اپنے پڑوسی کی اذیت کو برداشت کرو۔''

3- مہمان کا اکرام کرنا ایمان کی ایک خصلت ہے:

اِس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے مومنوں کو جو تیسرا حکم دیا ہے وہ ہے: مہمان کا اکرام کرنا، یعنی اس کی مہمان نوازی اچھی طرح سے کرنا۔

صحیحین میں ابو شریح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری آنکھوں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا اور میرے کانوں نے سنا جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ ......»

''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے مہمان کو اس کا انعام دیتے ہوئے اس کا خوب اکرام کرے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یا رسول اللہ! اس کا انعام کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دن اور ایک رات۔''

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''مہمان نوازی تین دن تک ہے، اس کے بعد جو کچھ ہو وہ صدقہ ہے۔''[1]

اسی طرح کی حدیث مسند احمد میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعا مروی ہے۔[2]

ان تمام احادیث میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مہمان کا انعام ایک دن اور رات ہے اور مہمان نوازی تین دن ہے۔ گویا آپ ﷺ نے انعام اور مہمان نوازی میں فرق کیا اور انعام پر زیادہ زور دیا۔ اور اِس سلسلے میں کچھ اور احادیث بھی وارد ہیں۔

صحیحین میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں (کسی مہم کے لیے) بھیجتے ہیں، چنانچہ ہم جب کسی قوم کے ہاں اترتے ہیں تو وہ ہماری مہمان نوازی نہیں کرتی، اِس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اگر تم کسی قوم کے ہاں اترو اور وہ تمھارے لیے اس چیز کے تیار کرنے کا حکم دے جو مہمان

---

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر.........، رقم الحديث (6019) ومسلم، كتاب اللقطة، باب الضيافة ونحوها، رقم الحديث: 14 (1726-1727)

[2] مسند أحمد (76/3)

کے شایانِ شان ہو تو تم قبول کر لو۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو تم ان سے مہمان کا وہ حق لے سکتے ہو جو ان میں سے کسی کے مہمان بننے کی صورت میں ہوتا ہے۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

''جو آدمی مہمان نوازی نہ کرے تو وہ نہ جناب محمد ﷺ سے ہے اور نہ ابراہیم علیہ السلام سے۔''

ایک مرتبہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک قوم کے پاس گئے اور ان سے مہمان نوازی کا مطالبہ کیا لیکن انھوں نے ان کی مہمان نوازی نہ کی۔ چنانچہ وہ ان سے تھوڑا دور چلے گئے اور کھانا تیار کیا۔ پھر انھوں نے اس قوم کو دعوت دی لیکن انھوں نے دعوت قبول نہ کی۔ تو انھوں نے کہا: نہ تو تم مہمان نوازی کرتے ہو اور نہ دعوت قبول کرتے ہو، تمھارا اسلام سے کوئی تعلق ہے؟ ان میں سے ایک آدمی نے انھیں پہچان لیا اور کہا: آپ میرے گھر تشریف لائیے، اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت دے۔ انھوں نے کہا: یہ تو بہت بری بات ہے کہ تم صرف اس شخص کی مہمان نوازی کرو جس کو تم پہچان لو۔

مہمان نوازی کا حکم:

مذکورہ تمام نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ایک دن اور ایک رات مہمان کی مہمان نوازی کرنا واجب ہے اور یہی مسلک ہے لیث رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا۔ بلکہ امام احمد رحمہ اللہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مہمان نوازی سے انکار کر دے تو مہمان اس سے مطالبہ بھی کر سکتا ہے، کیونکہ مہمان نوازی اس کا حقِ واجب ہے۔ اور کیا وہ اس کے انکار کی صورت میں اس کے مال سے اپنے ہاتھ کے ساتھ کچھ لے سکتا ہے یا وہ معاملہ حاکمِ وقت تک پہنچائے؟ اس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کے دو قول ہیں جو ان سے روایت کیے گئے ہیں۔

حمید بن زنجویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایک رات مہمان کی مہمان نوازی کرنا واجب ہے۔ تاہم اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ انکار کی صورت میں زبردستی اس سے اپنا حق وصول کرے، الا یہ کہ وہ اپنی مصلحت کے بجائے عام مسلمانوں کی مصلحت کے لیے سفر کر رہا ہو۔

لیث بن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر کوئی شخص کسی غلام کے ہاں مہمان بنے تو وہ اس کی مہمان نوازی اسی مال سے کرے جو اس کے ہاتھ میں ہو اور مہمان اس سے کھا سکتا ہے، چاہے اسے یہ معلوم نہ بھی ہو کہ

---

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب حق الضيف، رقم الحديث (6137) ومسلم، كتاب اللقطة، باب الضيافة ونحوها، رقم الحديث: 17 (1727)

اس کے آقا نے اسے اس کی اجازت دی ہے، کیونکہ مہمان نوازی کرنا واجب ہے۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کے قول کا قیاس بھی ہے، کیونکہ انھوں نے صراحتاً کہا ہے کہ اس غلام کی دعوت قبول کرنا جائز ہے جس کو اس کے آقا نے تجارت کرنے کی اجازت دے رکھی ہو۔

کیا مہمان نوازی شہر والوں اور بستی والوں سب پر واجب ہے یا صرف بستی والوں اور ان لوگوں پر واجب ہے جن کا گھر مسافروں کے راستے پر واقع ہو؟ اس سلسلے میں امام احمد رحمہ اللہ کے دو قول ہیں جو ان سے روایت کیے گئے ہیں۔ نیز امام احمد رحمہ اللہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ مہمان نوازی ہر مہمان کے لیے واجب ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر۔ جبکہ اہلِ علم میں سے زیادہ تر جو مہمان نوازی کے وجوب کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف مسلمان کے لیے واجب ہے، کافر کے لیے نہیں، جیسا کہ ان قرابت داروں کا نفقہ واجب نہیں ہوتا جن کا دین مختلف ہو۔ یہ ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔

دوسرے اور تیسرے دن کی ضیافت پہلے دن کی ضیافت کا تکملہ ہے:

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ”جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے مہمان کی خوب مہمان نوازی کرے۔“ کہا گیا: اے اللہ کے رسول! مہمان نوازی کتنی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین دن، اس کے بعد جو کچھ ہو وہ صدقہ ہے۔“[1]

یہ بھی یاد رہے کہ ضیافت وہ نفقہ ہے جو واجب ہے اور یہ صرف اس شخص پر واجب ہوتا ہے جس کے پاس اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے خرچے سے کچھ بچا ہوا ہو۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے قرابت داروں کا نفقہ اور صدقۂ فطر ہے۔

ایک آدمی نے اپنے ایک دوست کو ضیافت کی پیش کش کی تو اس نے کہا: میں آپ کی دعوت تین شرطوں کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ اس نے کہا: وہ کون سی ہیں؟ تو اس نے کہا: جو چیز تمھارے پاس موجود نہ ہو تم اس کا تکلف نہیں کرو گے۔ اپنے بچوں کا کھانا مجھے دے کر تم بچوں پر ظلم نہیں کرو گے اور جو کچھ تمھارے پاس موجود ہو اسے مجھ سے چھپا کر تم خیانت نہیں کرو گے۔

---

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر....، رقم الحديث (6019) ومسلم، كتاب الأدب، باب الضيافة ونحوها، رقم الحديث: 14 (1726-1727)

فوائدِ حدیث:

1. خیر کی بات کہنا، شر سے خاموش رہنا اور پڑوسی اور مہمان کا اکرام کرنا ایمان کی خصلتوں میں سے ہیں۔
2. خیر کی بات کہنے سے دوسروں کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور شر سے خاموش رہنے سے عام طور پر دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔
3. جس کلام میں کوئی خیر نہ ہو اس سے خاموش رہنا ہی افضل ہے۔
4. جب آدمی کسی مجلس میں گفتگو کر رہا ہو اور اسے اپنی گفتگو اچھی لگنے لگے تو اسے خاموش ہو جانا چاہیے اور جب وہ خاموش بیٹھا ہو اور اسے اپنی خاموشی بھلی لگنے لگے تو اسے گفتگو شروع کر دینی چاہیے۔
5. پڑوسی کو ایذا پہنچانا کسی اور کو ایذا پہنچانے سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔
6. اچھا پڑوس یہ نہیں ہے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، بلکہ اچھا پڑوس یہ ہے کہ اپنے پڑوسی کی اذیت کو برداشت کریں۔
7. اگر مہمان کی مہمان نوازی نہ کی جائے تو اسے اس کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔
8. مہمان کا اکرام تکلف کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ جو کچھ گھر میں موجود ہو اسی کو پیش کر کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: ''اَلْجُوْدُ بِالْمَوْجُوْدِ'' ''سخاوت یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہو اسے پیش کر دو۔''

سوالات:

1. ایک حدیث ذکر کریں جس میں ایک لفظ بولنے کی سنگینی کو بیان کیا گیا ہو۔
2. بندہ جو کچھ کہے، سب لکھا جاتا ہے؟ یا صرف وہ لکھا جاتا ہے جس میں خیر یا شر کا پہلو ہو؟
3. پڑوسن کے ساتھ زنا کرنا دیگر عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے زیادہ سنگین جرم کیوں ہے؟
4. انسان کو اپنے برے پڑوسی کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟
5. پڑوسی تین قسم کے ہوتے ہیں، ان کی وضاحت کریں۔
6. پڑوسی کے اکرام کی صورتوں میں سے تین صورتیں ذکر کریں۔
7. مہمان کا انعام کیا ہے؟
8. مہمان نوازی کتنے دنوں تک ہوتی ہے؟



غصہ کے اسباب اور نتائج

16 سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے وصیت کیجیے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَغْضَبْ» فَرَدَّدَ مِرَارًا، قَالَ: «لَا تَغْضَبْ»[1]

''غصہ نہ کیا کر۔'' اس نے بار بار یہی سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا:

''غصہ نہ کیا کرو۔''

حدیث کی مناسبت:

اس آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ اسے مختصر مگر جامع وصیت فرمائیں جس میں خیر کی تمام خصلتیں جمع ہو جائیں اور وہ اسے ذہن نشین کر لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وصیت بہت بڑی ہو جس کو وہ یاد ہی نہ رکھ سکے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وصیت کی کہ وہ غصہ نہ کیا کرے۔ اس نے بار بار یہی سوال دہرایا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی جواب دیا کہ غصہ نہ کیا کر۔ شاید یہ آدمی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وصیت کا مطالبہ کیا تھا وہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ امام طبرانی رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے وہ عمل بتلائیے کہ جو مجھے جنت میں پہنچا دے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم غصہ نہ کیا کرو، اس طرح تمھیں جنت ملے گی۔''[2]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غصے میں پورا شر آجاتا ہے اور اس سے بچنے پر پوری خیر حاصل ہوجاتی ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت کیجیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غصہ نہ کیا کر۔'' صحابی کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت کے بارے میں غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ غصے میں پورا شر موجود ہے۔[3]

---

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم الحديث (6116)

[2] ذكره الهيثمي في مجمع الزوائد (70/8) وقال: رواه الطبراني في الكبير والأوسط وأحد إسنادي الكبير رجاله ثقات

[3] مسند أحمد (373/5)

صحابی کی مذکورہ بات اِس بات کی دلیل ہے کہ غصے میں پورا شر جمع ہو جاتا ہے۔

جعفر بن محمد کہتے ہیں: غصہ ہر شر کی چابی ہے اور ابن المبارک رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ آپ حسنِ اخلاق کو ایک ہی لفظ میں بیان کریں۔ تو انھوں نے کہا: غصہ نہ کرنا۔ اسی طرح امام احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ نے بھی حسنِ خلق کی یہی تفسیر کی ہے۔

«لَا تَغْضَبْ» کا معنی:

جس شخص نے آپ ﷺ سے وصیت کا مطالبہ کیا اس کے لیے آپ کے اس فرمان: «لَا تَغْضَبْ» کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

۱۔ آپ ﷺ کا مقصد ان اسباب کا حکم دینا ہو جو حسنِ خلق کا موجب بنتے ہیں، مثلاً: کرم، سخاوت، بردباری، حیا، انکساری، برداشت، اذیت نہ پہنچانا، درگزر اور معاف کرنا، غصہ پی جانا، خندہ پیشانی وغیرہ۔ یہ خوبصورت عادات ایسی ہیں کہ جب کوئی شخص انھیں اپنا لیتا اور ان کا عادی ہو جاتا ہے تو غصے کے اسباب سامنے آنے پر وہ اسے کنٹرول کر لیتا ہے۔

۲۔ آپ ﷺ کا مقصد یہ ہو کہ جب غصہ آئے تو وہ جس اقدام کا تم سے تقاضا کر رہا ہو اس پر عمل نہ کرنا، بلکہ پوری کوشش کرنا کہ غصے کی حالت میں تم جس اقدام پر آمادہ ہو رہے ہو اسے ترک کر دینا اور وہ تمھیں جس بات کا حکم دے رہا ہو اسے نظر انداز کر دینا، کیونکہ غصہ جب ابنِ آدم پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس کے لیے آمر (حکم دینے والا) یا ناہی (منع کرنے والا) بن جاتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ ﴿ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ ﴾ [الأعراف: ١٥٤] ''اور جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔'' لہٰذا انسان جب اس چیز پر عمل نہ کرے جس کا حکم اسے اس کا غصہ دے رہا ہو اور وہ اسے دبانے کی پوری کوشش کرے تو وہ غصے کے شر سے بچ جاتا ہے، غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور جلدی ختم ہو جاتا ہے اور وہ ایسے ہو جاتا ہے کہ جیسے اس کو غصہ آیا ہی نہیں۔ اسی چیز کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں اشارہ کیا ہے:

﴿ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴾ [الشوریٰ: ٣٧]

''اور جب وہ غصے میں آتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔''

اسی طرح فرمایا: ﴿ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١٣٤]

''وہ غصہ پی جاتے اور لوگوں سے درگزر کر دیتے ہیں۔''

غصے کا علاج حدیث کی روشنی میں:

جس آدمی کو غصہ آجاتا تھا اسے نبی کریم ﷺ ان اسباب کو اختیار کرنے کا حکم دیتے تھے جن کی بنا پر اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ آپ ﷺ اس آدمی کی بڑی تعریف کرتے تھے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول رکھتا۔

چنانچہ صحیحین میں حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمیوں میں لڑائی ہوگئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک کا چہرہ لال سرخ ہوگیا اور اس کی رگیں پھول گئیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً، لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ، لَوْ قَالَ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ»

''میں ایک کلمہ جانتا ہوں، اگر وہ یہ کلمہ کہہ دے تو اس کا غصہ جاتا رہے گا۔ اگر وہ ''أعوذ باللّٰہ من الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' (میں شیطانِ مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) کہہ دے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے گا۔''

اس کے بعد لوگوں نے اس سے کہا: کیا تم سنتے نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کیا فرما رہے ہیں! تو اس نے کہا: میں مجنون نہیں ہوں۔[1]

مسند احمد اور ابو داود میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب تم میں سے کسی شخص کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہوا ہو تو بیٹھ جائے۔ اگر غصہ چلا جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ لیٹ جائے۔''[2]

اِس میں حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو آدمی کھڑا ہو وہ انتقام لینے کے لیے بالکل تیار ہوتا ہے اور جو بیٹھا ہوا ہو وہ اس سے کم تیار ہوتا ہے اور جو لیٹا ہوا ہو وہ انتقام سے بعید ہوتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے انتقامی حالت سے دور ہونے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے فتنوں کے دور کے متعلق بھی اسی قسم کا ارشاد فرمایا:

''فتنوں میں لیٹا ہوا شخص بیٹھے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا اور بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہوئے شخص

---

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم الحديث (6115) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب، رقم الحديث: 109 (2610)

[2] أبو داود، كتاب الأدب، باب ما يقال عند الغضب، رقم الحديث (4782) مسند أحمد (152/5)

سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہوا شخص چلنے والے آدمی سے بہتر ہوگا اور چلنے والا آدمی دوڑنے والے شخص سے بہتر ہوگا۔"[1]

اِس میں اگر چہ فتنوں میں جلدی مبتلا ہونے کی مثال بیان کی گئی ہے، تاہم اس کا معنی یہی ہے کہ جو شخص ان میں جلدی مبتلا ہوگا وہ اس آدمی سے بدتر ہوگا جو اس کے بعد ان میں مبتلا ہوگا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کسی شخص کو جب غصہ آئے تو وہ خاموشی اختیار کرے۔" آپ نے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا۔[2]

یہ بھی غصے کا بہت بڑا علاج ہے، کیونکہ غصے میں آئے ہوئے انسان سے اِس حالت میں کسی ایسی بات کا صادر ہونا ممکن ہوتا ہے جس پر وہ غصہ ختم ہونے کے بعد شرمسار ہو، بہت ساری گالیاں بندہ غصہ ہی کی حالت میں نکالتا ہے جن سے اسے بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اگر وہ بالکل خاموش رہے تو یقیناً اِس شر سے بچ سکتا ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔"[3]

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "تم اپنے میں سے کس کو پہلوان شمار کرتے ہو؟" تو ہم نے کہا: وہ جس کو بڑے بڑے مضبوط مرد نہ پچھاڑ سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں، بلکہ وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول رکھے۔"[4]

حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں اسے اللہ تعالیٰ شیطان سے بچا لیتا ہے اور اسے جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے؛ رغبت، خوف، شہوت اور غضب کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھنا۔"

یہ چاروں چیزیں جنھیں حسن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، پورے شر کی جڑ ہیں، کیونکہ کسی چیز کے نفع کی

---

[1] مسلم، كتاب الفتن، باب نزول الفتن كمواقع القطر، من حديث أبي هريرة، رقم الحديث: 10 (2886) وحديث أبي بكر: 12 (2886)

[2] مسند أحمد (239،283،364/1)

[3] البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم الحديث (6114) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب، رقم الحديث: 107 (2609)

[4] مسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب، رقم الحديث: 106 (2608)

امید رکھتے ہوئے اس کی طرف نفس کے مائل ہونے کا نام ''رغبت'' ہے۔ لہٰذا جس آدمی میں کسی چیز کی رغبت پائی جائے تو وہ اسے اس چیز تک پہنچانے والے تمام طریقوں سے طلب کرنے پر آمادہ کرتی ہے، خواہ ان طریقوں میں سے بعض طریقے حرام کیوں نہ ہوں اور بعض اوقات وہ چیز جس کی اسے رغبت ہوتی ہے خود وہی حرام ہوتی ہے۔

خوف: ایسی چیز ہے کہ جب انسان کسی چیز سے ڈرتا ہے تو اس سے بچنے کا ہر وہ ذریعہ استعمال کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ اس کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ان ذرائع میں سے زیادہ تر ذرائع حرام بھی ہو سکتے ہیں۔

شہوت: سے مراد نفس کا اس چیز کی طرف مائل ہونا ہے جو اس کے موافق ہو اور جس سے وہ لذت حاصل کر سکے اور اکثر و بیشتر نفس کا میلان حرام چیزوں کی طرف ہی ہوتا ہے، مثلاً: زنا، چوری اور شراب نوشی وغیرہ۔ بلکہ اس کا میلان کفر، جادو، نفاق اور بدعات کی طرف بھی ہوتا ہے۔

غضب: دل کے خون کے ابلنے کا نام ہے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو ایذا پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ ایذا پہنچانے والی چیز کو اپنے آپ سے دور رکھنے یا جس کی طرف سے اذیت پہنچے اس سے انتقام لینے کی خاطر کوئی اقدام کرے۔ اِس سے اکثر و بیشتر حرام افعال رونما ہوتے ہیں، مثلاً: قتل، مار اور ظلم وزیادتی وغیرہ۔ اسی طرح حرام اقوال بھی رونما ہوتے ہیں، مثلاً: تہمت لگانا، سب وشتم اور فحش گوئی کرنا وغیرہ۔ بلکہ بعض اوقات یہ اقوال وافعال کفر کے درجے تک بھی پہنچ جاتے ہیں، جیسا کہ جبلہ بن ایہم بن جبلہ الغسانی جو کہ غسانیوں کا آخری بادشاہ تھا اور اس کا تعلق آلِ جفنہ سے تھا، کے بارے میں ہے کہ اس نے پہلے اسلام قبول کیا، پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی، پھر وہاں مزینہ قبیلے کے ایک آدمی کو اس نے تھپڑ مارا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق قصاص سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور قسطنطنیہ کی طرف بھاگ نکلا جہاں ۲۰ھ میں وہ مر گیا۔

اسی طرح غصے کی حالت میں بعض لوگ ایسی قسمیں کھا لیتے ہیں کہ جنھیں پورا کرنا شرعاً درست نہیں ہوتا۔ اسی طرح کئی لوگ غصے کی حالت میں طلاق دے بیٹھتے ہیں جس کے بعد انھیں سوائے ندامت کے اور کچھ نہیں ملتا۔

مومن کو کیا کرنا چاہیے:

مومن پر واجب ہے کہ اس کی چاہت صرف ان چیزوں کو طلب کرنے پر مقصور ہو جنھیں اللہ تعالیٰ

نے اس کے لیے مباح (جائز) قرار دیا ہے اور اگر وہ ان چیزوں کو نیک نیتی سے طلب کرے تو اسے یقیناً ان کا ثواب بھی دیا جائے گا۔

اسی طرح اس پر یہ بھی واجب ہے کہ اس کا غضب صرف دینی لحاظ سے ہو، وہ اس اذیت کو دور کرنے کے لیے غصے میں آئے جو اسے یا کسی اور کو دین میں پہنچے۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے اس سے انتقام لینے کے لیے اسے غصہ آئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَٰتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ ٱللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ﴾ [التوبۃ: ۱۴۔۱۵]

''تم ان سے جنگ کرو، اللہ تعالیٰ انھیں تمھارے ہاتھوں عذاب دے گا، انھیں رسوا کرے گا اور تمھاری ان پر مدد کرے گا اور مومنوں کے کلیجوں کو ٹھنڈک پہنچائے گا۔ اور ان کے دلوں کا غم وغصہ دور کرے گا۔''

یہی حال تھا نبی کریم ﷺ کا، کیونکہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے تھے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کی حرمات کو پامال کیا جاتا تو آپ کو سخت غصہ آتا۔ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے کبھی غصے میں نہیں آئے اور نہ ہی آپ نے کبھی اپنے خادم یا اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے مارا، ہاں جہاد فی سبیل اللہ میں آپ کسی کو معاف نہیں کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال آپ ﷺ کی خدمت کرتے رہے، اِس دوران آپ ﷺ نے انھیں اف تک نہ کہا اور نہ ہی کسی کام کے کرنے پر انھیں یہ کہا کہ تم نے یہ کیوں کیا ہے؟ اور نہ ہی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ کہا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟[1]

جب کسی کہنے والے شخص کی یہ بات سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ تک پہنچائی کہ یہ تقسیم ایسی ہے جس کے ذریعے اللہ کی رضا کے حصول کا ارادہ نہیں کیا گیا تو آپ ﷺ کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی، آپ کے چہرۂ انور کا رنگ تبدیل ہو گیا، غصے کے آثار نمایاں ہو گئے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کہ ''موسیٰ علیہ السلام کو اِس سے بھی زیادہ اذیت دی گئی، لیکن انھوں نے صبر کیا۔''[2]

---

[1] مسلم، کتاب الفضائل، باب کان رسول اللہ ﷺ أحسن الناس خلقاً، رقم الحدیث: 51 (1309) والبخاري في الأدب المفرد، باب حسن الخلق، رقم الحدیث (6038) نحوہ.

[2] البخاري، کتاب فرض الخمس، باب ما کان من النبي ﷺ یعطي المؤلفة قلوبهم...، رقم الحدیث (1350) وله أطراف، ومسلم، کتاب الزکاۃ، باب إعطاء المؤلفة قلوبهم، رقم الحدیث: 140 (1064)

اور آپ ﷺ یہ دعا بھی کرتے تھے کہ «أَسْأَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ» ''میں تجھ سے ناراضی اور رضامندی دونوں حالتوں میں کلمۂ حق کہنے کی توفیق کا سوال کرتا ہوں۔''[1]

یہ بہت ہی نادر ہے کہ انسان غضب اور رضامندی دونوں حالتوں میں صرف حق بات ہی کرے، کیونکہ زیادہ تر لوگوں کو جب غصہ آتا ہے تو وہ بولتے ہوئے رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

غصے کی حالت میں تباہ کن گفتگو کرنے سے ڈرنا چاہیے:

سنن ابی داود میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو سابقہ امتوں میں سے دو آدمیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ ان میں سے ایک بڑا عبادت گزار اور دوسرا بہت ہی گناہ گار تھا۔ عبادت گزار اسے نصیحت کرتا تھا لیکن وہ باز نہیں آتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اسے ایک گناہ کرتے ہوئے دیکھا جسے اس نے بہت بڑا تصور کیا۔ چنانچہ اس نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا اور عابد کی تمام عبادتوں کو ضائع کر دیا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''اس عابد نے بس ایک ہی کلمہ ایسا کہا کہ جس نے اس کی دنیا و آخرت دونوں کو برباد کر دیا۔''[2]

اِس کے بعد سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو غصے کی حالت میں اِس طرح کی بات کرنے سے ڈرایا کرتے تھے۔

اِس عبادت گزار کو اللہ کے لیے غصہ آیا تھا، لیکن اس نے غصے کی حالت میں وہ بات کہہ دی جو اس کے لیے جائز نہ تھی۔ اس نے وہ بات اللہ کے بارے میں حتمی طور پر کہہ دی جس کا اسے علم نہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو ضائع کر دیا۔ چہ جائیکہ ایک شخص کو اپنی ذات کے لیے غصہ آئے، پھر وہ ناجائز گفتگو کرے یا اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرے۔

فرمانِ رسول ﷺ: ''جب تمھیں غصہ آئے تو خاموشی اختیار کر لو'' کا مطلب:

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: ''جب تمھیں غصہ آئے تو خاموشی اختیار کر لو۔'' اِس بات کی دلیل ہے کہ جس آدمی کو غصہ آیا ہو وہ خاموش رہنے کا پابند ہے اور اگر وہ گفتگو کرے گا تو اس کا مؤاخذہ ہوگا۔ جبکہ نبی کریم ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ وہ ان اقوال وافعال کے ذریعے اپنا غصہ ٹھنڈا کرے جو اسے اس کے شر سے بچا لیں۔ گویا کہ آپ ﷺ کی طرف سے اس پر یہ پابندی ہے کہ وہ

[1] جزء من حديث طويل أخرجه النسائي، كتاب السهو، باب الدعاء بعد الذكر ـ نوع منه ـ رقم الحديث (1304)

[2] أبو داود، كتاب الأدب، باب النهي عن البغي، رقم الحديث (4901)

جیسے بھی ممکن ہو اپنے غصے کو ٹھنڈا کرے۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ غصے کی حالت میں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اقوال وافعال کا پابند نہیں ہے؟

غصے کی حالت میں کس بات پر مؤاخذہ ہوگا اور کس پر نہیں ہوگا؟

سلف صالحین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ جس آدمی کو غصہ آیا ہوا ہو اگر اس کے غصے کا سبب مباح ہو، مثلاً: مرض، سفر یا روزہ وغیرہ تو اس کی ملامت نہیں کی جائے گی۔ ان کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر غصے کی حالت میں وہ بہت زیادہ گفتگو کرے جو کسی کی ناراضی کا سبب بنے یا وہ سب وشتم کرے تو اس پر اسے گناہ نہیں ہوگا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میں ایک انسان ہوں اور میں بھی خوش ہوتا ہوں جیسا کہ دیگر انسان خوش ہوتے ہیں اور مجھے بھی غصہ آتا ہے جیسا کہ دیگر لوگوں کو آتا ہے۔ لہٰذا جس مسلمان کو میں برا بھلا کہوں یا اسے ماروں تو اے اللہ! اسے اس کے لیے کفارہ بنا دے۔''[1]

لیکن اگر وہ غصے کی حالت میں کفر، ارتداد، قتل اور ناجائز طور پر کسی کا مال لینا وغیرہ جیسے اقدامات پر اتر آئے تو اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں کہ اس کا مؤاخذہ ضرور ہوگا۔ یہی سلف صالحین کے مذکورہ قول کا مقصد ہے۔

اسی طرح اگر وہ غصے کی حالت میں طلاق دے، یا غلام کو آزاد کرے، یا قسم کھائے تو یقینی طور پر اس کا اِس سب پر مؤاخذہ ہوگا۔

فوائدِ حدیث:

1. نبی کریم ﷺ کو جامع کلمات دیے گئے، انھی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے ایک ہی کلمہ میں بڑی ہی جامع وصیت فرمائی۔
2. غضب کا علاج یہ ہے کہ اس کے مصدر ومنبع سے دور رہا جائے۔
3. اگر غضب ابن آدم پر غالب آجائے تو اس کی حیثیت آمر (حکم دینے والے) وناہی (منع کرنے والے) کی سی ہوتی ہے۔
4. غضب کا سبب بننے والے امور کے ساتھ گھسٹتے رہنے سے بعض اوقات انسان اپنی پوری زندگی کے اعمال برباد کر بیٹھتا ہے۔

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب من لعنه النبي ﷺ، رقم الحدیث: 95(2603)

5 نبی کریم ﷺ کی ایک صفت یہ تھی کہ آپ نہایت ہی حلیم الطبع تھے اور غصہ دلانے کے باوجود بھی آپ کو غصہ نہیں آتا تھا، ہاں اگر اللہ کی حرمات کو پامال کیا جاتا تو آپ کو شدید غصہ آتا۔

6 غصہ اکثر و بیشتر شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔

سوالات:

1 آپ ﷺ کے ارشادِ گرامی «لَا تَغْضَبْ» کے کتنے معانی ہو سکتے ہیں؟

2 نبی کریم ﷺ نے غصے سے بچنے کے لیے ہماری راہنمائی فرمائی۔ اِس کی وضاحت کریں۔

3 آپ ﷺ خوش بھی ہوتے تھے اور آپ کو غصہ بھی آتا تھا تو غصے کی حالت میں آپ کا طریقۂ کار کیا تھا؟

4 غصے کی حالت میں آدمی کے کن اقوال و افعال پر مؤاخذہ ہو سکتا ہے اور کن پر نہیں؟ دلیل سے اس کی وضاحت کریں۔

5 حسن رحمہ اللہ کا ایک بہت اچھا قول ہے کہ "چار خصلتیں جس شخص کے اندر پائی جاتی ہوں تو ...." ان کے اِس قول کی وضاحت کریں۔



مسلمان کا شعار: ہر کام کو پختگی سے کرنا

17 سیدنا ابو یعلی شداد بن اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ »①

”بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان فرض کیا ہے۔ لہٰذا جب تم (قصاص میں) قتل کرو تو اچھی طرح سے قتل کرو، اور جب جانور کو ذبح کرو تو اچھی طرح سے ذبح کرو، اور تم میں سے ہر شخص اپنی چھری کو تیز کر لے اور ذبح کیے جانے والے جانور کو سکون پہنچائے۔“

راویِ حدیث:

سیدنا شداد بن اوس بن ثابت الانصاری ابو یعلی رضی اللہ عنہ، آپ شاعرِ اسلام جناب حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھتیجے تھے۔ بیت المقدس میں تشریف لے گئے اور وہیں فوت ہوگئے۔ انصارِ مدینہ میں تین صحابی ایسے تھے جو زہد میں شہرت رکھتے تھے: ابو الدرداء، عمیر بن سعد اور شداد بن اوس رضی اللہ عنہم۔ جب کہ ابو الدرداء اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما نے سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کے علم و حلم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ آپ ۶۴ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۵ سال تھی۔ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پچاس حدیثیں روایت کیں۔

« إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ » کا معنی و مفہوم:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان فرض کیا ہے“ تو اس کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی طرف یا ہر چیز میں احسان کرنے کو فرض قرار دیا ہے، یا یہ کہ ہر چیز پر ذمہ داری میں احسان کو فرض کیا ہے۔ اِس طرح گویا کہ مکتوب علیہ (جس پر احسان فرض کیا گیا ہے) وہ مذکور نہیں ہے۔ صرف وہ مذکور ہے جس کی طرف احسان کرنا ہے۔ لفظ ”کتب“ اکثر فقہاء اور اصولیوں کے نزدیک وجوب کا تقاضا کرتا ہے جبکہ بعض کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں اِس لفظ کا استعمال

① أخرجه مسلم، كتاب الصيد والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل، رقم الحديث: 57 (1955)

یا تو اس چیز میں معروف ہے جو شرعی طور پر واجب اور ضروری ہو، مثلاً: ﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا ﴾ [النساء: ۱۰۳] اور ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ [البقرة: ۱۸۳] یا پھر اس چیز میں معروف ہے جو تقدیر کے لحاظ سے ہر صورت میں واقع ہونے والی ہو۔ مثلاً: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ﴾ [المجادلة: ۲۱] اسی طرح ماہِ رمضان میں قیام کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«إِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمْ»[1]

"مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں تم پر فرض ہی نہ کر دیا جائے۔"

نیز فرمایا:

«كُتِبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظُّهُ مِنَ الزِّنَا، فَهُوَ مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ»[2]

"ابن آدم پر زنا سے اس کا حصہ لکھ دیا گیا ہے، جسے وہ ہر حال میں پانے والا ہے۔"

احسان اور اس کی قسمیں:

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ احسان کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اس کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ﴾ [النحل: ۹۰]

"بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ [البقرة: ۱۹۵]

"اور تم احسان کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

یہ جو احسان کرنے کا حکم ہے، یہ بعض اوقات وجوب کے لیے ہوتا ہے، مثلاً: والدین اور رشتہ داروں کی طرف اتنا احسان کرنا کہ جس سے نیکی اور صلہ رحمی کے تقاضے پورے ہوں۔ اسی طرح مہمان کی طرف احسان کرنا، جس سے اس کی مہمان نوازی کا حق ادا ہو۔ اور بعض اوقات یہ استحباب کے لیے بھی ہوتا ہے، مثلاً: نفلی صدقہ کرنا وغیرہ۔

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الأذان، باب إذا كان بين الإمام وبين القوم حائط أو سترة، رقم الحديث (729)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج، رقم الحديث (6243) ومسلم، كتاب القدر، باب قدر على ابن آدم حظه من الزنا وغيره، رقم الحديث: 20 (2657) إلا أن فيه (أدرك) بدلًا من (مدرك)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال میں سے ہر عمل میں احسان واجب ہے۔ تاہم ہر چیز میں احسان اس کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے:

- چنانچہ ظاہری وباطنی واجبات کو پورا کرنے میں احسان یہ ہے کہ انھیں ان کے واجبات سمیت مکمل طور پر پورا کیا جائے۔ اِس حد تک احسان واجب ہے جبکہ انھیں ان کے مستحبات سمیت پورا کرنا واجب نہیں ہے۔
- ترک محرمات میں احسان یہ ہے کہ انھیں چھوڑ دیا جائے، خواہ وہ ظاہری محرمات ہوں یا باطنی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَذَرُوْا ظٰهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٠] ''اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو۔'' ترکِ محرمات میں اتنا احسان واجب ہے۔
- تقدیر کے امور میں صبر کرنا۔ اس میں احسان یہ ہے کہ امورِ تقدیر میں کما حقہ صبر کیا جائے اور ناراضی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا جائے۔
- لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے اور ان سے لین دین کرنے میں واجب احسان یہ ہے کہ اس سلسلے میں تمام واجب حقوق کو پورا کیا جائے۔
- لوگوں کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں واجب احسان یہ ہے کہ اپنی ذمہ داری کے تمام واجبات کو پورا کیا جائے۔
- ان تمام امور میں واجب احسان سے زیادہ جو احسان ہے وہ واجب نہیں ہے۔

حدیث میں کون سا احسان مقصود ہے؟:

لوگوں یا جانوروں میں سے جس کو قتل کرنا جائز ہو اس کو قتل کرتے ہوئے احسان یہ ہے کہ اسے تیز ترین اور آسان ترین طریقے سے جان سے مارا جائے اور اسے اضافی عذاب میں مبتلا نہ کیا جائے، کیونکہ یہ ایسی تکلیف ہے کہ جس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ احسان کی یہی وہ نوع ہے جس کو نبی ﷺ نے اس حدیث میں ذکر فرمایا ہے اور شاید اسے آپ ﷺ نے بر سبیلِ مثال ذکر کیا ہے، یا اس لیے کہ اس وقت اسے بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ»

''لہٰذا جب تم (قصاص میں) قتل کرو تو اچھی طرح سے قتل کرو اور جب جانور کو ذبح کرو تو اچھی طرح سے ذبح کرو۔''

"القِتلة" اور "الذِّبحة" سے مراد قتل اور ذبح کرنے کی کیفیت ہے۔ یعنی قتل بھی اچھے طریقے سے کرو اور ذبح بھی اچھے طریقے سے کرو۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ جس کی جان نکالنا جائز ہو اس کی جان نکالنے میں جلدی کرنا اور آسان ترین طریقے سے جان نکالنا واجب ہے۔

اور ابن حزم رحمہ اللہ نے ذبح کرنے کی کیفیت میں احسان کے وجوب پر اجماع نقل کیا ہے۔

آدمی کو قتل کرنے کا جواز اور اس کی انواع واقسام:

آدمی کو قتل کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی گردن کو تلوار سے اڑا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کفار کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ﴾ [محمد: ٤]

"پھر جب تمھاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو گردنوں پر وار مارو۔"

نیز فرمایا:

﴿سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ [الأنفال: ١٢]

"میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، لہٰذا تم گردنوں کے اوپر مارو اور ان کے پور پور کو مارو۔"

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بعینہ وہ جگہ ہے جس پر مارنا مقتول کے لیے آسان ہوتا ہے، یعنی ہڈیوں سے اوپر اور دماغ سے نیچے۔ یہی وجہ ہے کہ درید بن صمہ نے اپنے قاتل کو یہی وصیت کی کہ وہ اسے اسی طرح قتل کرے۔

یاد رہے کہ قتلِ مباح کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:

قصاص میں قتل کرنا، چنانچہ جس آدمی سے قصاص لیا جائے اس کا مثلہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے اسی طرح قتل کیا جائے گا جیسے اس نے قتل کیا، اور اگر اس نے مقتول کا مثلہ کیا ہو تو کیا اس کا بھی اسی طرح سے مثلہ کیا جائے گا، یا اسے تلوار سے قتل کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں علماء کے دو مشہور قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے جیسا اس نے مقتول کے ساتھ کیا۔ یہی قول امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ اور صحیحین میں

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک لڑکی گھر سے نکلی جس نے زیور پہنا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک یہودی نے اسے پتھر مارا۔ پھر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حالت میں لایا گیا کہ اس میں زندگی کے کچھ آثار باقی تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تمھیں فلاں (یہودی) نے قتل کیا ہے؟ تو اس نے اپنا سر اٹھایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دوسری بار اور پھر تیسری بار بھی یہی سوال کیا تو اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ یعنی اس نے کہا: ہاں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلوایا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس سے پوچھا تو اس نے بھی اس جرم کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سر کو دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔[1]

دوسرا قول یہ ہے کہ قصاص صرف تلوار کے ساتھ ہی لیا جائے گا۔ یہ قول امام ثوری رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ اور تیسری روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ قاتل کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا۔ ہاں اگر اس نے اسے آگ میں جلایا یا اس کا مثلہ کیا تو اسے تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا، کیونکہ مثلہ کرنے اور آگ کے ساتھ جلانے سے منع کیا گیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ حدیث: «لَا قَوَدَ إِلَّا بِالسَّيْفِ» کی سند اچھی نہیں ہے اور یہودی کو پتھر کے ساتھ مارنے والی سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت زیادہ اچھی اور اس کی سند زیادہ عمدہ ہے۔

دوسری صورت:

قتلِ مباح کی دوسری صورت ہے کفر کی بنا پر قتل کرنا یا اسلام سے مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کرنا۔ اس میں بھی اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ اس کا مثلہ نہ کیا جائے، بلکہ اسے تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے۔

جانور کو ذبح کرنے میں نرمی اختیار کرنے کا حکم:

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو بند کر کے انھیں تیروں کے ساتھ قتل کرنے سے منع فرمایا۔[2]

---

[1] البخاري، كتاب الديات، باب إذا قتل بحجر أو عصا، رقم الحديث (6877) ومسلم، كتاب القسامة، باب ثبوت القصاص في القتل بالحجر وغيره، رقم الحديث: 15 (1672)

[2] البخاري، كتاب الذبائح والصيد، باب ما يكره من المثلة والمصبورة، رقم الحديث (5513) ومسلم، كتاب الصيد والذبائح، باب النهي عن صبر البهائم، رقم الحديث: 58 (1956)

صحیحین ہی میں یہ بھی مروی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو ایک مرغی کو گاڑھ کر اس پر تیر اندازی کر رہے تھے تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ کس نے کیا ہے؟ بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت بھیجی ہے۔[1]

اِس معنی کی کئی اور احادیث بھی مروی ہیں۔

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جانور کو اچھے طریقے سے ذبح کیا جائے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ذبح کرنے کے آلے (چھری وغیرہ) کو اچھی طرح تیز کیا جائے اور ذبح کیے جانے والے جانور کو راحت پہنچائی جائے۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تیز دھار آلہ ذبح کیے جانے والے جانور کو راحت پہنچاتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے اس کی روح جلدی نکل جاتی ہے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبح کرتے وقت ذبیحہ کے ساتھ نرمی برتنے کا حکم بھی جاری فرمایا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو ایک بکری کے پہلو پر پاؤں رکھے آلۂ ذبح کو تیز کر رہا تھا اور بکری اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اس سے پہلے نہیں تیز کر سکتے تھے؟ کیا تم اسے دو مرتبہ مارنا چاہتے ہو؟''[2]

فوائدِ حدیث:

1. اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا خوف اور اس کی خشیت انسان کو احسان پر آمادہ کرتی ہے۔
2. اسلام دینِ رحمت ہے اور ہر چیز میں حتی کہ قتل اور ذبح میں بھی ترس کھانے کا حکم دیتا ہے۔
3. تمام اعمال میں ''احسان'' واجب ہے۔
4. جس روح کو نکالنا (مارنا) جائز ہو اس کی روح کو نکالنے (مارنے) میں جلدی کرنی چاہیے اور آسان سے آسان تر طریقے کے ساتھ اسے مارنا چاہیے۔

سوالات:

1. مسلمان جو بھی کام کرے اس میں ''احسان'' واجب ہے۔ اس حدیث کے کن الفاظ میں آپ کو اس کی دلیل ملتی ہے؟ کتاب وسنت سے اپنے جواب کی دلیل پیش کریں۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (5515) ومسلم، رقم الحديث: 59 (1958)

[2] أورده الهيثمي في مجمع الزوائد (33/4) وعزاه إلى المعجم الكبير والأوسط للطبراني وقال: رجاله رجال الصحيح

2 حدیث میں جس ''احسان'' کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

3 ''احسان'' کب واجب ہوتا ہے اور کب مستحب ہوتا ہے؟

4 آدمی کو جائز طور پر قتل کرنے کی دو صورتیں ہیں، انھیں ذکر کیجیے۔

5 آپ نماز، والدین کے ساتھ سلوک، ترکِ محرمات اور ولایت وسیاست میں احسان کس طرح کر سکتے ہیں؟



نبوی وصیتیں

18 سیدنا ابو ذر جندب بن جنادہ اور سیدنا ابوعبد الرحمٰن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ»[1]

''تم جہاں رہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور برائی کے بعد نیکی کرنا جو اسے مٹا دے گی اور اچھے اخلاق کے ساتھ لوگوں سے میل جول رکھنا۔''

راویِ حدیث:

1 حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا نام جندب بن جنادہ الغفاری تھا۔ آپ ایک جلیل القدر مشہور صحابی تھے۔ پہلے تین خلفائے راشدین (ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم) کے ادوارِ خلافت میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ آپ اپنے زہد اور اپنی فضیلت کے ساتھ بہت مشہور ہوئے۔ آپ کی وفات ۳۲ھ/۶۵۲ء میں ''ربذہ'' نامی جگہ پر ہوئی۔ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے آپ کی ۱۲ حدیثیں (متفق علیہ) روایت کی ہیں جبکہ صرف امام بخاری رحمہ اللہ نے دو اور امام مسلم رحمہ اللہ نے انیس احادیث بیان کی ہیں۔ آپ کی روایت کردہ احادیث کی کل تعداد: ۲۸۱ ہے۔

2 سیدنا ابوعبدالرحمٰن معاذ بن جبل الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ ایک سردار، امام، فقیہ اور انصار کے ان ستر افراد میں سے ایک تھے جو ''عقبہ'' کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ آپ جنگِ بدر، جنگِ احد اور دیگر تمام جنگوں میں شریک ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ وہ قیامت کے روز علماء کے امام ہوں گے۔ آپ نے ''جامع الجند'' نامی مسجد بنوائی۔ طاعون (عمواس) میں مبتلا ہوئے، اور ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ آپ کو اردن کے علاقے ''الغور'' میں دفن کیا گیا۔ آپ کی بیان کردہ احادیث کی تعداد: ۱۵۷ ہے۔

---

[1] رواه الترمذي، كتاب البر والصلة، باب ما جاء في معاشرة الناس، رقم الحديث (1987) وقال: حديث حسن. وفي بعض النسخ: حسن صحيح. مسند أحمد (153/5)

تقویٰ کا معنی:

نبی کریم ﷺ کی یہ وصیتیں عظیم وصیتیں ہیں جو اللہ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس سے اس طرح ڈریں جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلوں اور پچھلوں تمام لوگوں کو تقویٰ کی وصیت کی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ [النساء: ۱۳۱]

''اور تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہم نے انھیں بھی تاکیدی حکم دیا اور تمھیں بھی یہی تاکیدی حکم ہے کہ تم سب اللہ سے ڈرتے رہو۔''

بنیادی طور پر تقویٰ یہ ہے کہ بندہ اپنے درمیان اور اس چیز کے درمیان حفاظتی بند باندھ لے جس سے وہ ڈرتا اور اس سے بچنا چاہتا ہو۔ بندے کا اپنے رب کے لیے تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے درمیان اور رب کے غضب، اس کی ناراضی اور سزا کے درمیان ایسی آڑ بنا لے جو اسے اس چیز سے بچائے جس سے وہ ڈر رہا ہو اور وہ آڑ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے اور اس کی نافرمانیوں سے اجتناب ہے۔

حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''متقی لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہر اس چیز سے بچتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کیا اور ہر اس کام کو پورا کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا۔''

طلق بن حبیب رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''تقویٰ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی بنا پر، اللہ تعالیٰ کے ثواب کی امید رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کریں۔ اور یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی بنا پر، اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف کھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی چھوڑ دیں۔''

اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] کے بارے میں فرماتے ہیں:

''أَنْ يُطَاعَ فَلَا يُعْصَى، وَيُذْكَرَ فَلَا يُنْسَى، وَيُشْكَرَ فَلَا يُكْفَرَ''

''اللہ تعالیٰ سے کما حقہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے اور نافرمانی نہ

کی جائے۔ اسے یاد رکھا جائے اور بھلایا نہ جائے۔ اس کا شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔''

بعض اوقات تقویٰ کے لفظ کا استعمال محرمات سے اجتناب پر غالب آ جاتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب ان سے تقویٰ کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: کیا تم کبھی کانٹوں والے راستے پر چلے ہو؟ تو سائل نے کہا: جی ہاں، تو آپ نے فرمایا: پھر تم کیا کرتے ہو؟ تو اس نے کہا: جب میں کانٹوں کو دیکھتا ہوں تو اس راستے سے رخ پھیرتے ہوئے دوسری طرف سے نکل جاتا ہوں۔ تو انھوں نے فرمایا: یہی تقویٰ ہے۔

اور ابن المعتز نے یہی معنی یوں بیان کیا: ؎

خَلِّ الذُّنُوبَ صَغِيرَهَا وَكَبِيرَهَا فَهُوَ التُّقَى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ أَرْضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرَى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيرَةً إِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصَى

''تم چھوٹے، بڑے گناہوں سے بچو، یہی تقوی ہے اور اس طرح احتیاط کرو جیسا کہ کانٹوں والی زمین پر چلنے والا شخص اپنے قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا ہے۔ تم چھوٹے گناہوں کو حقیر نہ سمجھا کرو، کیونکہ پہاڑ چھوٹے چھوٹے پتھروں ہی سے بنتا ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ ہی اللہ کی وصیت ہے اس کی پوری مخلوق کے لیے۔ اسی طرح تقویٰ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے آپ کی امت کے لیے۔

ایک دوسرے کو تقویٰ کی وصیت کرنا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی صحابی کو کسی لشکر کا امیر بنا کر بھیجتے تو اسے خصوصی طور پر اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتے کہ وہ خود اپنی ذات میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اس کے ساتھ جو مسلمان ہوں ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرے۔[1]

ایک تابعی کی موت کے وقت ان سے کہا گیا: ہمیں کچھ وصیت کریں تو انھوں نے کہا: میں تمھیں سورۃ النحل کی آخری آیت کی وصیت کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

[1] مسلم، كتاب الجهاد، باب تأمير الإمام الأمراء، رقم الحديث: 3 (1731)

﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ﴾ [النحل: ۱۲۸]

''بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہیں اور جو نیک کام کرنے والے ہیں۔''

ہر جگہ پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا:

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کہ «اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ» ''تم جہاں کہیں ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔'' سے مراد یہ ہے: چھپے ہوئے اور لوگوں کے سامنے، جہاں اسے لوگ دیکھ سکتے ہوں اور جہاں اسے نہ دیکھ سکتے ہوں، ہر جگہ پر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔

نبی کریم ﷺ جو دعائیں مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی:

«اَللّٰهُمَّ أَسْأَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ»[1]

''اے اللہ! میں تجھ سے تیری خشیت کا سوال کرتا ہوں، لوگوں سے اوجھل اور ان کے سامنے بھی۔''

اور امام احمد رحمہ اللہ یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ
وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً وَلَا أَنَّ مَا يُخْفٰى عَلَيْهِ يَغِيْبُ

''تم زندگی میں جب کبھی خلوت میں جاؤ تو یہ نہ کہو کہ میں خلوت میں ہوں (اور جو مرضی کروں) بلکہ یہ کہو کہ یہاں خلوت میں بھی میری نگرانی کرنے والا (اللہ تعالیٰ) موجود ہے۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کبھی ایک گھڑی کے لیے غافل ہوتا ہے۔ اور نہ ہی یہ کہ کوئی پوشیدہ چیز اس سے اوجھل ہوتی ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے جب سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو چھپے ہوئے اور ظاہری طور پر ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت فرمائی تو آپ ﷺ نے انھیں ایک ایسی چیز کی طرف راہنمائی کر دی جو اس تقویٰ کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ایسے ہی حیا کریں جیسا کہ وہ اپنی قوم کے کسی باوقار آدمی سے حیا کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے قریب ہے اور ان پر مطلع ہے۔ لہٰذا وہ اللہ سے حیا کریں کہ کہیں وہ انھیں (برائی کرتے ہوئے) دیکھ ہی نہ لے۔ جو شخص اِس مقام تک پہنچ جاتا ہے اور ہمیشہ یا غالباً اللہ تعالیٰ سے حیا کرتا رہتا ہے تو وہ ان محسنین میں شامل ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اِس طرح کرتے ہیں کہ جیسے وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی

[1] مسند أحمد (264/4) و سنن النسائي، كتاب السهو، باب الدعاء بعد الذكر، رقم الحديث (1305)

نظروں سے دیکھ رہے ہوں اور ان نیکوکار لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرتے ہیں، سوائے چھوٹے گناہوں کے۔

گناہوں کے آثار:

سلیمان تیمی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایک آدمی رات کو چھپ کر گناہ کرتا ہے، پھر صبح کرتا ہے تو اس پر اس گناہ کی ذلت ورسوائی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔

لہٰذا خوش نصیب ہے وہ انسان جو اس چیز کی اصلاح کر لے جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہو، کیونکہ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان چیزوں کی اصلاح کر لے، اللہ تعالیٰ اس کے اور دیگر لوگوں کے درمیان چیزوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ جو شخص اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کی تعریفیں سننے کا خواہش مند ہو تو لوگوں میں اس کی تعریف کرنے والا شخص بھی اس کی مذمت کرنے والا بن جاتا ہے۔

ابوسلیمان عبدالرحمٰن بن احمد بن عطیہ الدارانی (متوفی ۲۱۵ھ) کہتے ہیں:

''وہ شخص یقیناً خسارہ پانے والا ہے جو لوگوں کے سامنے اپنا نیک عمل ظاہر کرے اور اس اللہ کے سامنے برا عمل کرے جو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔''

صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ اس نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ﴾ [هود: ١١٤] ''بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ چنانچہ اس نے کہا: کیا میرے لیے خاص ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام لوگوں کے لیے ہے۔''[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک بندے نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا، پھر اس نے دعا کرتے ہوئے کہا:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي» ''اے اللہ! میرا گناہ معاف فرما۔''

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب سورة هود، رقم الحديث (4687) ومسلم، كتاب التوبة، باب قوله تعالىٰ: ﴿ إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ﴾، رقم الحديث: 42 (2763)

«أَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا، فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ»

''میرے بندے نے گناہ کا ارتکاب کیا، پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور اس پر مؤاخذہ بھی کر سکتا ہے۔''

اس کے بعد اس نے ایک اور گناہ کیا، پھر توبہ کرتے ہوئے کہا:

«أَيْ رَبِّ، اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ» ''اے میرے رب! میرا گناہ معاف فرما۔''

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہا:

«أَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا، فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ»

''میرے بندے نے گناہ کا ارتکاب کیا، پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور اس پر مؤاخذہ بھی کر سکتا ہے۔''

پھر اس نے ایک اور گناہ کیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہوئے کہا:

«أَيْ رَبِّ، اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ» ''اے میرے رب! میرا گناہ معاف فرما۔''

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہا:

«أَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا، فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ اِعْمَلْ مَا شِئْتَ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ»[1]

''میرے بندے نے گناہ کا ارتکاب کیا، پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور اس پر مؤاخذہ بھی کر سکتا ہے، جاؤ اب جو چاہو کرو میں نے تمھیں معاف کر دیا۔''

یعنی بندہ جب تک اسی حال میں رہے کہ جب بھی گناہ کرے تو اللہ سے مغفرت طلب کرے، تب تک اللہ تعالیٰ اسے معاف کرتا رہے گا۔ اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بندہ وہ گناہ ضرور کرے گا جو اس کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

[1] البخاري، كتاب التوحيد، باب يريدون أن يبدلوا كلام الله، رقم الحديث (7507) ومسلم، كتاب التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب، رقم الحديث: 29 (2758)

«كُتِبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظُّهُ مِنَ الزِّنَا، فَهُوَ مُدْرِكٌ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ»[1]

''ابن آدم پر زنا سے اس کا حصہ لکھ دیا گیا ہے، جسے وہ ہر حال میں پانے والا ہے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے بندے کے لیے ان گناہوں سے پاک ہونے کی راہ بھی بنا دی ہے جن میں وہ واقع ہوا اور وہ ہے استغفار وتوبہ کرنا۔ اگر وہ استغفار وتوبہ کر لے تو وہ گناہوں کے شر سے بچ گیا اور اگر وہ گناہوں پر اصرار کرتا رہا تو یقیناً ہلاکت کی وادیوں میں جا گرے گا۔

نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں:

نبی ﷺ کی دوسری وصیت:

«وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا» ''اور برائی کے بعد نیکی کرنا جو اسے مٹا دے گی۔''

اس میں ''نیکی'' سے مراد ''برائی'' سے توبہ بھی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) کے بیشتر مقامات پر آگاہ فرمایا ہے کہ جو شخص گناہ کرنے کے بعد اس سے توبہ کر لے تو اس کا گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور اسے ثواب بھی دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴾ [النساء: ١٧]

''اللہ کے نزدیک صرف ان لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو نادانی میں گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، تو اللہ انہی کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا علم والا، بڑی حکمتوں والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾ [النحل: ١١٩]

''جن لوگوں نے لاعلمی کی بنا پر گناہ کا ارتکاب کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کی، تو یقیناً آپ کا رب ان کے لیے ان کی توبہ کے بعد بڑا معاف کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج، رقم الحديث (6243) ومسلم، كتاب القدر، باب قدر على ابن آدم حظه من الزنا وغيره، رقم الحديث: 20 (2657) إلّا أن فيه «أدرك» بدلًا من «مدرك»

﴿ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴾ [الفرقان: ۷۰]

''مگر جو شخص توبہ کرے، ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے تو اللہ ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا، بے حد مہربان ہے۔''

ان تمام آیات سے ظاہری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سچی توبہ کرے اور شرائطِ توبہ کو مکمل کرے تو اس کی توبہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول ہوتی ہے، جیسا کہ اس کافر کا اسلام یقینی طور پر قبول کرلیا جاتا ہے جو صحیح معنوں میں اسے قبول کرے۔

نبی کریم ﷺ کے فرمان: « وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا » ''اور برائی کے بعد نیکی کرنا جو اسے مٹا دے گی۔'' میں ''نیکی'' سے مراد توبہ کے علاوہ عام نیکیاں بھی ہوسکتی ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَىِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ﴾ [ھود: ۱۱۴]

اور آپ دن کے دونوں حصوں (صبح وشام) میں نماز قائم کریں اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَا مِنْ رَجُلٍ يُذْنِبُ ذَنْباً، ثُمَّ يَقُومُ فَيَتَطَهَّرُ، ثُمَّ يُصَلِّي، ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ إِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ »

''جو شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرے، پھر کھڑا ہو، پھر وضو کرے، پھر نماز پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔''

پھر نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۚ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [آل عمران: ۱۳۵][1]

---

[1] الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الصلاة عند التوبة، رقم الحديث (406)، أبو داود، كتاب الصلاة، باب في الاستغفار، رقم الحديث (1521)، ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة، باب ما جاء أن الصلاة كفارة، ←

''جب ان سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا وہ کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں پر معافی طلب کرتے ہیں اور فی الواقع اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کر لیا ہے جس پر حد واجب ہوتی ہے، لہٰذا آپ مجھ پر وہ حد نافذ کریں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی کہ کون سے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور کیسے کیا ہے۔ اس کے بعد جب نماز کا وقت ہوا تو اس نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دوبارہ وہی بات کی، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلَيْسَ قَدْ صَلَّيْتَ مَعَنَا؟» ''کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟''

اس نے کہا: جی پڑھی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ ذَنْبَكَ» ''جاؤ اللہ تعالیٰ نے تمھارا گناہ معاف کر دیا ہے۔''[1]

اور صحیحین میں جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»[2]

''جس نے حالتِ ایمان میں اللہ سے حصولِ ثواب کی نیت سے رمضان المبارک کے روزے رکھے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اور جس شخص نے ایمان کے ساتھ اور اللہ کی رضا کو طلب کرتے ہوئے رمضان کا قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

← رقم الحديث (1395)، النسائي في الكبرىٰ، كتاب عمل اليوم والليلة، باب ما يفعل من بلي بذنب، حديث (11078) و مسند أحمد (10/1)

[1] البخاري، كتاب الحدود، باب إذا أقر بالحد ولم يبين، رقم الحديث (6823) ومسلم، كتاب التوبة، باب قوله تعالىٰ: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾، رقم الحديث: 44 (2765)

[2] البخاري، كتاب ليلة القدر، باب فضل ليلة القدر، رقم الحديث (2014) ومسلم، كتاب المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان، رقم الحديث (760) بدون قوله: "ومن قام رمضان ......"

اور جو شخص ایمان کے ساتھ اور طلبِ اجر وثواب کی خاطر لیلۃ القدر کا قیام کرے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔"

اسی طرح صحیحین ہی میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»[1]

"جس نے حج کیا اور اس دوران بے ہودگی اور اللہ کی نافرمانی سے بچا رہا تو وہ اس طرح واپس لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا۔"

صحیحین کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ، حُطَّتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ»[2]

"جو شخص دن میں ایک سو مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" پڑھ لے اس کے گناہ مٹا دیے جاتے ہیں، خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں۔"

کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے:

دو مسئلوں میں اہلِ علم کا اختلاف واقع ہوا ہے:

پہلا مسئلہ:

کیا نیک اعمال کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے گناہوں کو مٹاتے ہیں یا صرف صغیرہ گناہوں کو؟ تو ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ صرف صغیرہ گناہوں کو مٹاتے ہیں۔ اور کبیرہ گناہوں کے لیے توبہ ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو توبہ کرنے کا حکم دیا ہے اور جو توبہ نہ کرے اسے ظالم قرار دیا ہے۔

اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ توبہ کرنا فرض ہے اور فرائض سوائے نیت وقصد کے ادا نہیں کیے جاتے اور اگر کبیرہ گناہ وضو، نماز اور اسلام کے دیگر ارکان کے ذریعے معاف ہونے والے ہوتے تو توبہ کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ اگر فرائض کی ادائیگی کے ساتھ کبیرہ گناہ مٹنے والے ہوتے تو فرائض کو ادا کرنے

---

[1] البخاري، كتاب المحصر، باب قوله تعالىٰ: ﴿فَلَا رَفَثَ﴾، رقم الحديث (1819) ومسلم، كتاب الحج، باب في فضل الحج، رقم الحديث: 438 (1350) بنحوه

[2] البخاري، كتاب الدعوات، باب فضل التسبيح، رقم الحديث (6405) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل التهليل والتسبيح والدعاء، رقم الحديث: 28 (2691)

والے شخص کا کوئی گناہ ہی باقی نہ رہتا جس کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل ہوتا۔ یہ مرجئہ کے قول کے مشابہہ ہے جو کہ یقیناً باطل ہے۔

یہ بات ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التمہید" میں ذکر کی ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کئی احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ، وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ، وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ، مُكَفِّرَاتٌ مَا بَيْنَهُنَّ، إِذَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ»[1]

"پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک ماہِ رمضان دوسرے ماہِ رمضان تک درمیان والے گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے۔"

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ فرائض کبیرہ گناہوں کو نہیں مٹاتے۔

جب کہ اہلِ حدیث وغیرہ کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ اعمال کبیرہ گناہوں کو بھی مٹا دیتے ہیں، لیکن صحیح موقف وہی ہے جو جمہور کا ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، کیونکہ توبہ کرنا بندوں پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [الحجرات: ١١]

"اور جو توبہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔"

ان دلائل میں سے جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ یا بغیر سزا کے معاف نہیں ہوتے ایک دلیل سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے، جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بَايِعُوْنِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئاً، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ، وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوْفٍ»

"آؤ میری بیعت کرو کہ تم آئندہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرو گے، چوری اور زنا نہیں کرو گے،

---

[1] مسلم، کتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس، رقم الحديث: 16 (233)

اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے، بہتان نہیں باندھو گے اور نیکی کے کاموں میں میری نافرمانی نہیں کرو گے۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِٱللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَٰدَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُنَّ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

[الممتحنة: ۱۲]

"اے میرے نبی! اگر آپ کے پاس مومن عورتیں، آپ سے اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائیں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑا ہوا کوئی بہتان نہیں لائیں گی اور کسی بھلائی کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیجیے اور اللہ سے ان کے لیے مغفرت کی دعا کیجیے، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا ہے۔"

پھر ارشاد فرمایا:

«فَمَنْ وَفَّى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئاً فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئاً، ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ: إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ» [1]

"تم میں سے جس شخص نے ان شرائط کو پورا کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جس نے ان میں سے کسی ایک شرط پر عمل نہ کیا، پھر اسے دنیا میں سزا دے دی گئی تو وہ اس کا کفارہ ہوگا۔ اور جس شخص پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ (قیامت کے دن) اللہ کی مشیت کے تحت ہوگا، اگر وہ چاہے گا تو اسے معاف فرما دے گا اور اگر چاہے گا تو اسے عذاب دے گا۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے:

---

[1] البخاري، كتاب الإيمان، باب (11)، رقم الحديث (18)، كتاب الحدود، باب الحدود كفارة، رقم الحديث (6784) ومسلم، كتاب الحدود، باب الحدود كفارات، رقم الحديث: 41 (1709)

«وَمَنْ أَتَى مِنكُمْ حَدًّا، فَأُقِيمَ عَلَيْهِ فَهُوَ كَفَّارَتُهُ»[1]

''جس شخص نے کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کیا جس پر شرعی حد لاگو ہوتی ہو، پھر اس پر حد نافذ کر دی گئی تو وہی اس کا کفارہ ہے۔''

اِس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حدود کفارات ہیں۔

ابن عون رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اپنے اعمال کی کثرت پر اعتماد مت کرنا، کیونکہ تمھیں نہیں معلوم کہ وہ قبول بھی کیے گئے ہیں یا نہیں! اور اپنے گناہوں سے بے خوف نہ ہونا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ انھیں معاف کر دیا گیا ہے یا نہیں، کیونکہ تمھارے سارے اعمال تم سے غائب ہیں۔''

دوسرا مسئلہ:

کیا صغیرہ گناہوں سے بھی کبیرہ گناہوں کی طرح توبہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ کیونکہ صغیرہ گناہ تبھی معاف ہوتے ہیں جب کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴾

[النساء: ٣١]

''اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تمھارے (صغیرہ) گناہوں کو مٹا دیں گے اور تمھیں عزت والی جگہ داخل کریں گے۔''

اِس مسئلے میں بھی لوگوں کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ صغیرہ گناہوں سے بھی توبہ کرنا ضروری ہے۔ یہ حنابلہ اور کئی دیگر فقہاء اور متکلمین کا موقف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صغیرہ وکبیرہ دونوں قسم کے گناہ ذکر کرنے کے بعد توبہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ صغیرہ گناہوں سے بھی توبہ کرنا لازم ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ [النور: ٣١]

''اور اے ایمان والو! تم سب مل کر اللہ کے حضور توبہ کرو توقع ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔''

---

[1] مسلم، کتاب الحدود، باب الحدود کفارات، رقم الحدیث: 43 (1709)

جب کہ کچھ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ صغیرہ گناہوں سے توبہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ قول معتزلہ سے بھی منقول ہے۔ متاخرین میں سے بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ دو میں سے ایک کام کرنا ضروری ہے۔ یا توبہ یا ایسے نیک اعمال جو گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔

ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرائض پر عمل کرنے اور کبائر سے اجتناب کرنے کے ساتھ صغیرہ گناہوں کے مٹنے کے بارے میں دو قول ذکر کیے ہیں:

⊙ پہلا قول:

فقہاء اور اہل الحدیث کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت اور اِس حدیث: «وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا» کی بنا پر صغیرہ گناہوں کا مٹنا یقینی امر ہے۔

⊙ دوسرا قول:

اصولیوں سے منقول ہے کہ صغیرہ گناہوں کا مٹنا یقینی امر نہیں ہے، بلکہ ظنِ غالب اور پختہ امید پر محمول ہے اور اللہ کی مشیت کے تابع ہے، کیونکہ اگر صغیرہ گناہوں کا مٹنا یقینی ہو تو وہ اس مباح کے زمرے میں داخل ہو جائیں گے جس پر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی اور یہ یقیناً شرعی اصولوں کے خلاف ہے۔

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کہتے ہیں:

صرف نیک اعمال کرنے سے صغیرہ گناہوں کا مٹنا یقینی امر نہیں ہے، کیونکہ جن احادیث میں اعمال کے ساتھ گناہوں کے مٹنے کا ذکر ہے وہ اس بات کے ساتھ مشروط ہیں کہ عمل اچھی طرح سے کیا گیا ہو، مثلاً: وضو اور نماز کے بارے میں احادیث میں یہ شرط موجود ہے۔ تو کسی عمل کا اچھی طرح ہونا متحقق نہیں ہوتا جو کہ تکفیر کا موجب بنتا ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے صغیرہ گناہوں سے توبہ کرنے کے متعلق جو اختلاف نقل کیا ہے وہ بھی درحقیقت اسی اختلاف پر مبنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان نیک لوگوں کی تعریف کی ہے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ۝ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ [النجم: ۳۲۔۳۱]

”اور نیک کام کرنے والوں کو اچھا بدلہ عنایت فرمائے، جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، سوائے کسی چھوٹے گناہ کے، بے شک آپ کا رب وسیع مغفرت والا ہے۔“

سلف صالحین کے ہاں ''اللمم'' کی تفسیر میں دو قول ہیں:

پہلا: یہ کہ اس سے مراد بے حیائی کے مقدمات ہیں، مثلاً: چھونا اور بوس وکنار وغیرہ کرنا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جس پر آخرت میں جہنم کی وعید نہ آئی ہو اور دنیا میں کوئی سزا ذکر نہ کی گئی ہو۔

دوسرا: یہ کہ اس سے مراد بے حیائی کے کاموں اور کبیرہ گناہوں میں سے کسی ایک کے بارے میں ایک مرتبہ سوچنا، پھر اس سے توبہ کرنا ہے۔

بظاہر ایسے لگتا ہے کہ مذکورہ دونوں قول صحیح ہیں اور دونوں ہی آیت سے مراد ہیں۔ لہٰذا ''محسن'' وہ ہے جو کبھی کبھار کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے، پھر اس سے توبہ کر لے۔ اور اگر وہ صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا وہ گناہ اس کی ان نیکیوں میں چھپ جاتا ہے جو اسے مٹا دیتی ہیں، بشرطیکہ وہ اس پر اصرار کرنے والا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٥]

''اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیے (ہوئے گناہوں) پر اصرار نہیں کرتے۔''

لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ» ''اور اچھے اخلاق کے ساتھ لوگوں سے میل جول رکھنا۔''

یہ تقویٰ کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔ اور تقویٰ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت کے پیشِ نظر اسے خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقویٰ صرف اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے کا نام ہے، بندوں کے حقوق نہ بھی ادا کیے جائیں تو تقویٰ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور جو لوگ اللہ کے حقوق ادا کرتے ہیں اور اس کی محبت، خشیت اور اطاعت میں منہمک رہتے ہیں ان میں سے زیادہ تر لوگوں پر یہ چیز غالب ہوتی ہے کہ وہ بندوں کے حقوق یا تو مکمل طور پر ادا نہیں کرتے یا ان میں کمی وکوتاہی کرتے ہیں۔ اور اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق دونوں کو ادا کرنا بہت کم رہ گیا ہے، دونوں حقوق کی ادائیگی تو صرف انبیاء اور صدیقین ہی کر پاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب اہلِ یمن کا معلم، مربی اور قاضی بنا کر بھیجا تو انھیں صراحتاً حکم دیا کہ وہ لوگوں سے اپنا میل جول اچھے طریقے سے رکھیں۔ کیونکہ جو شخص اس مرتبہ پر فائز ہوتا ہے وہ لوگوں سے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کا محتاج ہوتا ہے۔ جبکہ جس شخص کو لوگوں سے میل جول رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اس چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔

نبی ﷺ نے اچھے اخلاق کو ایمان کی خصلتوں میں سے سب سے کامل خصلت قرار دیا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا»[1]

''مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والا شخص وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو۔''

ایک حدیث میں نبی ﷺ نے بشارت دی کہ اچھے اخلاق والا شخص ایک روزہ دار اور تہجد گزار کے درجے کو پالیتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ»[2]

''بے شک مومن اپنے اچھے اخلاق کے ساتھ ایک روزہ دار اور تہجد گزار کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔''

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَبِبَيْتٍ فِي وَسَطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَإِنْ كَانَ مَازِحاً، وَبِبَيْتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ»[3]

''میں ذمہ دار ہوں ایک محل کا، جنت کی ایک جانب میں، اس شخص کے لیے جو جھگڑا چھوڑ دے اگرچہ حق پر ہو اور ایک محل کا، جنت کے درمیان میں، اس شخص کے لیے جو جھوٹ چھوڑ دے اگرچہ مزاح ہی میں ہو، اور جنت کی اعلیٰ منازل میں ایک محل کا، اس شخص کے لیے جو اپنے اخلاق کو عمدہ بنا لے۔''

---

[1] مسند أحمد (250/2) قال أحمد شاكر (133/13): سنده صحيح. سنن أبي داود، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الإيمان، رقم الحديث (4682)

[2] مسند أحمد (90/6) أبو داود، كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، رقم الحديث (4798)

[3] أبو داود، كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، رقم الحديث (4800)

اور سلام بن ابی مطیع سے اچھے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے یہ اشعار پڑھے ؎

تَرَاهُ إِذَا مَا جِئْتَهُ مُتَهَلِّلًا كَأَنَّكَ تُعْطِيهِ الَّذِي أَنْتَ سَائِلُهُ

وَلَوْ لَمْ يَكُنْ فِي كَفِّهِ غَيْرُ رُوحِهِ لَجَادَ بِهَا فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ سَائِلُهُ

هُوَ الْبَحْرُ مِنْ أَيِّ النَّوَاحِي أَتَيْتَهُ فَلُجَّتُهُ الْمَعْرُوفُ وَالْجُودُ سَاحِلُهُ

''جب آپ اس کے پاس آئیں تو اسے ہشاش بشاش دیکھیں، گویا کہ آپ اسے وہ چیز دے رہے ہوں جس کا آپ اس سے سوال کرنے والے ہیں۔ اور اگر اس کی ہتھیلی میں سوائے اس کی روح کے اور کچھ نہ ہو تو وہ اس کی بھی سخاوت کر دے، لہٰذا اس سے سوال کرنے والے کو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ آپ اس کے پاس جس ناحیے سے بھی آئیں وہ ایک سمندر ہے، چنانچہ نیکی اس کی موجوں کا ہنگامہ ہے اور سخاوت اس کا ساحل ہے۔''

فوائدِ حدیث:

1. تقویٰ کی وصیت ایک جامع وصیت ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو شامل ہے۔
2. تقویٰ کی وصیت اگلوں اور پچھلوں تمام لوگوں کے لیے ہے۔
3. تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے اور اسے بھلایا نہ جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے اور اس کی ناشکری نہ کی جائے۔
4. تقویٰ احسان کی طرف پہنچانے والا راستہ ہے۔
5. جو شخص سچی توبہ کر لے تو اس کے بارے میں بنیادی بات یہی ہے کہ اس کی توبہ اللہ کے ہاں مقبول ہے۔
6. نیک اعمال صغیرہ گناہوں کو مٹاتے ہیں، رہے کبیرہ گناہ تو ان کے لیے توبہ ضروری ہے۔
7. تقویٰ مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اچھے اخلاق کے ساتھ لوگوں سے میل جول نہ رکھا جائے۔

سوالات:

1. تقویٰ کے کیا معنی ہیں؟
2. تقویٰ کا احسان سے کیا تعلق ہے؟
3. خالی جگہ پر کیجیے:

- خوش نصیب ہے وہ انسان جو اس چیز کی اصلاح کر لے جو اس کے اور .... کے درمیان ہو۔

کیونکہ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان چیزوں کی اصلاح کر لے، اللہ تعالیٰ اس کے اور دیگر لوگوں کے درمیان چیزوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اور جو شخص .... کو ناراض کر کے لوگوں کی تعریفیں سننے کا خواہش مند ہو تو لوگوں میں اس کی تعریف کرنے والا شخص بھی اس کی .... بن جاتا ہے۔

⊙ گناہوں کا کفارہ بننے والے اعمال بہت زیادہ ہیں، ان میں سے .... اور .... اور .... بھی ہیں۔

4 اس آیتِ کریمہ: ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ۚ ﴾ [هود: ١١٤] کا شانِ نزول ذکر کریں۔

5 کیا حدود کفارات ہیں؟ دلیل کے ساتھ جواب دیجیے۔

6 اسلام میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے .... کیوں؟ اس کی وجہ بیان کریں۔



آپ اللہ کی حفاظت کریں، اللہ آپ کی حفاظت کرے گا

19 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

« يَا غُلَامُ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَّنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ، لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ »[1]

''اے بچے! میں تمھیں آج نفع بخش باتوں کی تعلیم دینا چاہتا ہوں: تم اللہ (کے دین کی) حفاظت کرنا، اللہ تعالیٰ تمھاری حفاظت کرے گا۔ تم اللہ تعالیٰ (کے دین کی) حفاظت کرتے رہنا، تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ تم جب بھی مانگنا چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور جب بھی تمھیں مدد کی ضرورت ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا۔ اور اس بات پر اچھی طرح سے یقین کر لو کہ اگر تمام لوگ مل کر تمھیں نفع پہنچانا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے، سوائے اس نفع کے جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے حق میں لکھ رکھا ہے۔ اور اگر وہ سب کے سب مل کر تمھیں نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے سوائے اس نقصان کے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر لکھ رکھا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں (یعنی تقدیریں لکھی جا چکی ہیں)۔''

راویِ حدیث:

نبی ﷺ کے چچا زاد جناب عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم رضی اللہ عنہما، امت کے بہت بڑے عالم، صحابیِ جلیل، اپنے زمانے کے فقیہ اور مفسرین کے امام۔ آپ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا

[1] رواه الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب (59)، رقم الحديث (2516) وقال: حديث حسن صحيح

ہوئے۔ آپ کا شمار علمائے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے حتی کہ ان کی جوانی کے دور میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ انھیں عمر رسیدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فوقیت دیتے تھے۔ آپ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ واقعۂ جمل اور صفین میں موجود تھے۔ آخری زندگی میں آپ کی بینائی ختم ہوگئی تھی۔ چنانچہ آپ طائف میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں ۶۸ھ میں فوت ہوئے۔ آپ بہت زیادہ احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ آپ کی مرویات کی تعداد: ۱۶۶۰ ہے۔

اس حدیث کی اہمیت:

یہ حدیث نبی ﷺ کی عظیم وصیتوں اور اہم دینی امور کے ضابطوں پر مشتمل ہے۔ حتی کہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ میں نے اس حدیث میں غور وفکر کیا تو اس نے مجھے اتنا دہشت زدہ کر دیا کہ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ افسوس ہے اس شخص پر جو اس حدیث سے نا آشنا رہا اور اس کے معانی کو نہ سمجھ سکا۔

«اِحْفَظِ اللّٰہَ»

یعنی اللہ کی حدود، اس کے حقوق اور اوامر ونواہی کی حفاظت کرو اور ان کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اوامر پر عمل کرو، نواہی سے اجتناب کرو اور حدود کو مت پھلانگو۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے یا جس کی اجازت دی ہے اسے چھوڑ کر اس چیز کی طرف مت جاؤ جس سے اس نے منع کیا ہے۔

جس شخص نے اس پر عمل کیا وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والوں میں شامل ہوگیا جن کی اللہ نے اپنی کتاب میں مدح کی ہے:

﴿ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿٣١﴾ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿٣٢﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ﴿٣٣﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿٣٤﴾ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴾ [قٓ:۳۱-۳۵]

''اور جنت پرہیزگاروں کے لیے بالکل قریب کر دی جائے گی، ذرا بھی دور نہ ہوگی (اور کہا جائے گا:) یہ ہے وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لیے جو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا، پابندی کرنے والا ہو، جو رحمان کا خلوت میں خوف رکھتا ہو اور توجہ والا دل لایا ہو۔ تم اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔ یہ وہاں جو چاہیں گے انھیں ملے گا (بلکہ) ہمارے پاس اور بھی زیادہ ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں ﴿ حَفِيْظٍ ﴾ سے مراد اللہ کے اوامر کی حفاظت کرنے والا اور اپنے گناہوں کو یاد کرکے ان سے توبہ کرنے والا شخص ہے۔

جن اوامر کی سب سے زیادہ حفاظت کرنا ضروری ہے:

اللہ کے اوامر میں سب سے زیادہ جن اوامر کی حفاظت کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

1. نماز: اللہ تعالیٰ نے نماز کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٣٨]

''اپنی سب نمازوں کی حفاظت کرو، خاص طور پر درمیانی نماز کی اور اللہ کے حضور ادب سے کھڑے ہوا کرو۔''

اور نماز کی حفاظت کرنے والوں کی یوں مدح فرمائی:

﴿ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [المعارج: ٢٢۔ ٣٥]

''مگر نماز ادا کرنے والے جو ہمیشہ اپنی نماز پر قائم رہتے ہیں۔ .... اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں، یہی لوگ عزت واکرام کے ساتھ جنتوں میں رہیں گے۔''

اور نماز کی چابی طہارت ہے، اس لیے اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

2. جن امور کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے ایک قسم بھی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ قسمیں کھا لیتے ہیں، پھر ان قسموں کی بنا پر جو چیز واجب ہوتی ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں، اِس طرح نہ وہ قسموں کی حفاظت کرتے ہیں اور نہ ان کی پابندی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ﴾ [المائدة: ٨٩] ''اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔''

③ سر اور پیٹ کی حفاظت کرنا:

سر اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس کی حفاظت میں کانوں اور آنکھوں کی محرمات سے حفاظت بھی شامل ہے۔ اسی طرح پیٹ اور جس چیز پر پیٹ مشتمل ہے اس میں دل کی حفاظت بھی شامل ہے کہ دل میں حرام پر اصرار کرنے کا عزم نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۵]

''اور تم یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرتے رہو۔''

اللہ تعالیٰ نے ان تمام اعضاء کو ایک آیت میں جمع کر دیا ہے:

﴿ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴾ [الاسراء: ۳۶]

''بے شک کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔''

اسی طرح پیٹ کی حفاظت میں یہ بھی شامل ہے کہ اس میں کھانے پینے کی حرام چیزیں داخل نہ کی جائیں۔

④ زبان اور شرمگاہ کی حفاظت بھی ان امور میں شامل ہے جن کی حفاظت کا سب سے زیادہ حکم دیا گیا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ حَفِظَ مَا بَيْنَ فُقْمَيْهِ، وَفَرْجَهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ» [1]

''جس شخص نے زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کی وہ جنت میں داخل ہوگیا۔''

اللہ تعالیٰ کیسے حفاظت کرتا ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: «يَحْفَظْكَ» اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی حدود کی حفاظت کرے اور اس کے حقوق کو ادا کرے تو اللہ اس کی حفاظت کرے گا، کیونکہ بدلہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا عمل ہوتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ﴾ [البقرۃ: ۴۰]

''تم مجھ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو میں تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں گا۔''

اسی طرح فرمایا:

[1] مسند أحمد (398/4)

﴿ فَاذْكُرُونِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] ''لہٰذا تم مجھے یاد رکھو میں تمھیں یاد رکھوں گا۔''

اور اللہ تعالیٰ بندے کی حفاظت کس طرح کرتا ہے؟ اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:

یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے دنیاوی مفادات کی حفاظت کرتا ہے، مثلاً: اس کے بدن، اہل وعیال اور مال کی حفاظت۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الرعد: ۱۱]

''اس کے پہرے دار (فرشتے) انسان کے آگے پیچھے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔''

جو شخص اپنے بچپن اور جوانی کے دور میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرتا رہے، اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے اور اس کی کمزوری کے دور میں اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے کانوں، اس کی آنکھوں، طاقت اور عقل کو درست رکھتا ہے۔

ایک عالم کے بارے میں آتا ہے کہ اس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی اور اس کی عقل اور طاقت جوان تھی۔ ایک دن وہ بہت زور سے اچھلا تو اسے اس پر ڈانٹا گیا۔ تو اس نے کہا: ہم نے بچپن میں ان اعضاء کو گناہوں سے بچائے رکھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑھاپے میں بھی محفوظ رکھا ہے۔

اِس کے برعکس سلف صالحین میں سے ایک بزرگ نے کسی بوڑھے کو دیکھا کہ وہ کسی سے مانگ رہا ہے تو اس نے کہا: اِس نے اپنے بچپن میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو ضائع کیا، اب اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے بڑھاپے میں ضائع کر دیا ہے۔

اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ بندے کی نیکی کی بنا پر اس کی حفاظت اِس طرح بھی کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کا خیال رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ﴾ [الکہف: ۸۲] کے بارے میں کہا گیا ہے کہ دونوں یتیموں کی حفاظت اِس بنا پر کی گئی کہ ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس حال میں اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔

مسند احمد میں مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''ایک عورت ایک گھر میں رہتی تھی، چنانچہ وہ مسلمانوں کے ایک لشکر کے ساتھ روانہ ہوئی، وہ

اپنے گھر میں بارہ بکریاں اور جولاہے کا ایک کوچ جس سے وہ تانا بانا درست کرتی تھی چھوڑ گئی۔ جب واپس لوٹی تو اسے نہ بکریاں ملیں اور نہ ہی کوچ ملا۔ چنانچہ وہ کہنے لگی: اے میرے رب! بے شک تو نے ہر اس شخص کو اس کے مال کی حفاظت کی ضمانت دی ہے جو تیرے راستے میں جہاد کے لیے نکلے۔ جبکہ مجھے نہ بکریاں مل رہی ہیں اور نہ کوچ۔ اب میں تجھ سے ان چیزوں کی واپسی کا سوال کرتی ہوں۔ پھر وہ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے مانگنے لگی۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو اسے دوگنا زیادہ بکریاں اور دو عدد کوچ مل گئے۔"[1]

اِس سے ثابت ہوا کہ جو شخص اللہ کے دین کی حفاظت کرتا رہے، اللہ تعالیٰ اسے ہر تکلیف سے بچاتا ہے۔ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے وہ اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے اور جو شخص تقویٰ کو ضائع کر دے وہ اپنے آپ کو ضائع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب ایک شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان حیوانات کو بھی اس کا حافظ بنا دیتا ہے جو عام طور پر انسان کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ کے ایک خادم جن کا نام سفینہ تھا، بیان کرتے ہیں کہ میں سمندر میں سفر کر رہا تھا کہ ہماری کشتی ٹوٹ گئی، چنانچہ ہم راستہ بھول گئے اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہمیں کدھر کو جانا ہے۔ اچانک ایک شیر ہمارے سامنے آ گیا، میرے ساتھی پیچھے ہٹے لیکن میں آگے بڑھا اور اس کے کان میں کہا: میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھی "سفینہ" ہوں اور ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمارے سامنے چلنے لگا، یہاں تک کہ ہمیں سیدھے راستے پر پہنچا دیا۔ پھر وہ ایک سائیڈ پر ہو گیا اور مجھے آگے دھکیل دیا۔ جیسا کہ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ ہے وہ راستہ جو تم بھول گئے تھے۔ اس کے بعد وہ آوازیں نکالنے لگا، جس سے میں نے یہ سمجھا کہ وہ ہمیں الوداع کہہ رہا ہے۔

اِس کے برعکس یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی پروا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا، چنانچہ وہ اس کی مخلوقات میں ضائع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اسے اس کے گھر والوں اور دیگر قریبی لوگوں میں سے اس آدمی سے بھی نقصان پہنچتا اور اذیت پہنچتی ہے جس سے وہ فائدہ حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے۔ جیسا کہ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ میں اللہ کی نافرمانی کرتا ہوں تو اس کا اثر اپنے نوکر کے اخلاق اور اپنی سواری میں محسوس کر لیتا ہوں۔

[1] مسند أحمد (67/5)

دوسری قسم:

(جو کہ دونوں میں زیادہ شرف والی ہے) یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دین وایمان کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ اسے اس کی زندگی میں گمراہ کن شبہات اور حرام شہوات سے محفوظ رکھتا ہے اور موت کے وقت اس کا خاتمہ دین وایمان پر کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ مومن جو اللہ کی حدود کی حفاظت کرتا ہے، اللہ اس کے دین کو محفوظ رکھتا ہے اور ہر اس چیز کے سامنے رکاوٹ بن جاتا ہے جو اس کے دین کو خراب کرنے والی ہو۔ اللہ حفاظت کے مختلف طریقوں کے ذریعے اسے ایسی چیزوں سے بچاتا رہتا ہے (جو دین کے لیے فاسد ہوں)، جبکہ اسے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا، حتی کہ وہ حفاظت کے بعض طریقوں کو ناپسند کرنے والا ہوتا ہے۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِۦ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَن رَّءَا بُرْهَٰنَ رَبِّهِۦ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُخْلَصِينَ﴾ [یوسف: ٢٤]

''چنانچہ اس عورت نے یوسف کا قصد کیا اور وہ بھی اس کا قصد کر لیتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے۔ اِس طرح ہم نے انھیں اس برائی اور بے حیائی سے بچا لیا کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔''

«اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ» وَفِيْ رِوَايَةٍ: «أَمَامَكَ»

اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی حدود اور اس کے حقوق کی حفاظت کرتا رہے، وہ جہاں بھی جائے گا، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ پائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے احاطۂ رحمت میں رکھے گا، اس کی مدد کرے گا، اس کی حفاظت کرے گا، اسے توفیق دے گا اور سیدھے راستے پر چلائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور نیکوکار لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سلف صالحین میں سے ایک بزرگ نے اپنے ایک بھائی کو لکھ کر بھیجا:

''حمد وصلاۃ کے بعد! اگر اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے تو تم کس سے خوف کھاتے ہو؟ اور اگر وہ تمھارے ساتھ نہیں تو پھر تمھیں کس سے امید ہے؟''

یہ اللہ تعالیٰ کی وہ ''معیتِ خاصہ'' ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے لیے ذکر کی گئی ہے:

﴿ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِىۡ مَعَكُمَاۤ اَسۡمَعُ وَاَرٰى ﴾ [طٰه: ٤٦]

''تم دونوں کسی سے مت ڈرنا، میں تمھارے ساتھ ہوں، میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔''

اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ ﴾ [الشعراء: ٦٢]

''ہرگز نہیں، بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے جو عنقریب میری راہنمائی کردے گا۔''

اسی طرح نبی ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے غار میں کہا تھا: «مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا» ''ان دو افراد کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔'' ﴿ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ ﴾ [التوبة: ٤٠] ''تم غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''[1]

یہ ''معیتِ خاصہ'' مدد، تائید، حفاظت اور اعانت کا تقاضا کرتی ہے، جبکہ ''معیتِ عامہ'' میں ایسا نہیں ہوتا۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ذکر کی گئی ہے:

﴿ مَا يَكُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمۡ وَلَا خَمۡسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰى مِنۡ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكۡثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمۡ اَيۡنَ مَا كَانُوۡا ۚ ﴾ [المجادلة: ٧]

''تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے، اور نہ پانچ کی مگر ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے، اور نہ اس سے کم کی اور نہ اس سے زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے، وہ جہاں بھی ہوں۔''

آیت میں مذکورہ معیت اللہ کے علم، اطلاع اور لوگوں کے اعمال کی نگرانی کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی طرح بندوں کے اس سے ڈرنے کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ جبکہ پہلی معیت (معیتِ خاصہ) بندے کی حفاظت اور نصرت کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ کے دین اور اس کے حقوق کی حفاظت کرتا رہے، وہ اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں اپنے سامنے اور اپنے ساتھ پاتا ہے۔ اور اسے اس کے ذریعے خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ اللہ کی دیگر مخلوق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

جب حسن رحمہ اللہ حجاج بن یوسف سے بھاگ کر حبیب بن محمد کے گھر میں داخل ہوئے تو حبیب نے ان سے کہا: اے ابوسعید! کیا تمھارے اور تمھارے رب کے درمیان کوئی ایسی خاص چیز نہیں جس کے ساتھ

[1] البخاري، كتاب فضائل الصحابة، باب مناقب المهاجرين، رقم الحديث (3653) ومسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي بكر، رقم الحديث: 1 (2381)

تم اسے پکارو تو وہ تمھیں ان (ظالموں) سے چھپا دے؟ وہ گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ پیچھے سے پولیس بھی پہنچ گئی، لیکن وہ حسن رضی اللہ عنہ کو نہ دیکھ سکی۔ یہ بات حجاج کو بتائی گئی تو اس نے کہا: وہ وہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے پولیس کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے نہ دیکھ سکی۔

«إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ»

''جب تم سوال کرنا چاہو تو اللہ ہی سے کرنا اور جب تم مدد مانگنا چاہو تو اللہ ہی سے مانگنا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ [الفاتحة: ٥]

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔''

کیونکہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے سے مراد اس سے دعا مانگنا اور اس کی طرف رغبت کرنا ہے اور دعا ہی دراصل عبادت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان دو جملوں میں واضح فرمایا کہ سوال صرف اللہ تعالیٰ سے کیا جائے، اس کے علاوہ کسی سے نہ کیا جائے اور مدد اسی سے طلب کی جائے، اس کے علاوہ کسی سے طلب نہ کی جائے۔

سوال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی یہی ہے:

﴿وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [النساء: ٣٢]

''اور تم اللہ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو۔''

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''کوئی ہے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کوئی ہے سوال کرنے والا کہ میں اسے اس کی مانگی ہوئی چیز عطا کروں؟ کوئی ہے معافی طلب کرنے والا کہ میں اسے معاف کر دوں؟''[1]

اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ ضرورتوں میں اس سے سوال کیا جائے، اس کی طرف رغبت کی جائے اور اس سے سوال اور دعا کرنے میں الحاح کیا جائے۔ (یعنی اس سے بار بار مانگا جائے) اور جو اس سے نہیں مانگتا وہ اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔ وہ اپنی تمام مخلوقات کو ان کی طلب کی ہوئی چیزیں عطا کر سکتا ہے اور اس سے اس کی ملکیت میں کچھ

[1] البخاري، كتاب التهجد، باب الدعاء والصلاة من آخر الليل، رقم الحديث (1145) ومسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب الترغيب في الدعاء، رقم الحديث: 168 (758)

بھی کی ہونے والی نہیں۔ جبکہ مخلوق کا معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ مخلوق اپنی بے بسی اور اپنی محتاجی کے پیشِ نظر نہیں چاہتی کہ اس سے سوال کیا جائے اور نہ وہ اس بات کو پسند کرتی ہے۔

اکیلے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے میں حکمت:

مخلوق کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے میں حکمت یہ ہے کہ بندہ خود بخود اپنے مفادات کو حاصل کرنے اور نقصانات سے بچنے سے قاصر ہے۔ اس کے دینی ودنیاوی مفادات کے حصول کے لیے اس کا کوئی مددگار نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ لہٰذا جس کی اللہ تعالیٰ مدد کرے تو درحقیقت اسی کی مدد کی گئی ہوتی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کر دے تو درحقیقت وہی رسوا ہوتا ہے۔

یہی معنیٰ ہے ”لا حول ولا قوۃ إلا باللہ“ کا، کیونکہ بندہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اسے منتقل نہ کرے۔ اسے اس کی طاقت نہیں ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی طاقت نہ دے۔ یہ کلمہ بڑا ہی عظیم کلمہ ہے اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

تو بندہ احکامات واوامر پر عمل کرنے اور محرمات ومنہیات سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مقدر کی ہوئی تمام چیزوں پر صبر کرنے، موت کے وقت اور موت کے بعد برزخ کی سختیوں اور قیامت کی ہولناکیوں کو برداشت کرنے میں بھی بندہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج ہے۔ مذکورہ تمام امور میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور اس کی مدد نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ سے ہی کما حقہ مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد کرتا ہے۔

ایک صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِحْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ»[1]

”تم ہر اس کام کے لیے کوشش کرو جو تمھارے لیے نفع بخش ہو اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہو اور کبھی عاجز نہ آؤ۔“

جو شخص اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا چھوڑ دے اور کسی اور سے مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی کے سپرد کر دیتا ہے، پھر وہ رسوا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اللہ کی قضا وقدر پوری ہو کے رہے گی:

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

[1] مسلم، کتاب القدر، باب الأمر بالقوۃ وترك العجز، رقم الحدیث: 34 (2664)

''اگر تمام لوگ مل کر تمھیں نفع پہنچانا چاہیں، جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے نہیں لکھا، تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہ سب کے سب مل کر تمھیں نقصان پہنچانا چاہیں، جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر نہیں لکھا، تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔''[1]

اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کو دنیا میں جو کچھ پہنچتا ہے، خواہ نفع ہو یا نقصان، تو وہ سب کچھ مقدر ہے۔ اور جو لوحِ محفوظ میں مقدر ومکتوب ہے اس کے سوا اسے کچھ نہیں ملتا، چاہے ساری مخلوق مل کر اس کے لیے کوشش کر لے۔

قرآن مجید میں اس کی کئی دلیلیں موجود ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُل لَّن يُصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَنَا﴾ [التوبة: ٥١]

''آپ کہہ دیجیے کہ ہمیں کوئی چیز پہنچ ہی نہیں سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھی ہوئی ہے۔''

اسی طرح اس کا فرمان ہے:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِى كِتَٰبٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَآ﴾ [الحديد: ٢٢]

''کوئی مصیبت نہیں آتی دنیا میں اور نہ (خاص) تمھاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔''

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ بندہ ایمان کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ اس بات پر یقین نہ کر لے کہ جو کچھ اسے پہنچا وہ اس سے چوکنے والا نہ تھا اور جو کچھ اس سے چوک گیا وہ اسے ملنے والا نہ تھا۔''[2]

وصیت کا دار ومدار:

حدیث میں مذکور پوری وصیت کا دار ومدار اسی اصول پر ہے (جو ابھی ذکر کیا گیا ہے) اور جو کچھ اس سے پہلے اور اس کے بعد ہے وہ اس اصول کی فروع ہیں، جو اسی اصول کی طرف ہی لوٹتی ہیں۔ لہٰذا

---

[1] مسند أحمد (307/1)

[2] مسند أحمد (441/6)

بندے کو جب یقینِ کامل ہو جائے کہ اسے خیر و شر اور نفع و نقصان میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لکھ رکھا ہے۔ اور پوری مخلوق مقدور کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے چاہے لاکھ جتن کر لے تب بھی وہ اسے قطعاً ملنے والی نہیں۔ جب اسے اس پر یقین ہو جاتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نفع و نقصان کا مالک ہے اور وہی دینے والا اور روکنے والا ہے۔ یہی بات بندے کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے رب کی توحید کو تسلیم کرے، اسی کی اطاعت کرے اور اس کی حدود کی پاسداری کرے، کیونکہ معبود کی عبادت کا مقصد اس کے ذریعے نافع چیزوں کو حاصل کرنا اور نقصان دہ چیزوں سے بچنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص کی مذمت کی ہے جو اس کی عبادت کرے جس کو نہ نفع پہنچانے کا اختیار ہے اور نہ ہی نقصان پہنچانے کا، بلکہ وہ عبادت کرنے والے کے کسی کام نہیں آسکتا۔

لہٰذا جو شخص یہ جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی نفع پہنچانے والا یا نقصان پہنچانے والا نہیں اور کوئی عطا کرنے والا یا روکنے والا نہیں، یہ چیز اس پر اس بات کو واجب کرتی ہے کہ وہ اکیلے اللہ تعالیٰ سے ڈرے، اسی سے امیدیں وابستہ کرے، اسی سے محبت کرے، اسی سے مانگے، اسی کے سامنے عاجزی و گریہ زاری کرے اور اس کی اطاعت کو مخلوق کی اطاعت پر ترجیح دے۔ اس کی ناراضی سے بچے، چاہے ساری مخلوق ناراض ہو جائے، اسی سے مدد مانگے، اسی سے سوال کرے۔ تنگ حالی اور خوشحالی دونوں حالتوں میں خالصتاً اسی سے دعا مانگے۔ اس طرح نہ کرے جس طرح مشرکین کرتے تھے کہ سختیوں میں بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے اور خوشحالی میں اسے بھلا دیتے تھے۔ اس کو چھوڑ کر اس سے مانگتے تھے جس سے نفع کی امیدیں لگا لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ [الزمر: ۳۸]

"آپ کہہ دیجیے کہ تمھارا کیا خیال ہے جن معبودوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا وہ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے نقصان کو دور کر دیں گے؟ یا وہ مجھے اپنی رحمت سے نوازنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک لیں گے؟ آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، بھروسا کرنے والے صرف اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔"

« رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ »

''قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔''

یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ ساری کی ساری تقدیریں بہت عرصے سے لکھی جا چکی ہیں اور یہ کام تمام ہو چکا ہے۔ کیونکہ کسی کتاب کی کتابت سے جب فراغت ہو جائے اور اس سے قلموں کو اٹھا لیا جائے اور اس پر لمبا عرصہ گزر جائے تو اٹھائے گئے قلم خشک ہو جاتے ہیں، ان کی روشنائی ختم ہو جاتی ہے اور وہ صحیفے بھی خشک ہو جاتے ہیں جن میں روشنائی کے ساتھ لکھا گیا ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی بلیغ اور خوبصورت کنایہ ہے۔

کتاب اللہ وسنتِ صحیحہ میں اِس بات کے کئی دلائل موجود ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ [الحدید: ۲۲]

''کوئی مصیبت نہیں آتی دنیا میں اور نہ (خاص) تمھاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کے لیے آسان کام ہے۔''

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ »[1]

''اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھ دیا تھا۔''

فوائدِ حدیث:

1. غیر اللہ سے ایسی چیز کا سوال کرنا حرام ہے جس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہ ہو۔
2. اس حدیث میں اس بات کی ترغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر نگران تصور کیا جائے، اس کے حقوق ادا کیے جائیں اور اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر کے اس پر توکل کیا جائے۔

[1] مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسی علیهما السلام، رقم الحدیث: 16 (2653)

3 جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور جس نے اس کے تقویٰ کو ضائع کر دیا اس نے اپنے آپ کو ضائع کر دیا اور اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہو گیا۔

4 چھوٹے بچوں کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اسی طرح انھیں تعلیم دی جائے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کریں اور اس کو اپنے اوپر نگران تصور کریں۔ اور قضا وقدر پر یقین رکھیں۔

5 اس حدیث میں اس بات کا ثبوت ہے کہ انبیاء ورسل علیہم السلام ہمیشہ اپنے پیروکاروں کے عقائد کی سلامتی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

6 جو کچھ اللہ کے علم میں ہے یا جس چیز کو اس نے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے وہ ہمیشہ رہنے والی ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

7 اس حدیث میں اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نوخیز بچوں کی تربیت کا اہتمام فرمایا، تاکہ وہ مستقبل کے لیڈر بن سکیں۔

سوالات:

1 یہ حدیث عظیم وصیتوں اور دین کے اہم ضابطوں پر مشتمل ہے، اس کی وضاحت کریں۔

2 ایک مسلمان اپنے رب کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے؟

3 بدلہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا عمل ہوتا ہے۔ اس بارے میں حدیث پیش کریں جو اس کی تائید کرے۔

4 درج ذیل حقائق کے دلائل قرآن مجید سے پیش کریں:

- اللہ تعالیٰ نیک بندے کی حفاظت اس کی اولاد کی حفاظت کے ذریعے کرتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ نیک بندے کی حفاظت اس کے اعضاء کی حفاظت کے ذریعے کرتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ نیک بندے کی حفاظت اس کے مال کی حفاظت کے ذریعے کرتا ہے۔

5 بندے کا اپنے رب سے سوال کرنا، بندے کا اپنے جیسی مخلوق سے سوال کرنا ...... ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

6 اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ کا اس حدیث سے کیا تعلق ہے؟ اور اس میں ﴿ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟

7 نبی ﷺ کا یہ ارشاد: «رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ» کس بات کی دلیل ہے؟

8 مصیبتوں اور آزمائشوں میں ایک مومن اور ایک مشرک کا موقف کیا ہوتا ہے؟ دونوں میں مقارنہ کریں۔

9 اسلام مومنوں کی تربیت شجاعت و بہادری اور آگے بڑھنے جیسی صفات پر کرتا ہے۔ اس حدیث کے کن الفاظ سے آپ کو اس بات کی دلیل ملتی ہے؟



حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے

20 سیدنا ابومسعود عقبہ بن عمرو الانصاری البدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسَ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولٰى، إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ»[1]

''پہلی نبوت کے کلام میں سے جو کچھ لوگوں نے پایا ہے، اس میں سے یہ بھی ہے کہ جب تمھارے اندر حیا نہ رہے تو پھر تم جو چاہو کرو۔''

راوی حدیث:

سیدنا عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ الخزرجی، ابو مسعود الانصاری، اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ آپ عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ۱۰۲ احادیث روایت کیں اور آپ کی وفات ۴۰ھ کے بعد ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: «إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسَ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولٰى» اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ کلام سابقہ انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے اور ہر زمانے میں لوگوں نے اسے اپنے آباء واجداد سے سیکھا اور ایک دوسرے سے نقل کیا اور یہ متقدمین انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا حصہ رہا، پھر مختلف لوگوں میں مشہور رہا یہاں تک کہ اس امت کے اولین لوگوں تک پہنچا۔

«إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ» کا معنی:

اس کے معنی میں دو قول ہیں:

- پہلا قول:

اس میں اس بات کا حکم نہیں کہ جس شخص میں حیا نہیں، وہ جو چاہے کرے، بلکہ اس میں درحقیقت اس کی مذمت ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں امر تہدید ووعید کے معنی میں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارے اندر حیا نہیں تو تم جو چاہو کرو، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا بدلہ دینے والا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

[1] رواه البخاري، كتاب الأنبياء، باب حدثنا أبو اليمان، رقم الحديث (3483)

﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [فصلت: ٤٠]

''تم جو چاہو عمل کرو، وہ (اللہ) تم جو کچھ کر رہے ہو اسے یقیناً خوب دیکھنے والا ہے۔''

اسی طرح اس کا فرمان ہے:

﴿ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ﴾ [الزمر: ١٥]

''تم اس (اللہ) کو چھوڑ کر جس کی چاہو پوجا کرو۔''

یا پھر اس میں امر خبر کے معنی میں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس میں حیا نہیں ہوتی وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیونکہ برے اعمال سے روکنے والی چیز حیا ہے اور جو شخص بے حیا ہو وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں میں منہمک ہو جاتا ہے اور ہر ایسا کام کرتا ہے جس سے ایک باحیا انسان اپنے دامن کو بچاتا ہے۔

اس کی مثال نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [1]

اس حدیث میں امر خبر کے معنی میں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے نبی ﷺ پر جھوٹ گھڑا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا۔

حدیث کے اسی معنی کو ابو عبید القاسم بن سلام، ابن قتیبہ اور محمد بن نصر رحمہم اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔ اور ابو داود رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کا قول بیان کیا ہے۔

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:

''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کی ہلاکت کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس سے حیا کو سلب کر لیتا ہے، اور جب حیا کو سلب کرتا ہے تو وہ آپ کی نظروں میں ناپسندیدہ بن جاتا ہے، اور جب وہ ناپسندیدہ بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے امانت کو سلب کر لیتا ہے، چنانچہ وہ خائن بن جاتا ہے، اور جب وہ خائن بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے رحمت کو سلب کر لیتا ہے، چنانچہ آپ اسے بد زبان اور سخت دل پاتے ہیں، اور جب وہ بد زبان اور سخت دل بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن سے ایمان کی رسی کو نکال لیتا ہے۔ اور جب اس کی گردن سے ایمان کی رسی کو نکالتا ہے تو وہ ملعون شیطان بن جاتا ہے۔''

---

[1] البخاري، كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي ﷺ رقم الحديث (110) ومسلم، المقدمة، باب تغليظ الكذب على الرسول ﷺ، رقم الحديث: 3 (3)

جب کہ نبی ﷺ نے حیا کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک انصاری آدمی کے پاس سے ہوا جو اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا اور ڈانٹ رہا تھا۔ (یعنی اسے کہہ رہا تھا کہ تم ہر وقت شرماتے ہی رہتے ہو اور حیا کی وجہ سے فلاں فلاں کام نہیں کرتے اور یہ چیز تمھارے لیے نقصان دہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيْمَانِ» [1] ''اسے چھوڑ دو، کیونکہ حیا ایمان میں سے ہے۔''

صحیحین میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ» ''حیا خیر ہی کو لاتی ہے۔''

اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے: «اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ» یا فرمایا: «اَلْحَيَاءُ كُلُّهُ خَيْرٌ» [2]

''حیا پوری کی پوری خیر ہے۔''

مسند احمد اور سنن نسائی میں اشج عبدالقیس العصری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا:

«إِنَّ فِيكَ لَخُلُقَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ»

''تمھارے اندر دو صفات ایسی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔''

میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی ہیں؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْحِلْمُ وَالْحَيَاءُ» ''بردباری اور حیا ہیں۔''

میں نے کہا: یہ بہت پہلے سے ہیں یا ابھی کچھ عرصے سے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بہت عرصے سے۔

تو میں نے کہا: اس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میرے اندر ایسی دو صفات رکھ دی ہیں جنھیں وہ پسند کرتا ہے۔ [3]

حیا کی دو قسمیں:

حیا کی دو قسمیں ہیں:

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب الحياء، رقم الحديث (6118) ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان عدد شعب الإيمان، رقم الحديث: 59 (36)

[2] البخاري، كتاب الأدب، باب الحياء، رقم الحديث (6117) ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان عدد شعب الإيمان، رقم الحديث: 61 (37)

[3] مسند أحمد (205/4، 206)، النسائي في الكبرىٰ، كتاب المناقب، باب الأشج، رقم الحديث (8306) وصححه الألباني في صحيح الأدب المفرد، باب التؤدة في الأمور.

1 فطری حیا: جو ہر انسان میں فطری طور پر ہوتی ہے اور یہ اعلیٰ اخلاق کی ان صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کو عطا کرتا اور اسے ان پر پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''حیا خیر ہی کو لاتی ہے۔'' یہ حیا انسان کو گندے، گھٹیا اور برے اعمال کے ارتکاب سے منع کرتی ہے اور اسے اچھے اور اعلیٰ اخلاق کو اپنانے پر آمادہ کرتی ہے۔ اِس اعتبار سے یہ ایمان کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔

2 ایمانی حیا: یہ حیا اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی عظمت کی پہچان اور بندوں سے اس کے قرب، اس کی اطلاع، خیانت کرنے والی آنکھوں اور جو کچھ سینوں میں چھپا ہوتا ہے اس کے بھی علم پر یقین کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

یعنی یہ حیا انسان میں اس طرح آتی ہے کہ وہ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو نگران تصور کرے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کو نگران تصور کرے گا اور اسے یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے ہر وقت اور ہر جگہ اور ہر حال میں دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے اور اس کی تمام حرکات وسکنات اس کے علم میں ہیں تو وہ اس سے حیا کرتے ہوئے اس کی نافرمانی سے اجتناب کرے گا۔

یہ حیا ایمان کی اعلی خصلتوں میں سے ایک خصلت بلکہ یہ احسان کے اعلی درجات میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ سے یہ حیا بعض اوقات اس کی بے شمار نعمتوں کا مطالعہ کرنے اور ان کا شکر ادا کرنے میں اپنی کوتاہی کا احساس کرنے سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

جب بندے سے یہ حیا سلب کر لی جائے تو پھر برے اعمال اور گھٹیا امور کے ارتکاب سے اسے منع کرنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس کے اندر ایمان ہے ہی نہیں۔

بشر بن کعب العدوی نے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا:

''ہم بعض کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ حیا میں سے کچھ حیا ایسی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے وقار کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی تعلیم دیتی ہے اور اس سے سکون نصیب ہوتا ہے، جبکہ کچھ ایسی ہوتی ہے جو انسان کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔''

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما یہ سن کر ناراض ہو گئے اور کہا: میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں کہ ''حیا پوری کی پوری خیر ہے۔'' اور تم اس کے مقابلے میں دوسری بات کر رہے ہو!!!

حقیقت میں معاملہ اسی طرح ہے جیسا کہ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے بیان کیا۔ کیونکہ نبی ﷺ

کی حدیثِ مبارک میں جس قابلِ تعریف حیا کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد وہ خلق ہے جو انسان کو اچھا عمل کرنے اور برے عمل سے بچنے پر آمادہ کرے۔ جہاں تک کمزوری اور بے بسی کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے حقوق یا اس کے بندوں کے حقوق میں سے کسی حق میں کوتاہی کا موجب بنے تو وہ حیا میں سے ہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ کمزوری، بے بسی اور ذلت و رسوائی ہے۔

«إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ» کے معنی میں دوسرا قول:

اس میں امر بمعنی امر ہی ہے، یعنی اگر تمھارے اندر حیا نہ ہو تو پھر تم جو چاہو کرو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم جس کام کے کرنے کا ارادہ کرتے ہو وہ ان کاموں میں سے ہو جن کے کرنے سے حیا نہیں کی جاتی، نہ اللہ تعالیٰ سے اور نہ لوگوں سے، کیونکہ وہ عبادات میں سے، خوبصورت اخلاق اور اچھے آداب میں سے ہے، تو پھر آپ ان کاموں میں سے جو چاہیں کریں۔

یہ ائمہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ جن میں ابو اسحاق المروزی الشافعی رحمہ اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح کا ایک قول امام احمد رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح کا ایک قول بعض سلف صالحین سے بھی مروی ہے، جب ان سے مروت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: مروت یہ ہے کہ تم چھپ کر بھی وہ عمل نہ کرو جس کو لوگوں کے سامنے کرنے سے شرم کرتے ہو۔

جبکہ ابو عبید رحمہ اللہ نے اس حدیث کے معنی میں ایک اور قول جریر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کوئی خیر کا کام کرنا چاہتا ہو، پھر وہ لوگوں سے شرم کرتے ہوئے اسے ترک کر دے، گویا کہ وہ ریا کاری سے ڈر رہا ہو۔ تو اس صورت میں حیا مانع نہیں ہونی چاہیے اور آپ جو کرنا چاہتے ہوں کر گزریں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَإِذَا جَاءَ الشَّيْطَانُ وَأَنْتَ تُصَلِّي فَقَالَ: إِنَّكَ تُرَائِي، فَزِدْ وَأَطِلْ»[1]

''جب تم نماز پڑھ رہے ہو اور تمھارے پاس شیطان آئے اور کہے کہ تم تو ریا کاری کر رہے ہو، تو اس نماز کو اور زیادہ لمبا کرو۔''

ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس حدیث کا سیاق اور اس کے الفاظ مذکورہ معنی کی تائید نہیں کرتے اور نہ ہی اسے لوگوں نے اس پر محمول کیا ہے۔

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (223/2)، شعب الإيمان (6884)

حافظ ابن رجب ؒ کہتے ہیں: جو کچھ جریر ؒ نے کہا، اگر اس حدیث سے وہی معنی مراد ہوتا تو حدیث کے الفاظ یہ ہوتے: ''جب تم اس چیز سے حیا کرو جس سے حیا نہیں کی جاتی تو پھر تم جو چاہو کرو۔'' جبکہ حدیث کے الفاظ سے اس مفہوم کا بعید ہونا کسی پر مخفی نہیں ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. یہ مقولہ « إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ » ہر زمانے کے لوگوں کو انبیائے کرام علیہم السلام سے موروثی طور پر ملا۔
2. بڑی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت یہ ہے کہ بندے سے حیا کو سلب کر لیا جائے۔
3. جس شخص میں حیا نہیں ہوتی وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں میں منہمک ہو جاتا ہے۔
4. حیا کی دو قسمیں ہیں: ایک فطری اور دوسری وہ جو حاصل کی جاتی ہے۔

سوالات:

1. « إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسَ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَىٰ » کا کیا مفہوم ہے؟
2. « فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ » کے مفہوم کے بارے میں اہلِ علم کے دو قول ہیں۔ انھیں ذکر کریں اور ان میں سے جو زیادہ صحیح ہو اسے اختیار کریں اور اختیار کرنے کا سبب بھی ذکر کریں۔
3. حیا کا کیا فائدہ ہے؟
4. حیا ایمان میں سے کیسے ہے؟
5. حیا اور کمزوری میں فرق واضح کریں۔
6. حیا کے حصول کے لیے کئی اسباب ہیں، ان میں سے جو آپ کو معلوم ہوں انھیں ذکر کریں۔



راعی اور رعیت کی استقامت

21 سیدنا ابوعمرو (اور ابوعمرہ بھی کہا گیا ہے) سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتا دیں کہ اس کے بعد میں کسی اور سے کوئی سوال نہ کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«قُلُ آمَنْتُ بِاللّٰهِ، فَاسْتَقِمُ»[1]

''تم کہو: میں اللہ پر ایمان لایا، پھر استقامت اختیار کرو۔''

راویِ حدیث:

سیدنا سفیان بن عبداللہ بن ابی ربیعہ الثقفی رضی اللہ عنہ، طائف کے وفد کے ساتھ آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے طائف کے صدقات کا ذمہ دار بنایا تھا۔ آپ نے پانچ حدیثیں روایت کی ہیں۔ آپ کی وفات ۴۰ھ میں ہوئی۔[2]

حدیث کا اجمالی معنیٰ:

اس حدیث میں سیدنا سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ مجھے اسلام کے بارے میں کسی جامع بات کی تعلیم دے دیں جو میرے لیے کافی ہو جائے۔ اور اس کے بعد مجھے کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس پر ڈٹ جاؤ اور استقامت اختیار کرو۔''

دوسری روایت میں ہے کہ ''تم یہ کہو کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے، پھر اس پر استقامت اختیار کرو۔''[3]

---

[1] رواہ مسلم، کتاب الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام، رقم الحدیث: 62 (38)

[2] الإصابة (53/2)

[3] رواہ الترمذي، کتاب الزهد، باب ما جاء في حفظ اللسان، رقم الحدیث (2410) وابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان في الفتنة، رقم الحدیث (3972)

حدیث کا قرآن سے تعلق:

نبی کریم ﷺ کا مذکورہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ﴾ [فصلت: ۳۰۔ ۳۲]

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے، پھر اس (عقیدۂ توحید اور عملِ صالح) پر جمے رہے ان پر فرشتے (دنیا میں یا موت کے وقت یا قبر میں) اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم (آنے والے مراحل سے) نہ ڈرو اور نہ ہی (اہل وعیال کو چھوڑنے کا) غم کرو اور تم اس جنت کی خوشخبری سن لو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں تمھارے دوست اور مددگار رہے اور آخرت میں بھی رہیں گے اور وہاں تمھیں ہر وہ چیز ملے گی جس کی تمھارا نفس خواہش کرے گا اور وہ چیز جس کی تم تمنا کرو گے۔ یہ اس کی طرف سے تمھاری میزبانی ہوگی جو نہایت معاف کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

اسی طرح اللہ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ۱۳۔ ۱۴]

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جمے رہے تو ان پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان اعمال کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ﴿ اسْتَقَامُوْا ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ اس کا معنی ہے:

- انھوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا۔
- پھر کسی اور کی طرف انھوں نے التفات ہی نہ کیا۔
- پھر اس بات پر ڈٹ گئے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے۔[1]

[1] تفسیر ابن کثیر (98/4) [سورۃ الأحقاف: 13]

اسی طرح کی تفسیر حضرت انس رضی اللہ عنہ، مجاہد، زید بن اسلم، سدی اور عکرمہ رحمہم اللہ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کی تفسیر میں کہا:

''وہ اس کے فرائض کو ہمیشہ ادا کرتے رہے۔''[1]

جس نے اس کا معنی توحید پر استقامت اختیار کرنا کیا ہے، شاید اس کا مقصد توحیدِ کامل ہے جو اپنے ماننے والے پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیتی ہے۔ اور وہ ہے ''لا الہ الا اللہ'' کے حقیقی معنی و مفہوم کو ماننا اور تسلیم کرنا۔ اور ''إلٰہ'' وہ ہوتا ہے جس کی فرمانبرداری کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے۔ اس کی خشیت، عظمت، ہیبت اور محبت کی وجہ سے اس سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے، اس پر توکل کرتے ہوئے اور اس سے دعا مانگتے ہوئے۔ جبکہ تمام معاصی اس توحید میں نقص پیدا کرتی ہیں، کیونکہ معاصی کے ارتکاب کا معنی ہے: خواہشِ نفس اور شیطان کی اتباع کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ [الجاثیة: ۲۳]

''آپ کا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا؟''

حسن رحمہ اللہ وغیرہ کہتے ہیں: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں جو بھی خواہش ہو وہ اسے پورا کرنے پر تل جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں ان کا قول مروی ہے کہ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے اس کی پوجا شروع کر دیتا ہے۔[2]

تو یہ چیز توحید پر استقامت کے منافی ہے۔

جہاں تک « قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ » والی روایت کا تعلق ہے تو اس کا معنی بالکل واضح ہے، کیونکہ سلف صالحین اور ان کے پیروکار اہل الحدیث کے نزدیک ایمان میں اعمالِ صالحہ بھی داخل ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [ھود: ۱۱۲]

''پس آپ راہِ حق پر قائم رہیے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے آپ کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا ہے اور تم لوگ سرکشی نہ کرو۔ بے شک وہ (اللہ) تمھارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر (99/4) [سورۃ الأحقاف: 13]

[2] تفسیر ابن کثیر (150/4) [سورۃ الجاثیة: 23]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور ان کے ساتھ تمام توبہ کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ استقامت اختیار کریں اور انھیں جو احکامات دیے گئے ہیں ان سے تجاوز نہ کریں، کیونکہ تجاوز کرنا سرکشی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں منع کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں خبردار کیا کہ وہ ان کے تمام اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے اور اسے ان پر اطلاع حاصل ہے۔

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾ کی تفسیر میں قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: محمد ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کے امر پر استقامت اختیار کریں اور ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں: انھیں قرآن پر استقامت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔[1]

قشیری رحمہ اللہ وغیرہ نے بعض سلف سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو خواب میں دیکھا تو کہا: یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ «شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا» ''مجھے سورت ہود اور اس جیسی کئی اور سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔'' تو اس سورت کی کس چیز نے آپ کو بوڑھا کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اللہ کے اس فرمان نے بوڑھا کیا: ﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾''

''استقامت'' سے مراد صراطِ مستقیم (مضبوط دین) سے دائیں، بائیں نکلے بغیر اس پر مستقل مزاجی سے چلنا ہے۔ اور اس میں تمام ظاہری اور باطنی عبادات پر عمل کرنا اور ممنوعات کو ترک کرنا شامل ہے۔ اِس لحاظ سے نبی ﷺ کی یہ وصیت دین کے تمام اعمال پر مشتمل ہے۔

استقامت اور استغفار ایک ساتھ:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاسْتَقِيمُوٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ﴾ [فصلت: ٦]

''تم اس (اللہ) کی طرف استقامت اختیار کرو اور اس سے گناہوں کی معافی طلب کرو۔''

اس آیت میں استقامت اور استغفار دونوں کا ایک ساتھ حکم دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اس میں یقیناً کمی کوتاہی واقع ہو سکتی ہے، تو اس کا ازالہ کرنے کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ اور استغفار توبہ کا اور استقامت کی طرف لوٹنے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا:

«اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا»[2]

''تم جہاں رہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور برائی کے بعد نیکی کرنا جو اسے مٹا دے گی۔''

---

1. الدر المنثور، سورۃ ہود
2. اس کی تخریج حدیث نمبر: 18 میں گزر چکی ہے۔

ایک حدیث میں نبی ﷺ نے اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ لوگ کما حقہ استقامت اختیار نہیں کر سکتے۔ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«سَدِّدُوا وَقَارِبُوا»[1]

«سَدِّدُوا» میں سداد سے مراد حقیقی استقامت ہے جس کا معنی ہے: تمام اقوال واعمال اور مقاصد میں سیدھی راہ اختیار کرنا، جیسا کہ ایک شخص کسی ہدف کو نشانہ بناتا ہے تو اس کا وار سیدھا نشانے پر لگتا ہے۔ اور «وَقَارِبُوا» میں مقاربت سے مراد یہ ہے کہ اگر اس کا وار سیدھا نشانے پر نہ لگے تو کم از کم اس کے قریب قریب ضرور لگے، بشرطیکہ اس کا عزم اصل ہدف کو پانا اور ٹھیک نشانے پر وار کرنا ہو۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم سیدھا چلنے، ہدف کو پانے اور مستقیم رہنے کا قصد کرو، کیونکہ اگر تم تمام اعمال ٹھیک طریقے سے کرو گے تو تمھیں جس چیز کا حکم دیا گیا تم نے اسے پورا کر دیا۔

اعضاء کی استقامت دل کی استقامت پر موقوف ہے:

استقامت کی بنیاد توحید پر دل کی استقامت ہے، جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے «ثُمَّ اسْتَقَامُوا» کی تفسیر کی ہے اور وہ پہلے گزر چکی ہے۔

جب دل اللہ تعالیٰ کی معرفت، خشیت، عظمت، ہیبت اور محبت پر اس طرح مستقیم ہو کہ اس میں بس اسی سے امید ہو، اسی کا خوف ہو، اسی پر توکل ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگے اور اس کے علاوہ باقی سب چیزوں سے اعراض کرے تو انسان کے اعضاء بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر استقامت اختیار کر لیتے ہیں، کیونکہ دل باقی تمام اعضاء کا بادشاہ ہے اور اعضاء اس کے لشکر ہیں۔ اگر بادشاہ مستقیم ہو تو اس کے لشکر اور عام رعایا بھی مستقیم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ کے اس فرمان: ﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الروم: ٣٠] کی تفسیر بھی کی گئی ہے کہ آپ اللہ ہی کے لیے تمام اعمال سرانجام دیں، بس اسی کا قصد و ارادہ کریں، کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں۔

---

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، رقم الحديث (6464) ومسلم، كتاب صفات المنافقين، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله، رقم الحديث: 78 (2818)

دل کے بعد سب سے زیادہ جس عضو کی استقامت مطلوب ہے وہ ہے: زبان، کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے اور اس کی طرف سے اظہار کرتی ہے۔

اسی لیے نبی ﷺ نے جب سفیان بن عبداللہ الثقفی رضی اللہ عنہ کو استقامت کا حکم دیا تو وہ اس کے بعد اپنی زبان کی حفاظت کرتے تھے۔ مسند احمد میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَسْتَقِيمُ إِيمَانُ عَبْدٍ حَتَّى يَسْتَقِيمَ قَلْبُهُ، وَلَا يَسْتَقِيمُ قَلْبُهُ حَتَّى يَسْتَقِيمَ لِسَانُهُ»[1]

''بندے کا ایمان مستقیم نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس کا دل مستقیم ہو جائے اور اس کا دل مستقیم نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس کی زبان مستقیم ہو جائے۔''

اور سنن ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا، یا انھوں نے نبی ﷺ سے مرفوعاً بیان کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ، فَتَقُولُ: اِتَّقِ اللّٰهَ فِينَا، فَإِنَّمَا نَحْنُ بِكَ، فَإِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا، وَإِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا»[2]

''جب ابنِ آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء انتہائی عاجزی کے ساتھ زبان سے التماس کرتے ہیں کہ ہمارے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، کیونکہ ہم تمھارے ساتھ معلق ہیں۔ اگر تم سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تم ٹیڑھی ہوگئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔''

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث نبی ﷺ کی جامع احادیث میں سے ایک ہے۔
2. ایمان کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے جب تک کہ ایمان کی دلیل عمل نہ ہو، عمل ایمان کا عملی ترجمہ اور اس کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ ہے۔
3. اللہ عزوجل نے انسان کے لیے زندگی گزارنے کا ایک طریقہ کار مقرر کر دیا ہے اور ایک لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے جس پر چل کر وہ اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کو پورا کر سکتا ہے۔

---

[1] أخرجه أحمد في المسند (198/3) وبلفظ أتم منه.

[2] الترمذي، كتاب الزهد، باب ما جاء في حفظ اللسان، رقم الحديث (2407) وذكر أن الموقوف أصح وصححه الألباني.

4 استقامت ایک ایسا بلند وبالا درجہ ہے جو مکمل ایمان اور بلند ہمت کی دلیل ہے۔

5 استقامت انسان کو بلندیوں کی طرف لے کے جاتی ہے اور اسے کمال کی چوٹی تک پہنچا دیتی ہے اور اس کی عقل، اس کے دل اور نفس کو فاسد ہونے سے بچاتی اور ان کی حفاظت کرتی ہے۔

6 مسلمان سیدھے راستے پر چلنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر مکمل طور پر سیدھا نہ چل سکے تو اس کے قریب قریب رہنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔

سوالات:

1 حدیث کا اجمالی معنی ذکر کریں۔

2 اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [الانعام: ١٥٣] اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے یہ واضح کیجیے کہ اللہ کے راستے سے ہٹنے کا انسانی زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے؟

3 درج ذیل خالی جگہیں پر کیجیے:

أ: استقامت سے مراد ہے: ....

ب: دل کے بعد اعضاء میں سے جس عضو کی استقامت سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہے: .... کیونکہ ....

ج: "سداد" سے مراد ہے تمام .... میں سیدھی راہ اختیار کرنا۔ اور مقاربت سے مراد یہ ہے کہ جو .... کے قریب ہو اسے نشانہ بنانا۔

4 اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ ﴾ [فصلت: ٦] میں استقامت اور استغفار ایک ساتھ کیوں ذکر کیے گئے ہیں؟

5 حدیث میں جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اسے کس طرح عملی جامہ پہنا سکتے ہیں؟



فرائض ونوافل

22 سیدنا ابوعبداللہ جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: أَرَأَيْتَ إِذَا صَلَّيْتُ الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوبَاتِ، وَصُمْتُ رَمَضَانَ، وَأَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ، وَلَمْ أَزِدْ عَلَى ذٰلِكَ شَيْئًا، أَأَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: «نَعَمْ»[1]

ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں فرض نمازیں پڑھتا رہوں، رمضان کے روزے رکھتا رہوں، حلال کو حلال سمجھوں اور حرام کو حرام تصور کروں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں۔''

راویِ حدیث:

سیدنا جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام الخزرجی ابوعبداللہ، جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیعتِ رضوان کی ان میں سے مشہور صحابی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ علمائے صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے لیے نبی ﷺ نے ایک ہی رات میں پچیس مرتبہ استغفار کیا تھا۔ آپ نے ۱۵۴۰ حدیثیں روایت کی ہیں اور آپ کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی۔

حدیث کا مفہوم:

«وَأَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ» کا ایک معنی تو وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی حلال کو حلال سمجھنا اور حرام کو حرام تصور کرنا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ حلال پر عمل کروں گا اور اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو حرام نہ ہو، یعنی واجب، مستحب اور مباح سب چیزیں شامل ہیں۔ اور جو چیزیں مباح کی گئی ہیں انھیں چھوڑ کر غیر مباح چیزوں کی طرف نہیں بڑھوں گا۔ اور جہاں تک حرام چیزوں کا تعلق ہے تو ان سب سے اجتناب اور پرہیز کروں گا۔ جبکہ کفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ وہ حرمت والے مہینوں میں حسبِ منشا تبدیلی کر لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] رواه مسلم، كتاب الإيمان، باب الإيمان الذي يدخل الجنة، رقم الحديث: 18 (15)

﴿ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ ﴾ [التوبة: ٣٧]

''مہینوں کا آگے پیچھے کر دینا کفر کی زیادتی ہے۔ اس سے وہ لوگ گمراہی میں ڈالے جاتے ہیں جو کافر ہیں۔ ایک سال تو اسے حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال اسی کو حرمت والا کر لیتے ہیں تا کہ اللہ نے جس کو حرمت والا بنایا ہے اس کی گنتی میں تو موافقت کر لیں۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک سال حرمت والے مہینے میں قتال کرتے تھے اور اس کی حرمت کو حلال کر لیتے تھے۔ اور دوسرے سال اسی مہینے کو حرمت والا سمجھتے ہوئے اس میں قتال نہیں کرتے تھے۔

امثال میں سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے کہ ''فُلَانٌ لَا يُحَلِّلُ وَلَا يُحَرِّمُ'' یعنی فلاں آدمی نہ حلال کو حلال سمجھتا ہے اور نہ حرام کو حرام۔ یہ مثال تب پیش کی جاتی ہے جب وہ حرام کام کا ارتکاب کرنے سے نہ رکے اور جو چیز اس کے لیے مباح کی گئی ہے صرف اسی پر اکتفا نہ کرے، خواہ وہ حرام چیز کی حرمت کا عقیدہ رکھتا ہو۔ تو مذکورہ مثال پیش کرنے والے لوگ اس شخص کو جو حرام کام کا ارتکاب کرے اور اس سے پرہیز نہ کرے اسے حلال سمجھنے والا تصور کرتے ہیں اگرچہ وہ اس کو حلال نہ سمجھتا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص واجبات وفرائض کو ادا کرتا رہے اور محرمات سے اجتناب کرتا رہے تو وہ یقیناً جنت میں داخل ہوگا۔ نبی ﷺ کی احادیث تواتر کی حد تک ثابت ہیں جو اسی معنی پر یا اس کے قریب قریب معنی پر دلالت کرتی ہیں۔

جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو بندہ پانچ نمازیں پڑھتا رہے، رمضان کے روزے رکھتا رہے، زکات دیتا رہے اور سات بڑے گناہوں سے بچتا رہے تو اس کے لیے جنت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں، وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔ پھر نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿ إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا ﴾ [النساء: ٣١][1]

[1] أخرجه ابن حبان، رقم الحديث (1748) النسائي، كتاب الزكاة، باب وجوب الزكاة، رقم الحديث (2438) بدون ذكر الآية، والحاكم في المستدرك: (240/2) مختصراً.

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تمھاری برائیوں کو مٹا دیں گے اور تمھیں عزت والی جگہ میں داخل کریں گے۔''

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ نجد میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، اس کی آواز کی گنگناہٹ سنائی دیتی تھی، لیکن اس کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ قریب آ گیا۔ چنانچہ وہ اسلام کے متعلق سوال کرنے لگا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ » ''دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔''

اس نے کہا: کیا ان کے علاوہ بھی کوئی نماز فرض ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ » ''نہیں، البتہ تم نفلی نماز پڑھنا چاہو تو پڑھ سکتے ہو۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « وَصِيَامُ رَمَضَانَ » ''اور رمضان کے روزے بھی فرض ہیں۔''

اس نے کہا: کیا ان کے علاوہ بھی کوئی روزہ فرض ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ » ''نہیں، البتہ تم نفلی روزہ رکھنا چاہو تو رکھ سکتے ہو۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے زکات بھی ذکر کی۔

تو اس نے کہا: کیا اس کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ » ''نہیں، البتہ تم نفلی طور پر خرچ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔''

چنانچہ وہ شخص پیٹھ پھیر کر یہ کہتے ہوئے جانے لگا کہ « وَاللّٰهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هَذَا وَلَا أَنْقُصُ » ''اللہ کی قسم! میں نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ ہی اس سے کم۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ » ''اگر اس نے واقعتاً ایسے ہی کیا تو یہ کامیاب ہو گیا۔''

ایک روایت میں ہے: « دَخَلَ الْجَنَّةَ إِنْ صَدَقَ » [1] ''اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ جنت میں داخل ہو گیا۔''

اس حدیث میں اعرابی کی مراد یہ ہے کہ وہ فرض نماز، فرض زکات، فرض روزے اور فرض حج پر نوافل کا اضافہ نہیں کرے گا۔ یہ مراد نہیں کہ وہ اسلام کے دیگر احکامات اور واجبات میں سے کسی پر عمل نہیں کرے گا۔

---

[1] البخاري، كتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان، رقم الحديث (1891) ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الصلوات التي هي أحد أركان الإسلام، رقم الحديث: 8 (11)

مذکورہ حدیث میں محرمات سے اجتناب کا تذکرہ نہیں ہے، کیونکہ سائل نے نبی ﷺ سے صرف ان اعمال کے بارے میں سوال کیا تھا جن پر عمل کرنے والا شخص جنت میں داخل ہو جائے۔ جبکہ صحیح احادیث میں یہ ثابت ہے کہ بعض کبیرہ گناہوں کا ارتکاب جنت میں داخل ہونے سے مانع ہوگا، مثلاً:

① قطع رحمی:

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ»[1] ”قطع رحمی کرنے والا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

② تکبر:

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ»[2]

”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو۔“

③ قرض کی عدمِ ادائیگی:

قرض کی عدمِ ادائیگی کی وجہ سے جنت میں داخلہ ممنوع ہوگا، یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دے۔ اس بارے میں متعدد احادیث آئی ہیں۔ ان میں سے ایک میں محمد بن جحش رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، پھر اپنی ہتھیلی کو اپنی پیشانی پر رکھا اور فرمایا:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ، مَاذَا نُزِّلَ مِنَ التَّشْدِيدِ»

”تعجب ہے آج کتنی شدید بات نازل ہوئی ہے۔“

ہم خاموش رہے اور گھبرا گئے۔ پھر جب اگلا دن آیا تو میں نے کہا: یا رسول اللہ! وہ سخت بات کون سی تھی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَوْ أَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْيِيَ، ثُمَّ قُتِلَ ثُمَّ أُحْيِيَ، ثُمَّ قُتِلَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ دَيْنُهُ»[3]

---

① البخاري، كتاب الأدب، باب إثم القاطع، رقم الحديث (5984) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب صلة الرحم، رقم الحديث: 18 (2556)

② مسلم، كتاب الإيمان، باب تحريم الكبر، رقم الحديث: 149 (91)

③ النسائي، كتاب البيوع، باب التغليظ في الدين، رقم الحديث (4697)

''اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر ایک آدمی اللہ کے راستے میں شہید ہو جائے، پھر زندہ کیا جائے پھر شہید ہو جائے، پھر زندہ ہو جائے پھر شہید ہو جائے اور اس پر قرض ہو، تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس کا قرض اتار دیا جائے۔''

④ گناہ:

بعض سلف کا کہنا ہے: آدمی کو اس گناہ کی وجہ سے جو وہ دنیا میں کیا کرتا تھا جنت کے دروازے پر سو سال تک روک کر رکھا جائے گا۔

تو یہ ساری چیزیں جنت میں داخل ہونے سے مانع بن سکتی ہیں۔

اسی سے ان احادیث کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے جن میں صرف توحید کی بنا پر جنت میں داخل ہونے کا ذکر ہے، مثلاً: صحیحین میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، ثُمَّ مَاتَ عَلَى ذَلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ»

''جس بندے نے ''لا الہ الا اللہ'' کہا، پھر اسی پر اس کی موت آئی تو وہ یقیناً جنت میں داخل ہو گیا۔''

میں نے کہا: چاہے وہ زنا اور چوری کرے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چاہے وہ زنا اور چوری کرے۔'' آپ نے تین مرتبہ اسی طرح جواب دیا۔ پھر چوتھی مرتبہ فرمایا: ''ابوذر کی ناک کے خاک آلود ہونے کے باوجود۔'' پھر سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ اگرچہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو جائے۔ [1]

اسی طرح صحیحین میں عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِي بِذَلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ» [2]

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر جہنم کو حرام کر دیا ہے جس نے خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے لا إله إلا الله کہا۔''

علماء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ کلمہ توحید جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات پانے کا سبب ہے، لیکن اس کی کئی شرطیں ہیں، یعنی فرائض کی ادائیگی۔ اور اس کے کئی موانع بھی ہیں، یعنی کبیرہ گناہوں کا ارتکاب۔

---

[1] البخاري، كتاب اللباس، باب الثياب البيض، رقم الحديث (5827) ومسلم، كتاب الإيمان، باب من مات لا يشرك بالله شيئا، رقم الحديث: 154 (94)

[2] البخاري، كتاب التهجد، باب صلاة النوافل جماعة، رقم الحديث (1186) ومسلم، كتاب المساجد، باب الرخصة في التخلف عن الجماعة بعذر، رقم الحديث: 263 (33)

وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ کیا "لا إلٰہ إلّا اللّٰہ" جنت کی چابی نہیں؟ تو انھوں نے کہا: "کیوں نہیں، مگر ہر چابی کے دانت ہوتے ہیں۔ اگر تم دانتوں والی چابی لاؤ گے تو وہ تالا کھولے گی، ورنہ نہیں کھولے گی۔"[1]

علماء کے ایک گروہ، جس میں ضحاک اور زہری رحمہ اللہ شامل ہیں، کا کہنا ہے کہ یہ (صرف توحید کی بنا پر جنت میں داخل ہونا) فرائض اور حدود کے آنے سے پہلے تھا، لیکن ان کی یہ بات محلِ نظر ہے، کیونکہ زیادہ تر احادیث فرائض وحدود کے بعد کی ہیں۔ جبکہ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ مطلق نصوص اس بات کے ساتھ مقید آئی ہیں کہ کلمۂ توحید پڑھنے والا اسے صدقِ دل اور اخلاص کے ساتھ پڑھے۔ اور صدق اور اخلاص کسی معصیت پر اصرار کرنے سے منع کرتے ہیں۔

اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ "لا إلہ إلا اللّٰہ" کا کہنا حقیقی معنوں میں صرف اس شخص کے لیے صحیح مانا جائے گا جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ چیزوں کی محبت پر اور جو اللہ نہیں چاہتا اس کو چاہنے پر اصرار نہ ہو اور جس کے دل میں ایسی کوئی چیز ہوگی اس کی توحید میں نقص ہوگا، جو کہ شرکِ خفی کی ایک قسم ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو واجبات پر عمل کرے اور محرمات سے اجتناب کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔
2. حلال کو حلال سمجھنا اور حرام کو حرام سمجھنا اعتقاد کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور عمل کے ساتھ بھی۔
3. بعض کبیرہ گناہوں کا ارتکاب جنت میں داخلے سے مانع ہوگا، یہاں تک کہ اس پر اس کا محاسبہ کیا جائے گا یا اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کرے گا۔
4. توحید جنت میں داخل کرنے والا سب سے بڑا عمل ہے۔
5. کلمۂ توحید دخولِ جنت کا سبب ہے، لیکن اس کی کئی شروط ہیں۔
6. بغیر چابی کے جنت میں داخلہ نہیں ہوگا اور جنت کو وہی چابی کھولے گی جس کے دانت ہوں گے۔

---

[1] ذكره البخاري تعليقا أول كتاب الجنائز.

سوالات:

1 «أَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ» کا کیا معنی ہے؟

2 اعرابی کا یہ کہنا کہ میں ان پر اضافہ نہیں کروں گا، کیا اس کا یہ معنی ہے کہ میں اسلام کے باقی احکامات و واجبات پر عمل نہیں کروں گا؟

3 بعض کبیرہ گناہ ذکر کریں جو جنت میں داخل ہونے سے مانع ہوں گے۔

4 درج ذیل خالی جگہیں پر کیجیے:

ا: کلمۂ توحید جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے، لیکن اس کی کئی شرطیں ہیں اور وہ ہیں ....

ب: جب دل میں اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ چیزوں میں سے کسی چیز کی محبت ہو تو یہ...... کی ایک قسم ہے۔



متفرق فضائل

23 سیدنا ابو مالک حارث بن عاصم الاشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ ـأَوْ تَمْلَأُـ مَا بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَالصَّلَاةُ نُوْرٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ، وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا»[1]

''پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔ ''الحمد للہ'' میزان کو (اجر وثواب) سے بھر دے گا۔ ''سبحان اللہ'' اور ''الحمد للہ'' آسمانوں اور زمین کے درمیانی خلا کو (اجر وثواب سے) بھر دیتے ہیں۔ نماز نور ہے۔ اور صدقہ دلیل ہے۔ اور صبر روشنی ہے۔ اور قرآن آپ کے لیے حجت ہے یا آپ کے خلاف حجت ہے۔ تمام لوگ صبح کے وقت نکلتے ہیں، پھر ہر شخص اپنے آپ کو فروخت کرتا ہے، پھر وہ یا تو اپنے آپ کو آزاد کرتا ہے یا ہلاک کرتا ہے۔''

راویِ حدیث:

مذکورہ صحابی کا نام حارث بن حارث بھی ذکر کیا گیا ہے اور کعب بن کعب بھی۔ آپ کا تعلق یمن سے تھا یا کسی اور جگہ سے، اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ نے ۲۷ حدیثیں روایت کی ہیں اور آپ کی وفات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں طاعون کی وجہ سے ہوئی۔

«اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ» کا مطلب:

بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ «اَلطُّهُوْرُ» سے مراد گناہوں کو ترک کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۸۲]

[1] رواہ مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، رقم الحديث: 1 (223)

"یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔" یعنی اس برائی سے بچنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ [المدثر: ٤] "اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجیے۔"

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

"بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

ان اہلِ علم کا کہنا ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں: کرنا اور چھوڑنا۔ یعنی آدھا ایمان احکامات پر عمل کرنے اور آدھا ایمان ممنوعات کو چھوڑنے کا نام ہے۔ ممنوعات و معاصی کو چھوڑنے سے انسان کا نفس پاک ہوتا ہے۔

یہ قول درست ہوتا اگر اس حدیث کی ایک روایت میں «اَلْوُضُوْءُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ»[1] "وضو آدھا ایمان ہے۔" کے الفاظ نہ ہوتے۔

اور دوسری روایت میں «إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ»[2] "مکمل وضو کرنا" کے الفاظ نہ ہوتے۔

یہ الفاظ مذکورہ معنی کی تائید نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ معنوی طور پر بھی مذکورہ معنی محلِ نظر ہے، کیونکہ بہت سارے اعمال نفس کو پچھلے گناہوں سے پاک کرتے ہیں، مثلاً: نماز وغیرہ، تو یہ اعمال «اَلطُّهُوْرُ» میں کیوں نہیں داخل ہو سکتے؟ اور اگر یہ اعمال اس لفظ میں داخل ہیں تو صرف گناہوں کو چھوڑنا آدھا ایمان نہ ہوا!

صحیح بات جو اکثر اہلِ علم نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں «اَلطُّهُوْرُ» سے مراد پانی کے ساتھ احداث سے پاکیزگی حاصل کرنا ہے۔ اسی لیے مسلم اور ابن ماجہ وغیرہ نے اسے ابواب الوضوء میں روایت کیا ہے۔

پانی کے ساتھ پاکیزگی حاصل کرنا آدھا ایمان کیسے ہے؟:

اس بارے میں اہلِ علم کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے:

- چنانچہ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ «شَطْرُ» سے مراد جز ہے، یعنی پاکیزگی ایمان کا ایک جز ہے، نہ کہ آدھا ایمان اور یہ قول ضعیف ہے کیونکہ عربی لغت میں «شَطْرُ» کا لفظ نصف کے معنی میں معروف ہے۔ اور بنی سلیم کے ایک آدمی سے مروی ایک حدیث میں صراحتاً یہ الفاظ ہیں:

---

[1] الترمذي، كتاب الدعوات، باب (86)، رقم الحديث (3517)

[2] ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب الوضوء شطر الإيمان، رقم الحديث (280)

«اَلطُّهُورُ نِصْفُ الْإِيمَانِ»[1] ''پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔''

⊙ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ ایمان تمام کبیرہ گناہوں کو مٹاتا ہے جبکہ وضو تمام صغیرہ گناہوں کو مٹاتا ہے۔ اس اعتبار سے پاکیزگی آدھا ایمان ہوئی۔ اس معنی کو درج ذیل حدیث رد کرتی ہے:

«وَمَنْ أَسَاءَ، أُخِذَ بِعَمَلِهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالْإِسْلَامِ»[2]

''جس شخص نے اسلام میں برے اعمال کیے، اس سے جاہلیت اور اسلام کے اعمال پر بھی مؤاخذہ کیا جائے گا۔''

⊙ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ وضو ایمان کے ساتھ گناہوں کو مٹاتا ہے، اس طرح وضو آدھا ایمان ٹھہرا اور یہ قول بھی ضعیف ہے۔

⊙ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ یہاں ایمان سے مراد نماز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ [البقرة: ١٤٣]

''اور اللہ تمھارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔''

ایمان سے مراد بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ہے، لہٰذا جب ایمان سے مراد نماز ہے تو نماز پاکیزگی کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ یوں پاکیزگی آدھا ایمان ہوئی۔

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کہتے ہیں: راجح یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کے نیچے دو قسمیں ہوں تو ان میں سے ایک اس کا آدھا ہوتی ہے۔ چاہے وہ دونوں قسمیں برابر ہوں یا ان میں ایک دوسری سے زیادہ ہو۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ»[3]

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔''

اس حدیث میں «الصَّلَاةَ» سے مراد ''قراءة الصلاة'' یعنی نماز کی قراءت ہے، اسی لیے اس کی تفسیر فاتحہ کے ساتھ فرمائی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فاتحہ عبادت اور دعا میں منقسم ہے، عبادت اللہ کا حق

---

[1] أخرجه أحمد في المسند (260/4، 263,372/5) وفيه جري بن كليب النهدي وهو مجهول، ولكن يشهد له حديث أبي مالك الأشعري الذي أخرجه مسلم وهو الذي بين أيدينا.

[2] البخاري، كتاب استتابة المرتدين، باب إثم من أشرك بالله، رقم الحديث (6921) بمعناه. ومسلم، كتاب الإيمان، باب هل يؤاخذ بأعمال الجاهلية، رقم الحديث: 189 (120)

[3] مسلم، كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة، رقم الحديث: 38 (395)

ہے اور دعا بندے کا حق ہے۔ اس میں تقسیم سے مراد فاتحہ کے کلمات کی برابر تقسیم نہیں ہے۔ یہ بات خطابی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کی ہے اور انھوں نے اِس قولِ عرب سے استشہاد کیا ہے: آدھا سال سفر میں اور آدھا سال حضر میں گزرتا ہے۔ اِس کا مطلب سفر اور حضر کے زمانوں کا برابر ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ سال سفر و حضر میں منقسم ہے چاہے ان دونوں کی مدت برابر نہ ہو۔[1]

ستر سال کوفہ کے قاضی رہنے والے قاضی شریح رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ آپ کی صبح کیسے ہوئی؟ تو انھوں نے کہا: میں نے صبح اس حال میں کی کہ آدھے لوگ مجھ پر ناراض تھے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کے حق میں میں نے فیصلے کیے اور دوسرے وہ جن کے خلاف میں نے فیصلے کیے۔ سو جن کے خلاف فیصلے ہوئے وہ ناراض ہیں اور جن کے حق میں فیصلے ہوئے وہ راضی ہیں۔ یہ دو مختلف گروہ ہیں۔ شاعر کہتا ہے ؎

إِذَا مِتُّ كَانَ النَّاسُ نِصْفَيْنِ شَامِتٌ بِمَوْتِي وَمُثْنٍ بِالَّذِيْ كُنْتُ أَفْعَلُ

''میں جب مروں گا تو لوگ دو حصوں میں بٹ جائیں گے: کچھ میری موت پر خوش ہوں گے اور کچھ میرے کارناموں کی تعریف کریں گے۔''

شاعر کی مراد یہ ہے کہ لوگ دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

اسی طرح سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: صبر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے۔ چونکہ ایمان واجبات پر عمل کرنے اور محرمات کو ترک کرنے دونوں کو شامل ہے اور یہ سب بغیر صبر کے ممکن نہیں تو اِس لحاظ سے صبر نصف ایمان ٹھہرا۔ اسی طرح وضو کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ آدھی نماز ہے۔

اس کے علاوہ نماز گناہوں اور غلطیوں کو مٹاتی ہے، بشرطیکہ وضو مکمل اور اچھی طرح سے کیا ہوا ہو۔ اِس اعتبار سے بھی وضو آدھی نماز ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَطَهَّرُ، فَيُتِمُّ الطُّهُوْرَ الَّذِيْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَيُصَلِّيْ هٰذِهِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ، إِلَّا كَانَتْ كَفَّارَاتٍ لِّمَا بَيْنَهَا»[2]

''جو مسلمان وضو کرے اور وہ پاکیزگی مکمل کرے جو اس پر فرض ہے، پھر اِن پانچ نمازوں کو ادا کرے تو یہ نمازیں درمیان میں ہونے والے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔''

---

[1] معالم السنن (176/1)

[2] مسلم، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء والصلاة عقبه، رقم الحديث: 10 (231)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر وضو سے فراغت کے بعد یہ دعا پڑھے:

«أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ وہ جس میں سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔''[1]

لہٰذا جب وضو شہادتین کے ساتھ جنت کے آٹھوں دروازوں کے کھلنے کا موجب ہے تو اِس اعتبار سے وضو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا نصف ہوا۔

وضو ایمان سے ہے:

وضو ایمان کی ان خفیہ خصلتوں میں سے ایک ہے جن کی حفاظت صرف مومن ہی کرتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوءِ إِلَّا مُؤْمِنٌ»[2]

''مومن ہی ہمیشہ وضو کی حالت میں رہتا ہے۔''

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقوال واعمال میں سے ایمان کی تمام خصلتیں دل کو پاک کرتی ہیں اور جہاں تک پانی کے ساتھ پاکیزگی حاصل کرنے کا تعلق ہے تو اس سے جسم پاک ہوتا ہے اور اس کی صفائی ہوتی ہے، یوں ایمان کی خصلتیں دو قسم کی ہوئیں۔ ایک قسم ظاہر کو پاک کرتی ہے اور دوسری باطن کو۔ گویا اِس اعتبار سے ایمان کی خصلتوں کے دو حصے ہوئے۔ واللہ أعلم بمرادہ ومراد رسولہ.

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ» ''الحمد للہ (کا اجر وثواب) ترازو کو بھر دے گا۔''

بنی سلیم کے ایک آدمی سے مروی حدیث میں ہے:

«اَلتَّسْبِيحُ نِصْفُ الْمِيزَانِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَؤُهُ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ لَيْسَ لَهَا دُونَ اللّٰهِ حِجَابٌ حَتَّى تَخْلُصَ إِلَيْهِ»[3]

---

[1] رواه مسلم، كتاب الطهارة، باب الذكر المستحب عقب الوضوء، رقم الحديث: 17 (234)

[2] أخرجه أحمد (276/5)

[3] الترمذي، كتاب الدعوات، باب (86)، رقم الحديث (3518) و أحمد (363,372/5)

"سبحان اللّٰہ" کا اجر آدھے ترازو کو اور "الحمد للّٰہ" کا اجر پورے ترازو کو بھر دے گا اور "لا إله إلا اللّٰہ" کے تو اللہ تک پہنچنے میں کوئی حجاب ورکاوٹ ہے ہی نہیں۔"

"الحمد للّٰہ" کے بارے میں تمام احادیث متفق ہیں کہ اس کا اجر وثواب میزان کو بھر دے گا۔ اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ ایک مثال بیان کی گئی ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اگر "الحمد" کا جسم ہوتا تو میزان کو بھر دیتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بنو آدم کے اقوال واعمال کو قیامت کے دن شکلیں دے گا جنھیں دیکھا جا سکے گا اور انہی کا وزن ہوگا۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

"قیامت کے دن قرآن آئے گا، آگے آگے سورت بقرہ اور سورت آل عمران ہوں گی، وہ ایسے ہوں گی جیسے دو بادل یا دو سائبان یا صفوں میں اڑنے والے پرندوں کے دو جھنڈ ہوں۔"[1]

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمَنِ، خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ»[2]

"دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو انتہائی پیارے، زبان پر بہت ہلکے اور ترازو میں انتہائی وزنی ہیں: "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ""

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«أَثْقَلُ شَيْءٍ فِي الْمِيزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، اَلْخُلُقُ الْحَسَنُ»[3]

"قیامت کے دن ترازو میں سب سے زیادہ بھاری حسنِ خلق ہوگا۔"

جہاں تک "سبحان اللّٰہ" کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں صحیح مسلم کی روایت میں شک کے الفاظ ہیں:

«وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ ـ أَوْ تَمْلَأُ ـ مَا بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ»

جس کا مطلب یہ ہے کہ راوی کو شک ہوا کہ زمین وآسمان کے درمیانی خلا کو ان دونوں کلمات کا

---

[1] مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فضل قراءة القرآن، رقم الحديث: 252 (804)

[2] البخاري، كتاب التوحيد، باب ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ﴾، رقم الحديث (7563) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب فضل التهليل والتسبيح: 31 (2694)

[3] الترمذي، كتاب البر والصلة، باب ما جاء في حسن الخلق، رقم الحديث (2003) بمعناه.

ثواب بھر دیتا ہے یا ان میں سے ایک کا، بہر حال "سبحان الله" فضیلت کے لحاظ سے "الحمد لله" سے کم تر ہے۔ جیسا کہ سیدنا علی، ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم کی احادیث میں صراحتاً ہے۔[1]

اسی طرح بنی سلیم کے ایک آدمی کی حدیث جسے ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اس میں بھی ہے کہ "سبحان الله" کا ثواب آدھے میزان کو اور "الحمد لله" کا ثواب پورے میزان کو بھر دے گا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ "الحمد لله" میں اللہ تعالیٰ کے لیے تمام تعریفوں کا اثبات ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ کمال وجلال کا اثبات بھی شامل ہے۔ جبکہ "سبحان الله" کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو تمام نقائص، عیوب اور آفات سے پاک قرار دینا۔ اور اثبات یقینی طور پر سلب سے افضل ہے۔ اسی لیے "سبحان الله" اکیلا وارد نہیں ہوا، بلکہ اسے اس چیز کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کمال کے اثبات پر دلالت کرے۔ چنانچہ کبھی "حمد" کے ساتھ اس کا ذکر آتا ہے، مثلاً: "سبحان الله وبحمده، سبحان الله والحمد لله"۔ اور کبھی اسے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال پر دلالت کرنے والے کسی اسم کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: "سبحان الله العظيم"۔

لہٰذا سیدنا ابو مالک رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اگر اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ زمین وآسمان کے درمیانے خلا کو "سبحان الله" اور "الحمد لله" دونوں کا ثواب بھر دیتا ہے تو یہ بالکل واضح ہے۔ اور اگر یہ مراد ہو کہ ان میں سے ہر ایک کا ثواب اس خلا کو بھرتا ہے، تو میزان زمین وآسمان کے درمیانے خلا سے بھی زیادہ وسیع ہے، لہٰذا جو ثواب میزان کو بھرے گا وہ یقیناً اس ثواب سے زیادہ ہے جو زمین وآسمان کے درمیانے خلا کو بھرتا ہے۔ اِس کی دلیل سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

> "قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا، اگر اس میں آسمانوں اور زمین کا وزن کیا جائے تو وہ اس کے لیے بھی کافی ہوگا۔ چنانچہ فرشتے کہیں گے: اے رب! اس میں کس کا وزن کیا جائے گا؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں اپنی مخلوق میں سے جس کا چاہوں گا۔ تو فرشتے کہیں گے: تو پاک ہے، ہم کما حقہ تیری عبادت نہیں کر سکے۔"[2]

نور، برہان اور ضیاء:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

[1] حديث عبد الله بن عمرو: أخرجه الترمذي، كتاب الدعوات، باب (86)، رقم الحديث (3527)

[2] أخرجه الحاكم في المستدرك (586/4)

«وَالصَّلَاةُ نُورٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ»

''نماز نور ہے، اور صدقہ دلیل ہے، اور صبر روشنی ہے۔''

اور صحیح مسلم کے بعض نسخوں میں ہے:«وَالصِّيَامُ ضِيَاءٌ» ''اور روزہ روشنی ہے۔''

مذکورہ تینوں قسم کے اعمال سب کے سب انوار (روشنیاں) ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض نور کی قسموں میں سے کسی ایک قسم کے ساتھ خاص ہیں، چنانچہ نماز مطلقاً نور ہے۔ دنیا میں مومنوں کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو جلا بخشتی ہے۔ اسی لیے نماز متقین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«حُبِّبَ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا اَلنِّسَاءُ وَالطِّيبُ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ»[1]

''مجھے دنیا کی دو چیزیں محبوب ہیں: عورتیں اور خوشبو۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔''

اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهُ نُورًا وَبُرْهَاناً وَنَجَاةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ يَكُنْ لَهُ نُورٌ، وَّلَا بُرْهَانٌ، وَلَا نَجَاةٌ ....»[2]

''جو شخص نماز ہمیشہ پڑھتا رہے تو نماز اس کے لیے نور، دلیل اور روزِ قیامت باعثِ نجات ہوگی اور جو شخص اسے ہمیشہ نہ پڑھے وہ اس کے لیے نہ نور ہوتی ہے اور نہ دلیل بنے گی اور نہ ہی اس کے لیے باعثِ نجات ہوگی۔''

نماز ہی وہ پہلا فریضہ ہے جس کا حساب قیامت کے دن سب سے پہلے لیا جائے گا، اگر نماز مکمل ہوئی تو انسان کامیاب وکامران ہوجائے گا۔

جہاں تک صدقے کا تعلق ہے تو وہ برہان، یعنی دلیل ہے۔ اور ''برہان'' اس شعاع کو کہتے ہیں جو سورج کے چہرے کے قریب ہوتی ہے۔ اور اسی سے قطعی حجت کو بھی ''برہان'' کہا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی دلالت میں بالکل واضح ہوتی ہے، اسی طرح صدقہ بھی صحیح ایمان کی واضح دلیل ہے۔ اور خوش دلی سے

[1] أخرجه أحمد في مسنده (128/3) والنسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم الحديث (3950)

[2] أخرجه الدارمي، كتاب الرقاق، باب في المحافظة على الصلاة، رقم الحديث (2621) ومسند أحمد (169/2)

صدقہ کرنا ایمان کی مٹھاس کو پانے کی نشانی ہے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن معاویہ العامری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص وہ کام کرلے تو وہ ایمان کی مٹھاس چکھ لیتا ہے:

- جو اکیلے اللہ کی عبادت کرے۔
- اور اسے اس بات پر یقینِ کامل ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔
- اس کا نفس اسے زکات کی ادائیگی پر آمادہ کرے اور وہ ہر سال اپنے مال کی زکات خوش دلی سے ادا کرے۔''[1]

اِس کا سبب یہ ہے کہ نفوس کو مال سے بڑی محبت ہوتی ہے اور وہ اس میں کنجوسی کرتے ہیں، چنانچہ جب نفوس خوشی خوشی زکات کی صورت میں مال خرچ کرنے پر آمادہ ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے وعد و وعید پر ایمان کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض عرب قبائل نے زکات دینے سے انکار کر دیا تھا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکات نہ دینے پر ان کے خلاف جنگ کی تھی۔

جہاں تک صبر کا تعلق ہے تو وہ ''ضیاء'' یعنی ایسا نور ہے جس میں حرارت ہوتی ہے اور سورج کی روشنی کی طرح اس میں جلانے کا وصف پایا جاتا ہے، جبکہ چاند کی روشنی میں یہ وصف نہیں ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ [یونس: ۵]

''وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا اور چاند کو نورانی بنایا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو بھی ضیاء قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ﴾ [الأنبیاء: ۴۸۔ ۴۹]

''یہ بالکل سچ ہے کہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) کو ایسی کتاب دی جو (حق و باطل) میں فرق کرنے والی، روشنی پھیلانے والی اور ان پرہیزگاروں کے لیے نصیحت والی ہے جو اپنے رب سے خلوتوں میں خوف کھاتے ہیں اور قیامت (کے تصور) سے کانپتے ہیں۔''

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ تورات میں نور ہے۔ اس کا فرمان ہے:

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، رقم الحديث (1582)

﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ﴾ [المائدة: ٤٤]

''بے شک ہم نے ہی تورات کو اتارا جس میں ہدایت ونور ہے۔''

لیکن ان کی شریعت میں جو چیز غالب ہے وہ ضیاء ہے، کیونکہ اس میں عہدوں، بڑے بڑے بوجھوں اور طوقوں کا ذکر ہے۔ اور صبر چونکہ نفوس پر شاق ہوتا ہے اور اس میں نفس کے خلاف مجاہدہ اور اسے نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے سے روکنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے صبر ''ضیاء'' ہے، کیونکہ صبر کا معنی ہوتا ہے: روکنا، اور اسی سے ''قتل الصبر'' بھی ہے، یعنی کسی آدمی کو بند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔

قابلِ ستائش صبر کی کئی قسمیں ہیں: اللہ کی اطاعت پر صبر کرنا، اللہ کی معاصی سے بچنے پر صبر کرنا، اللہ کی تقدیروں پر صبر کرنا۔ پہلی دونوں قسمیں تیسری قسم سے افضل ہیں۔ اس کی صراحت سعید بن جبیر اور میمون بن مہران رحمہ اللہ وغیرہ جیسے سلف صالحین نے کی ہے۔

صبر کی سب سے افضل قسم روزہ رکھنا ہے، کیونکہ اس میں تینوں قسموں کا صبر پایا جاتا ہے، چنانچہ اس میں اللہ کی اطاعت پر صبر کیا جاتا ہے اور اللہ کی معاصی سے بچنے پر بھی صبر کیا جاتا ہے، کیونکہ بندہ صرف اللہ کی خاطر اپنی خواہشات کو ترک کر دیتا ہے، جبکہ اس کا نفس اس سے ان کے پیچھے چلنے کے لیے جھگڑا کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے صحیح حدیث آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

« كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ، اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: إِلَّا الصَّوْمُ فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي »[1]

''ابن آدم کا ہر (نیک) عمل کئی گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے، ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر، حتی کہ سات سو گنا تک بڑھا دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: سوائے روزے کے جو کہ صرف میرے لیے ہوتا ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، کیونکہ وہ میری وجہ سے اپنی شہوت اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔''

اور روزے میں اللہ کی تکلیف دہ تقدیروں پر صبر کرنا بھی ہے، کیونکہ بعض اوقات روزہ دار کو بھوک اور پیاس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

[1] البخاري، كتاب الصوم، باب هل يقول: إني صائم إذا شتم، رقم الحديث (1904) ومسلم، كتاب الصيام، باب فضل الصيام، رقم الحديث: 161 (1151)

«وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ أَوْ عَلَيْكَ»

''اور قرآن آپ کے لیے حجت ہے یا آپ کے خلاف حجت ہے۔''

سلف میں سے بعض کا کہنا ہے کہ جو شخص قرآن لے کر بیٹھتا ہے وہ یا تو اس سے فائدہ حاصل کر کے اٹھتا ہے، یا پھر خسارہ پا کر اٹھتا ہے۔ پھر انھوں نے اِس آیت کی تلاوت کی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾

[الإسراء: ۸۲]

''اور ہم قرآن سے جو کچھ نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے خسارہ میں تو اضافہ ہی کرتا ہے۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا اور قرآن ایسا فریقِ مخالف بھی ہے کہ اس کی بات کو مانا جائے گا۔ چنانچہ جو شخص اسے اپنا پیشوا بنائے گا وہ اسے جنت میں لے جائے گا۔ اور جو اسے پسِ پشت ڈالے گا وہ اسے جہنم کی طرف لے جائے گا۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

''قیامت کے روز قرآن آئے گا، پھر اپنے ساتھی (اسے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے والے) کے لیے شفاعت کرے گا، پھر اسے جنت میں لے جائے گا، یا پھر بندے کے خلاف گواہی دے گا اور اسے جہنم کی طرف لے جائے گا۔''

اور سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''یہ قرآن آپ کے لیے یا تو اجر کا ذریعہ بننے والا ہے یا گناہ کا۔ لہٰذا تم قرآن کی اتباع کرو۔ قرآن تمھاری اتباع نہ کرے۔ کیونکہ جو شخص قرآن کی اتباع کرے گا وہ اسے جنت کے باغیچوں میں لے جائے گا۔ اور جس شخص نے قرآن کو اپنے پیچھے ڈال دیا تو وہ اس کی گدی سے پکڑ کر اسے جہنم میں پھینک دے گا۔''

لوگوں کا اپنے آپ کو بیچنا:

«كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا»

''تمام لوگ صبح کے وقت نکلتے ہیں، پھر ہر شخص اپنے آپ کو فروخت کرتا ہے، پھر وہ یا تو اپنے آپ کو آزاد کرتا ہے یا ہلاک کرتا ہے۔''

یہ حدیث اِس بات کی دلیل ہے کہ ہر انسان یا تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، یا پھر اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی سعی کر رہا ہے۔ جس شخص کی جدوجہد اللہ کی اطاعت کے دائرے میں رہ کر ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے بیچ کر عذاب سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اور جس شخص کی تگ و دو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو ذلت ورسوائی کے بدلے میں بیچ ڈالتا ہے اور ان گناہوں کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا کا موجب بنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [التوبة: ١١١]

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، جس میں وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں، انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے! لہٰذا تم لوگ اپنی اس بیع پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کی ہے، خوش ہو جاؤ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ [الزمر: ١٥]

''کہہ دیجیے کہ حقیقی زیاں کار وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو قیامت کے دن نقصان میں ڈال دیں گے۔ یاد رکھو کہ کھلم کھلا نقصان یہی ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴾ [الشمس: ۷ـ۱۰]

''قسم ہے نفس کی اور جس نے اسے درست کیا۔ پھر سمجھ دی اس کو بدکاری کی اور بچ کر چلنے کی، جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا (گمراہ کر دیا) وہ ناکام ہوا۔''

ان آیات کا معنی یہ ہے کہ جس نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا اور جس نے اسے گناہوں کے ساتھ چھپا دیا وہ ناکام ہوا۔ کیونکہ اطاعت نفس کو پاک کرتی ہیں، جس سے وہ بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور گناہ اسے چھپا دیتے ہیں جس سے وہ ایسے رسوا ہوتا ہے، جیسے کسی کو مٹی میں روندا جاتا ہے۔

اور صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] نازل ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اے قریش کی جماعت! تم اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کو بیچ دو، میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔ اے عبد مناف! میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔''[1]

بیع کا منافع:

سلف صالحین کی ایک جماعت نے اپنی جانوں کو (جنت کے بدلے میں) بیچ ڈالا، اسی طرح اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالے۔ ان میں سے بعض نے اپنا پورا مال صدقہ کر دیا، جیسا کہ حبیب بن محمد رحمہ اللہ نے کیا۔[2]

ان میں سے بعض نے اپنے وزن سے تین یا چار گنا زیادہ چاندی کا صدقہ کیا، جیسا کہ خالد بن طحان رحمہ اللہ نے کیا۔[3]

---

① البخاري، كتاب الوصايا، باب هل يدخل النساء والولد في الأقارب، رقم الحديث (2753) ومسلم، كتاب الإيمان، باب في قوله تعالىٰ ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ رقم الحديث: 351 (206)، واللفظ له.

② تهذيب الكمال (389/5)

③ تهذيب الكمال (99/8)

ان میں سے بعض نے اعمالِ صالحہ میں خوب محنت کی اور کہا: میں ایک قیدی ہوں اور اپنی گردن کو آزاد کرنے کے لیے کوشاں ہوں، جیسا کہ عمرو بن عتبہ رحمہ اللہ نے کیا۔[1]

اور ان میں سے بعض اپنی دیت کے بقدر ہر دن بارہ ہزار تسبیحات پڑھتے تھے۔ گویا کہ انھوں نے اپنی جان کو قتل کیا، تو وہ اپنی دیت تسبیحات کی شکل میں ادا کرتے۔

حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''دنیا میں مومن کی مثال ایک قیدی کی سی ہے، جو اپنی گردن کو آزاد کرانے کی خاطر مسلسل سعی کرتا رہتا ہے اور اسے کسی چیز سے امن نہیں ملتا، یہاں تک کہ وہ اللہ کو جا ملتا ہے۔''

سلف صالحین میں سے بعض روایت کرتے اور کہتے ہیں: میری دو جانیں نہیں، بلکہ ایک ہی جان ہے، اگر یہ چلی گئی تو مجھے دوسری نہیں ملے گی۔

اور محمد بن حنفیہ کہتے تھے:

''اللہ تعالیٰ نے جنت کو تمھاری جانوں کی قیمت بنا دیا ہے، لٰہذا تم ان جانوں کو جنت کے علاوہ کسی اور چیز کے بدلے میں مت بیچنا۔''

بعض متقدمین کے کچھ اشعار یوں ہیں ؎

أُثَامِنُ بِالنَّفْسِ النَّفِيسِ رَبَّهَا ... وَلَيْسَ لَهَا فِي الْخَلْقِ كُلِّهِمْ ثَمَنٌ

بِهَا تَمْلِكُ الْأُخْرَى فَإِنْ أَنَا بِعْتُهَا ... بِشَيْءٍ مِنَ الدُّنْيَا فَذَاكَ هُوَ الْغَبَنُ

لَئِنْ ذَهَبَتْ نَفْسِي بِدُنْيَا أُصِيبُهَا ... لَقَدْ ذَهَبَتْ نَفْسِي وَقَدْ ذَهَبَ الثَّمَنُ

''میں اپنی قیمتی جان کی قیمت اس کے رب کے ساتھ طے کرتا ہوں، کیونکہ پوری مخلوق میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اسی کے ذریعے آپ آخرت کے مالک بن سکتے ہیں، اگر میں نے اسے دنیا کی کسی چیز کے بدلے میں بیچ دیا تو یہ سراسر خسارہ ہے۔ اگر میری جان دنیا کے بدلے میں چلی جائے جسے میں پالوں، تو جان بھی چلی گئی اور قیمت بھی چلی گئی۔

فوائدِ حدیث:

1. اس حدیث میں وضو کی فضیلت کا بیان ہے، جو نماز کی درستی کی ایک بنیادی شرط ہے۔

[1] تهذيب الكمال (135/22)

2 اسی طرح اس میں ذکرِ الٰہی کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

3 اس میں زیادہ سے زیادہ نماز پڑھنے کی ترغیب ہے۔

4 نماز نور ہے، جو زندگی میں مسلمان کے لیے سلامتی کے راستوں کو روشن کرتی ہے۔

5 نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔

6 نماز صحیح کام کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور تباہ کن کاموں کے سامنے آڑ بن جاتی ہے۔

7 زیادہ سے زیادہ صدقہ کرنا مومن کے صدق و اخلاص کی دلیل ہے۔

8 قرآن کریم تمام شرعی احکام کا پہلا مصدر و منبع ہے۔

9 مسلمان اللہ عزوجل کی اطاعت میں اپنی زندگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

سوالات:

1 درج ذیل کلمات کے لغوی معانی ذکر کریں: ''اَلطُّهُوْرُ۔ شَطْرٌ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ بُرْهَانٌ''

2 «اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ» کے بارے میں علماء کے اقوال ذکر کریں۔ نیز آپ کے نزدیک جو زیادہ راجح قول ہے وہ بھی ذکر کریں اور اس کی توجیہ بھی کریں۔

3 اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ [البقرة: ۱۵۳] میں صبر وصلاۃ کے ساتھ مدد طلب کرنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟

4 قرآن مجید کیسے آپ کے لیے یا آپ کے خلاف حجت ہوگا؟

5 حدیث میں بتایا گیا ہے کہ نماز نور ہے، صدقہ برہان ہے اور صبر روشنی ہے، تو اس سے کیا مراد ہے؟

6 حدیث کے ان الفاظ: «كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا» سے آپ نے کیا سمجھا ہے؟

7 حدیث کے فوائد ذکر کریں۔

8 خالی جگہ پر کریں:

تسبیح سے مراد .... ہے اور تحمید سے مراد .... ہے۔



انھوں نے اللہ کی کما حقہ قدر نہیں کی

(24) سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

« يَا عِبَادِيْ! إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِيْ وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّماً فَلَا تَظَالَمُوْا، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ فَاسْتَهْدُوْنِيْ أَهْدِكُمْ، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ أُطْعِمْكُمْ، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ فَاسْتَكْسُوْنِيْ أَكْسُكُمْ، يَا عِبَادِيْ! إِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعاً فَاسْتَغْفِرُوْنِيْ أَغْفِرْ لَكُمْ، يَا عِبَادِيْ! إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ ذَلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئاً، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئاً، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ فَسَأَلُوْنِيْ فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ إِلَّا مَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ، يَا عِبَادِيْ! إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيْهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيْكُمْ إِيَّاهَا، فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ »[1]

”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور تم پر بھی حرام کیا ہے، لہٰذا تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جس کو میں ہدایت دوں، لہٰذا تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمھیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے

[1] رواہ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، رقم الحدیث: 55 (2577)

بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے اس کے جس کو میں کھلاؤں۔ لہٰذا تم مجھ سے کھانا مانگو میں تمھیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو سوائے اس کے جس کو میں پہناؤں۔ لہٰذا تم مجھ سے کپڑے مانگو میں تمھیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سارے گناہ معاف کر دیتا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے معافی طلب کرو، میں تمھیں معاف کر دوں گا۔ اے میرے بندو! تم میرا نقصان نہیں کر سکتے ہو اور نہ مجھے فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور تمام انسان اور تمام جنات، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں بڑا پرہیزگار شخص ہو تو میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور تمام آدمی اور تمام جنات، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں سے سب سے بڑا بدکار شخص ہو تو میری سلطنت میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور تمام آدمی اور تمام جنات، سب ایک میدان میں کھڑے ہوں، پھر مجھ سے مانگنا شروع کریں اور میں ہر ایک کو جو وہ مانگے دے دوں، تب بھی میرے پاس جو کچھ ہے وہ کم نہ ہوگا مگر اتنا جیسے سمندر میں سوئی ڈبو کر نکال لو۔ (تو سمندر کا پانی جتنا کم ہو جاتا ہے، میرا خزانہ اتنا بھی کم نہ ہوگا، اس لیے کہ سمندر کتنا ہی بڑا ہو آخر محدود ہے اور میرا خزانہ بے انتہا ہے۔) اے میرے بندو! یہ تو تمھارے ہی اعمال ہیں جن کو میں تمھارے لیے شمار کرتا رہتا ہوں، پھر تمھیں ان اعمال کا پورا بدلہ دوں گا۔ لہٰذا جو شخص بہتر بدلہ پائے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے (کہ اس کی کمائی بیکار نہ گئی) اور جو برا بدلہ پائے تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (کہ اس نے جیسا کیا ویسا پایا)۔''

اِس حدیث کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اہلِ شام (سے روایت کردہ حدیثوں میں) سب سے زیادہ شرف والی حدیث ہے۔

ظلم حرام ہے:

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کر دیا ہے۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے منع کر رکھا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَآ اَنَاْ بِظَلّٰمٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [ق: ٢٩] ''اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۰۸]

''اور اللہ کا ارادہ لوگوں پر ظلم کرنا نہیں۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ﴾ [النساء: ٤٠]

''بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴾ [طٰهٰ: ۱۱۲]

''اور جو شخص مومن ہو اور نیک عمل کرے تو نہ اسے بے انصافی کا کھٹکا ہوگا اور نہ حق تلفی کا۔''

﴿ هَضْمًا ﴾ سے مراد نیکیوں کی جزا میں کمی واقع ہونا اور ﴿ ظُلْمًا ﴾ سے مراد کسی اور کے گناہوں کی سزا دینا ہے۔

قرآن مجید میں ان جیسی آیات بہت زیادہ ہیں جو اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے پر قدرت تو رکھتا ہے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں، بلکہ وہ تو اپنے بندوں پر کرم کرتا ہے، انھیں اپنے فضل سے عطا کرتا ہے اور ان پر بے شمار احسانات کرتا ہے۔

ظلم کا معنیٰ:

بہت سارے علماء نے ظلم کی تفسیر اِس طرح کی ہے کہ اس سے مراد چیزوں کو ان کی اصلی جگہوں کے علاوہ دوسری جگہوں پر رکھنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے افعالِ عباد کو پیدا کیا ہے جن میں سے ظلم بھی ہے، تو اِس کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم سے موصوف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو ان تمام برے اعمال سے موصوف نہیں کیا جا سکتا جو اس کے بندے کرتے ہیں اور جو اس کی مخلوق ہیں اور اس کے مقدر کردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو صرف اسی کے افعال سے موصوف کیا جا سکتا ہے، بندوں کے افعال سے نہیں، کیونکہ بندوں کے افعال اس کی مخلوق ہیں اور وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں وہ اپنی صفات اور اپنے افعال ہی سے موصوف کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

ظلم کی دو قسمیں:

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ «وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوا» اِس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں پر بھی ظلم حرام کر دیا ہے اور انھیں آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے۔ لہٰذا ہر بندے پر حرام ہے کہ وہ کسی کو ظلم کا نشانہ بنائے۔

ظلم فی نفسہ مطلقاً حرام ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: اپنے آپ پر ظلم کرنا اور اس میں سب سے بڑا ظلم شرک کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اور قرآن مجید میں ظالموں کو جو زیادہ تر وعید سنائی گئی ہے تو اس سے مراد مشرکین ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ [البقرة: ۲٥٤] ''اور کافر ہی ظالم ہیں۔''

دوسری قسم: کسی اور کو ظلم کا نشانہ بنانا۔ یہی قسم اِس حدیث میں ذکر کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خطبۂ حج الوداع میں ارشاد فرمایا تھا:

«إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا»[1]

''بے شک تمھارے خون اور تمھارے مال ایسے ہی قابلِ احترام ہیں جس طرح تمھارا یہ دن تمھارے اس مہینے میں اور تمھارے اس شہر میں محترم ہے۔''

صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[2]

''بے شک ظلم قیامت کے دن کئی طرح کی تاریکیاں ثابت ہوگا۔''

اسی طرح صحیحین میں سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] البخاري، كتاب التوحيد، باب قوله تعالىٰ: ﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ﴾ رقم الحديث (7447) ومسلم، كتاب القسامة، باب تغليظ تحريم الدماء، رقم الحديث: 30 (1679) واللفظ له.

[2] البخاري، كتاب المظالم، باب الظلم ظلمات، رقم الحديث (2447) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم، رقم الحديث: 58 (2580)

''بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اسے پکڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر اس طرح اچانک پکڑ کرتا ہے کہ اسے مہلت نہیں دیتا۔''

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ [هود: ۱۰۲]

''تیرے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے، جبکہ وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے۔ بے شک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور نہایت سخت ہے۔''[1]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ مَظْلَمَةٌ لِأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٌ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لَّا يَكُونَ دِينَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ، وَإِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ»[2]

''جس کسی کے پاس اس کے بھائی کا حق ہو اس کی عزت سے یا کسی اور چیز سے تو وہ آج ہی اس سے آزاد ہو جائے (یعنی یا تو وہ حق اسے ادا کر دے یا اسے اس سے معاف کروا لے۔) اس دن کے آنے سے پہلے جب نہ دینار ہوگا نہ درہم۔ اور اگر اس کے پاس نیک اعمال ہوں گے تو اس کے حق کے بقدر اس سے نیک اعمال لے لیے جائیں گے۔ اور اگر نیکیاں نہیں ہوں گی تو صاحبِ حق کی بعض برائیاں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی۔''

مخلوق کی اللہ تعالیٰ کی طرف محتاجی:

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ''اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جس کو میں ہدایت دوں، لہٰذا تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمھیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے اس کے جس کو میں کھلاؤں، لہٰذا تم مجھ سے کھانا مانگو میں تمھیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو سوائے اس کے جس کو میں پہناؤں، لہٰذا تم مجھ سے کپڑے مانگو میں تمھیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سارے گناہ معاف کر دیتا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے معافی

[1] البخاري، كتاب التفسير، سورة هود، باب ﴿وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ﴾، رقم الحديث (4686) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم، رقم الحديث: 61 (2583)

[2] البخاري، كتاب الرقاق، باب القصاص يوم القيامة، رقم الحديث (6534، 2449)

طلب کرو، میں تمھیں معاف کر دوں گا۔" کا تقاضا ہے کہ تمام لوگ اپنے تمام دینی ودنیاوی امور میں اپنی مصالح کے حصول کے لیے اور نقصانات سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اور وہ خود ان چیزوں کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہدایت اور رزق نہ دے، وہ دنیا میں محروم ہوگیا اور جس کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے معاف نہ کرے، اس کے لیے اس کے گناہ آخرت میں تباہ کن ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا ﴾ [الکھف: ۱۷]

"اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے۔ اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لیے کوئی کارساز اور راہنما ہرگز نہیں پائیں گے۔"

اِس جیسی آیات قرآن میں بہت ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۖ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ [الفاطر: ۲]

"اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ روک دے اس کے بعد اسے کوئی جاری رکھنے والا نہیں اور وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾ [ھود: ٦]

"اور زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔"

اِس حدیث میں اِس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس بات کو پسند کرتا ہے کہ بندے اپنی تمام دینی ودنیاوی مصلحتوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کریں، خواہ ان کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا لباس وغیرہ سے۔ جیسا کہ وہ اس سے ہدایت ومغفرت کا سوال کرتے ہیں۔

بندہ ہدایت یافتہ پیدا ہوتا ہے یا گمراہ؟:

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ « كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ » اِس سے بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ یہ سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معارض ہے جس میں نبی ﷺ نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ»[1]

''میں نے اپنے تمام بندوں کو اس حالت میں پیدا کیا کہ وہ سب کے سب شرک سے اعراض کرنے والے مسلمان تھے، پھر ان کے پاس شیاطین آئے اور انھیں ان کے دین سے دور لے گئے۔''

لیکن ایسا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو پیدا کیا اور ان کی فطرت میں اسلام کو قبول کرنے، صرف اسی کی طرف مائل ہونے، اس کے لیے تیار ہونے اور قوت کے ساتھ اس کی تیاری کرنے کی صلاحیت رکھ دی، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ اسلام کی تعلیم حاصل کرے، کیونکہ اس کے بارے میں کچھ سیکھنے سے قبل وہ جاہل ہے اور اسے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النحل: ۷۸]

''اور اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، جبکہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا:

﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ﴾ [الضحیٰ: ۷]

''اور اس نے آپ کو (دین وشریعت سے) لاعلم پا کر آپ کو ہدایت دی۔''

اِس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کتاب وحکمت کی جو تعلیم دی اس سے آپ بہرہ ور نہ تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کو اتارا ہے۔ آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔''

انسان قبولِ حق کی فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دینا چاہے تو اس کے لیے ایسا سبب پیدا کر دیتا ہے جو اسے ہدایت کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ وہ حقیقت میں ہدایت یافتہ بن جاتا ہے،

[1] مسلم، کتاب الجنة، باب الصفات التی یعرف بھا في الدنیا أھل الجنة، رقم الحدیث: 63 (2865)

جبکہ اس سے پہلے اس کے اندر ہدایت یافتہ ہونے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اسے رسوا کرنا چاہے تو اس کے لیے اس کو مسلط کر دیتا ہے جو اسے اس کی فطرت کو تبدیل کرنے والے امور کی تعلیم دیتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَ يُنَصِّرَانِهِ وَ يُمَجِّسَانِهِ»[1]

''ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے ماں باپ چاہیں تو اسے یہودی بنا دیں، چاہیں تو اسے نصرانی بنا دیں اور چاہیں تو اسے مجوسی بنا دیں۔''

کیا ہدایت یافتہ بھی ہدایت کا سوال کرتا ہے؟:

مومن اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا سوال کرتا ہے اور ہدایت کی دو قسمیں ہیں:

1. مجمل ہدایت، یعنی اسلام اور ایمان کی طرف راہنمائی جو مومن کو حاصل ہوتی ہے۔
2. مفصل ہدایت، یعنی اسلام و ایمان کی تفاصیل کو پہچاننے کی طرف راہنمائی اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے مدد۔

مومن کو دن رات اس کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا کیا کریں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الفاتحة: ٦] ''صراطِ مستقیم کی طرف ہماری راہنمائی فرما'' (اور اس پر چلنے کی توفیق اور اس پر استقامت نصیب فرما۔)

اور نبی کریم ﷺ رات کے وقت اپنی دعا میں کہا کرتے تھے:

«اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ»[2]

''اے اللہ! جس چیز میں اختلاف کیا گیا اس میں اپنے حکم کے ساتھ حق کی طرف میری راہنمائی فرما، بے شک تو ہی جس کو چاہے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔''

اسی لیے چھینکنے والا شخص «يَرْحَمُكَ اللّٰهُ» کہنے والے شخص کو کہتا ہے: «يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ» جیسا کہ نبی ﷺ کی سنت ہے۔[3]

---

[1] البخاري، كتاب الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، رقم الحديث (1385) ومسلم، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، رقم الحديث: 22 (2658)

[2] مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الدعاء في صلاة الليل، رقم الحديث: 200 (770)

[3] البخاري، كتاب الأدب، باب إذا عطس كيف يشمت، رقم الحديث (6224) ومسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب تشميت العاطس، رقم الحديث: 55 (2993)

رہا گناہوں سے استغفار تو اس سے مراد مغفرت طلب کرنا ہے۔ بندہ اِس چیز کا بہت ہی محتاج ہے، کیونکہ وہ دن رات گناہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں توبہ واستغفار کا ذکر بار بار آیا ہے، اس کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ» [1]

''حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد انتہائی خطا کار ہے اور خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو سب سے زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔''

جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً» [2]

''اللہ کی قسم! میں ایک دن میں ستر سے زیادہ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔''

کوئی شخص اللہ کو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«يَا عِبَادِيْ! إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ»

''اے میرے بندو! تم میرا نقصان نہیں کر سکتے ہو اور نہ مجھے فائدہ پہنچا سکتے ہو۔''

یعنی بندے اللہ تعالیٰ کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، کیونکہ اللہ تعالیٰ بذاتہ بے نیاز ہے، قابلِ ستائش ہے اور اسے بندوں کی عبادات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی ان کا فائدہ اس کو پہنچتا ہے، بلکہ وہ خود ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اسے بندوں کی نافرمانیوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، وہ خود ان کی وجہ سے نقصان اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ﴾

[آل عمران: ١٧٦]

---

[1] الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب حدثنا هناد، رقم الحديث (2499) وابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم الحديث (4251)

[2] البخاري، كتاب الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة، رقم الحديث (6307)

''کفر میں آگے بڑھنے والے لوگ آپ کو غمناک نہ کریں، یقین مانیں یہ لوگ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ﴾ [آل عمران: ۱۴۴]

''اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اِس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اس سے ڈرتے رہیں اور اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ جیسا کہ وہ اِس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کی توبہ پر اس شخص کی خوشی سے زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری گم ہو جائے، اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو اور غیر آباد جگہ پر ہو۔ پھر وہ اسے تلاش کرے، لیکن تھک ہار کر اس سے اور اپنی زندگی سے مایوس ہو جائے اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ پھر اس پر نیند غالب آ جائے اور وہ سو جائے۔ اس کے بعد اچانک بیدار ہو تو اپنی سواری کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پائے۔

اِس موقع پر اسے کتنی خوشی ہوگی، اس کا تو انسان تصور ہی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے، باوجود اِس کے کہ وہ اپنے بندوں کی عبادات اور توبہ سے بے نیاز ہے۔ اور ان کا فائدہ خود بندوں کو ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر بہت بڑا کرم اور احسان ہے کہ وہ انھیں نفع پہنچانا چاہتا ہے اور ان سے نقصان کو دور رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اسے پہچانیں، اس سے محبت کریں، اس کا خوف کھائیں، اس سے ڈرتے رہیں، اس کی فرمانبرداری کریں، اس کا تقرب حاصل کریں اور اس بات کو جان لیں کہ اس کے سوا اور کوئی نہیں جو ان کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہو۔ اور وہ اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان میں ذرا غور کیجیے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ۱۳۵]

''اور جب ان سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا وہ کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں پر معافی طلب کرتے ہیں اور فی الواقع اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟''

اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گناہ گاروں کے لیے اللہ کے سوا کوئی نہیں کہ وہ جس کی پناہ میں آئیں اور جو ان کے گناہوں کو معاف کرنے پر قادر ہو۔ بندہ جب مخلوق سے ڈرتا ہے تو اس سے دور بھاگتا اور کسی اور کی پناہ میں جانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اس کے لیے اللہ کی پناہ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں ہوتی اور اس کے علاوہ کوئی جائے فرار نہیں ہوتی۔ اِس لیے وہ اس سے اسی کی طرف ہی بھاگتا ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ اپنی دعا میں فرماتے تھے:

«لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ»[1]

''تجھ سے بھاگ کر نہ کوئی پناہ پانے کی جگہ ہے اور نہ نجات حاصل کرنے کی، سوائے تیرے۔''

اللہ کی مملکت میں کسی کے اطاعت کرنے سے نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کی نافرمانی سے کمی ہوتی ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

«يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ ذَلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئاً، يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئاً»

''اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے، اور تمام انسان اور تمام جنات، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں بڑا پرہیزگار شخص ہو تو میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور تمام آدمی اور تمام جنات، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں سے سب سے بڑا بدکار شخص ہو تو میری سلطنت میں کچھ کمی نہ ہوگی۔''

اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخلوق کی اطاعت کے ساتھ اس کی مملکت میں اضافہ نہیں ہوتا، چاہے سب کے سب لوگ نیک اور پارسا بن جائیں اور ان کے دل ایسے ہو جائیں جیسے ان میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار شخص کا دل ہو۔ اور مخلوق کی نافرمانی کے ساتھ اس کی مملکت میں کچھ کمی واقع نہیں

[1] البخاري، كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا نام، رقم الحديث (6313) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب ما يقول عند النوم، رقم الحديث: 56 (2710)

ہوتی، خواہ سارے کے سارے جن وانس نافرمان اور فاجر بن جائیں اور ان کے دل ایسے ہو جائیں جیسے ان میں سے سب سے زیادہ فاجر کا دل ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے۔ اسے اپنی ذات وصفات اور اپنے افعال میں مطلق کمال حاصل ہے۔ اس کی ملکیت کامل ہے اور اس میں کسی طرح سے کوئی کمی نہیں ہے۔ نیز اِس میں اس بات کی دلیل ہے کہ تقویٰ اور فسق وفجور میں اصل حیثیت دلوں کی ہے۔ اگر دل نیک اور پرہیزگار ہو تو باقی اعضاء بھی پرہیزگار بن جاتے ہیں اور اگر دل فاجر ہو تو باقی تمام اعضاء بھی فاجر بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

«اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا»[1] ''تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔''

اللہ کے خزانے ختم ہونے والے نہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

«يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ فَسَأَلُوْنِيْ فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ»

''اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور تمام آدمی اور تمام جنات، سب ایک میدان میں کھڑے ہوں، پھر مجھ سے مانگنا شروع کریں اور میں ہر ایک کو جو وہ مانگے دے دوں، تب بھی میرے پاس جو کچھ ہے وہ کم نہ ہوگا مگر اتنا جیسے سمندر میں سوئی ڈبو کر نکال لو۔''

اِس سے مراد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت وبادشاہت کا کمال ذکر کرنا ہے۔ اور یہ کہ اس کی ملکیت میں جو خزانے ہیں وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں اور نہ ہی ان میں سے خرچ کرنے سے ان میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے، خواہ وہ ایک ہی جگہ پر جن وانس کے اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کو ان کی ڈیمانڈ کے مطابق عطا کرے۔ اِس میں اس بات کی ترغیب ہے کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنا چاہیے اور اپنی تمام ضرورتیں اسی کے سامنے رکھنی چاہئیں۔

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ خرچ کرنے اور دن اور رات کی سخاوت سے اس میں کوئی کمی واقع

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم، رقم الحديث: 32 (2564)

نہیں ہوتی۔ تمھارا کیا خیال ہے، تمھارے رب نے جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تب سے اس نے کتنا خرچ کیا ہوگا! اس سے اس کے دائیں ہاتھ میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔“[1]

اسی طرح سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي إِنْ شِئْتَ وَلٰكِنْ لِيَعْزِمِ الْمَسْأَلَةَ وَلْيُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَتَعَاظَمُهُ شَيْءٌ أَعْطَاهُ »[2]

”جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف کر دے، بلکہ وہ پورے عزم ویقین کے ساتھ سوال کرے اور اپنی رغبت کو بڑا کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز بڑی نہیں جو وہ عطا کرے۔“

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

« مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ »

”میرے پاس جو کچھ ہے وہ کم نہ ہوگا مگر اتنا جیسے سمندر میں سوئی ڈبو کر نکال لو۔“

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے اس میں قطعی طور پر کوئی کمی نہیں آتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ [النحل: ٩٦]

”جو تمھارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے، کچھ دینے کا، یا عذاب نازل کرنے کا، یا کسی اور چیز کا، تو وہ ”کن“ کہتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے خزانوں میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے! اسی طرح وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو بس کلمہ ”کن“ کہتا ہے تو وہ پیدا ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾

[آل عمران: ٥٩]

---

[1] البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالىٰ: ﴿ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ رقم الحديث (7411) ومسلم، كتاب الزكاة، باب الحث على النفقة، رقم الحديث: 337 (993)

[2] مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب العزم بالدعا، رقم الحديث: 8 (2679)

’’اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال ہو بہو آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے جسے مٹی سے بنا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا، پس وہ ہو گیا۔‘‘

ہمارے اعمال کو شمار کیا جا رہا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«يَا عِبَادِيْ! إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا»

’’اے میرے بندو! یہ تو تمھارے ہی اعمال ہیں جن کو میں تمھارے لیے شمار کرتا رہتا ہوں، پھر تمھیں ان اعمال کا پورا بدلہ دوں گا۔‘‘

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو شمار کرتا ہے، پھر انھیں ان کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾

[الزلزال: ۷۔۸]

’’پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔‘‘

اسی طرح فرمایا:

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ [الکہف: ۴۹]

’’اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا۔‘‘

اسی طرح فرمایا:

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ﴾ [آل عمران: ۳۰]

’’جس دن ہر شخص اپنی کی ہوئی نیکیوں کو موجود پائے گا اور اپنی کی ہوئی برائیوں کے بارے میں آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور ان کے درمیان بہت ہی دوری ہوتی۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ «ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا» ’’پھر میں تمھیں ان اعمال کا پورا بدلہ دوں گا۔‘‘ تو ظاہری طور پر اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اِس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [آل عمران: ۱۸۵]

''اور تمھیں تمھارے اجر قیامت کے روز پورے پورے دیے جائیں گے۔''

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ [النساء: ۱۲۳]

''جو برا کرے گا اس کی سزا پائے گا۔''

اعمال چاہے برے ہوں یا اچھے، ان کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ شر کا بدلہ بغیر زیادتی کے اتنا ہی دیا جائے گا جتنا اس کا عمل ہوگا، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کر دے۔ جبکہ خیر کا بدلہ کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے اجر کے برابر، بلکہ سات سو نیکیوں کے اجر کے برابر، بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے، جس کی مقدار کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ۱۰]

''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ کا اس ارشاد:

« فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ »

''لہٰذا جو شخص بہتر بدلہ پائے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے (کہ اس کی کمائی بیکار نہ گئی) اور جو برا بدلہ پائے تو وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے (کہ اس نے جیسا کیا ویسا پایا)۔''

میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خیر پوری کی پوری بندے پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، نہ کہ اس کا استحقاق۔ اور شر پورے کا پورا ابن آدم کی طرف سے ہے، اس کی نفسانی خواہشات کی اتباع کی بنا پر۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ [النساء: ۷۹]

''آپ کو جو بھلائی ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ آپ کے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔''

مذکورہ بالا جملہ کے دو مفہوم:

① اگر اس سے مراد یہ ہو کہ جو شخص دنیا میں بہتر بدلہ پائے تو وہ اس وقت اِس بات کا مامور ہوگا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ اسے دنیا ہی میں نیک اعمال کا اچھا بدلہ مل گیا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [النحل: ٩٧]

"جو شخص نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ایمان والا ہو تو اسے ہم یقیناً بہت ہی اچھی زندگی عطا کریں گے اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انھیں ضرور دیں گے۔"

اور اگر اسے دنیا ہی میں اس کے برے اعمال کی سزا مل جائے تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [السجدة: ٢١]

"اور ہم انھیں بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے، شاید کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔"

مومن پر جب دنیا میں کوئی آزمائش آئے تو وہ اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے آپ ہی کو ملامت کرتا ہے اور یہ چیز اسے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور توبہ واستغفار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

② اگر اس سے مراد یہ ہو کہ جو شخص آخرت میں بہتر یا برا بدلہ پائے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ جو لوگ بہتر بدلہ پائیں گے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے اور جو لوگ برا بدلہ پائیں گے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کریں گے، جبکہ اس دن انھیں ملامت کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ گویا اِس جملے میں امر بمعنی خبر ہے۔ جیسا کہ اِس حدیث میں ہے:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

"جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

اِس کا معنی یہ ہے کہ کاذب اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارے میں خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے جو نعمتیں عطا کرے گا اس پر وہ اس کا شکرادا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ ﴾ [الأعراف: ٤٣]

''اور جو کچھ ان کے دلوں میں کینہ تھا ہم اس کو دور کر دیں گے۔ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے: اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہمیں اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں نہ پہنچاتا۔''

سلف صالحین اعمالِ صالحہ میں خوب اجتہاد کرتے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب اعمال منقطع ہو جائیں تو اپنی کمی کوتاہی پر اپنے آپ کو ہی ملامت کرنی پڑے۔

فوائدِ حدیث:

1. ظلم کی دو قسمیں ہیں: اپنے آپ پر ظلم کرنا اور کسی اور کو ظلم کا نشانہ بنانا۔
2. اس حدیث مبارکہ میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے اپنی تمام تر دنیوی واخروی مصلحتوں کا سوال اسی سے کریں۔
3. ہدایت کی دو قسمیں ہیں: مجمل اور مفصل۔
4. تقویٰ اور فجور میں دل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔
5. اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: «ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا» ''پھر میں تمھیں ان اعمال کا پورا پورا بدلہ دوں گا۔'' ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا میں ہو اور ہو سکتا ہے کہ یہ آخرت میں ہو۔

سوالات:

1. بعض دلائل ذکر کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔
2. ظلم کی لغوی واصطلاحی تعریف کریں۔
3. اس شخص پر رد کیسے کریں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کو منسوب کرے اور دلیل یہ پیش کرے کہ اللہ ہی نے ظلم کو پیدا کیا ہے؟
4. حدیث سے یہ بات اخذ کریں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔

5 أ: اللہ تعالیٰ کے فرمان: «كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ» اور نبی ﷺ کی حدیث: «كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ» کے مابین تطبیق کیسے ہوگی؟

ب: اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: «لَنْ تَبْلُغُوا ضُرِّي» اور آیتِ مبارکہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ [الاحزاب: ٥٧] کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟

6 حدیث کے ان الفاظ: «إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ» کا کیا معنی ہے؟

7 ''تقویٰ اور فجور میں اصل حیثیت دل کو حاصل ہے۔'' حدیث کے فہم کی روشنی میں اس جملے کی وضاحت کریں۔



بغیر مال کے صدقہ

25 سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگوں نے آپ سے کہا: اے اللہ کے رسول! مال والے لوگ اجر وثواب لے گئے، وہ ہماری طرح نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور اپنے بچے ہوئے مالوں کا صدقہ بھی کرتے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُونَ؟ إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلِّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلِّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةً، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ»، قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَيَكُونُ لَهُ فِيهَا أَجْرٌ؟ قَالَ: «أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ فِيهَا وِزْرٌ؟ فَذَلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهُ أَجْرًا»[1]

''کیا اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے بھی صدقہ کرنے کا ذریعہ نہیں بنا دیا؟ بے شک ہر تسبیح (سبحان اللہ) صدقہ ہے، اور ہر تکبیر (اللہ اکبر) صدقہ ہے اور ہر تحمید (الحمد للہ) صدقہ ہے، اور ہر تہلیل (لا إلہ إلا اللہ) صدقہ ہے، نیکی کا ہر حکم صدقہ ہے، اور ہر برائی سے روکنا صدقہ ہے، اور تم میں سے ایک کے جماع میں بھی صدقہ ہے۔''

انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی شخص اپنی شہوت کو پورا کرے، اس میں بھی اسے اجر ملے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمھارا کیا خیال ہے اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی شہوت کو پورا کرے تو کیا اسے گناہ ہو گا؟ اسی طرح اگر وہ حلال طریقے سے پورا کرے تو اس میں اسے اجر ملے گا۔''

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اعمالِ صالحہ کے شدید شوق اور خیر کے کاموں میں انتہائی رغبت کی وجہ سے، جو خیر کا کام وہ نہیں کر سکتے تھے اور ان کے دیگر ساتھی وہ کام کر سکتے

[1] رواہ مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، رقم الحديث (1006)

تھے اس پر انھیں غم ہوتا تھا، چنانچہ فقراء کو ان اموال کے ساتھ صدقہ نہ کر سکنے کی وجہ سے غم ہوتا تھا جن کے ساتھ اغنیاء صدقہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح جہاد کے لیے ضروری ساز وسامان کے حصول پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے وہ جہاد سے پیچھے رہنے پر بھی غمزدہ ہوتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ﴾ [التوبة: ٩٢]

''ہاں ان پر بھی کوئی حرج نہیں جو آپ کے پاس آتے ہیں کہ آپ انھیں سواری مہیا کر دیں تو آپ جواب دیتے ہیں کہ میں تمھاری سواری کے لیے کچھ بھی نہیں پاتا، تو وہ رنج وغم سے اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی میسر نہیں۔''

اِس حدیث میں یہ بھی ہے کہ فقراء نے اغنیاء پر اس لیے رشک کیا کہ انھیں اپنے مالوں کے ذریعے صدقہ کر کے اجر حاصل ہوتا ہے، چنانچہ نبی ﷺ نے انھیں ان صدقات کے بارے میں آگاہ فرمایا جن کی وہ قدرت رکھتے تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھتے تھے کہ صدقہ صرف مال کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے اور وہ اس سے عاجز ہیں، تو انھیں نبی ﷺ نے آگاہ فرمایا کہ ہر نیکی کا کام اور احسان صدقہ ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ»[1] ''ہر نیکی کا کام صدقہ ہے۔''

لہٰذا ''صدقہ'' کا اطلاق نیکی کے تمام کاموں اور احسان پر ہوتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا جو فضل اس کے بندوں تک پہنچتا ہے اس پر بھی صدقے کا اطلاق ہوتا ہے۔ جبکہ بعض سلف صالحین اِس بات کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے کہ صدقہ تو صرف اس کی طرف سے ہوتا ہے جو اس کا بدلہ اور اجر پانے کا طلب گار ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اِس کا طلب گار نہیں ہوتا، لیکن ان کی یہ بات درست نہیں ہے، کیونکہ سفر میں نماز قصر کرنے کے بارے میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوا صَدَقَتَهُ»[2]

---

[1] رواه مسلم، كتاب الزكاة، باب بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، رقم الحديث: 52 (1005)

[2] رواه مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين، رقم الحديث: 4 (686)

’’یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ ہے جو اس نے تم پر کیا ہے، لہٰذا تم اس کا صدقہ قبول کرو۔‘‘

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’جو شخص رات کو نماز (تہجد) پڑھتا ہو، پھر اس پر نیند غالب آجائے اور وہ اس نماز سے سو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی نماز کا اجر لکھ دیتا ہے۔ اور اس کی نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر صدقہ ہوتی ہے جو وہ اس پر کرتا ہے۔‘‘[1]

خالد بن معدان کہتے ہیں:

’’بے شک اللہ تعالیٰ ہر دن ایک صدقہ کرتا ہے۔ اور وہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر اِس سے بہتر صدقہ نہیں کرتا کہ وہ اسے اپنے ذکر کی توفیق دے دے۔ (یعنی ذکر کی توفیق ملنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندے پر سب سے بڑا صدقہ ہے۔)

بغیر مال کے صدقہ اور اس کی انواع واقسام:

بغیر مال کے صدقہ کی دو قسمیں ہیں:

- پہلی قسم:

لوگوں پر احسان کرنا ان پر صدقہ ہے اور بعض اوقات یہ صدقہ مال کے صدقے سے بھی بہتر ہوتا ہے، جیسا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی اطاعت کرنے اور معاصی سے پرہیز کرنے کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور یہ مال کے ساتھ فائدہ پہنچانے سے بہتر ہے۔ اسی طرح علم نافع کی تعلیم دینا، قرآن پڑھانا، راستے پر پڑی ہوئی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا، لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور انھیں نقصان سے بچانے کے لیے کوشش کرنا، عام مسلمانوں کے لیے دعا کرنا اور ان کے لیے مغفرت طلب کرنا بھی اسی قسم کے صدقے میں شامل ہے۔

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ جس کو علم نہ ہو اسے علم سکھانا صدقہ ہے۔

اسی طرح اِس صدقہ کی انواع میں سے ایک نوع لوگوں سے تکلیف دور کرنا بھی ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ پر ایمان لانا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔‘‘ میں نے کہا: کون سی گردن کو

---

[1] رواه النسائي، كتاب قيام الليل، باب من كان له صلاة بالليل، رقم الحديث (1783) وأبو داود، كتاب الصلاة، باب من نوى الصيام فنام، رقم الحديث (1314)

آزاد کرنا افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اپنے مالکوں کے نزدیک سب سے زیادہ عمدہ اور قیمتی ہو۔'' میں نے کہا: اگر میں نہ کرسکوں تو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کسی صنعت والے کی مدد کرنا، یا جو شخص کوئی کام نہ جانتا ہو اسے کسی کام کی تعلیم دینا۔'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے اگر میں ان میں سے کوئی کام نہ کرسکوں تو پھر؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھنا، یہ بھی تمھارے لیے صدقہ ہے۔''[1]

حدیثِ ابوذر رضی اللہ عنہ کی دیگر روایات میں کچھ اور اضافے بھی ہیں، چنانچہ سنن ترمذی میں ان کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اپنے بھائی کے سامنے تمھارا مسکرانا صدقہ ہے، نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، برائی سے منع کرنا صدقہ ہے، راستہ گم پانے والے شخص کی راہنمائی کرنا صدقہ ہے، کم نظر کو راستہ دکھانا صدقہ ہے، راستے سے پتھر، کانٹے اور ہڈی کو ہٹانا صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا صدقہ ہے۔''[2]

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ایک دینار وہ ہے جو تم اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو، ایک دینار وہ ہے جس سے تم غلام آزاد کرتے ہو، ایک دینار وہ ہے جس کے ساتھ تم مسکین پر صدقہ کرتے ہو اور ایک دینار وہ ہے جسے تم اپنے گھر والوں پر خرچ کرتے ہو۔ اِن میں سب سے افضل وہ ہے جسے تم اپنے گھر والوں پر خرچ کرتے ہو۔''[3]

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان کوئی پودا لگائے، یا کھیتی کاشت کرے، پھر اس سے کوئی انسان، یا پرندہ، یا جانور کھائے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔''[4]

---

[1] رواه البخاري، كتاب العتق، باب أي الرقاب أفضل، رقم الحديث (2518) ومسلم، كتاب الإيمان، باب كون الإيمان بالله أفضل الأعمال، رقم الحديث: 136 (83)

[2] الترمذي، كتاب البر والصلة، باب ما جاء في صنائع المعروف، رقم الحديث (1956)

[3] رواه مسلم، كتاب الزكاة، باب فضل النفقة على العيال، رقم الحديث: 39 (995)

[4] رواه البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع، رقم الحديث (2320) ومسلم، كتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع، رقم الحديث: 12 (1553)

صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان کوئی بھی پودا لگائے، تو اس سے جو کھایا جائے وہ صدقہ ہے، اس سے جو چوری کیا جائے وہ صدقہ ہے، جو درندے کھالیں وہ صدقہ ہے، جو پرندے کھالیں وہ صدقہ ہے۔ اور جو بھی اس سے کچھ لے کر اسے کم کر دے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔''[1]

اجر نیت کے ساتھ مربوط ہے:

مذکورہ احادیث سے ظاہری طور پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں صدقہ ہوتی ہیں اور زراعت کرنے اور بیج بونے والا بغیر نیت وقصد کے ان پر ماجور ہوتا ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''تمھارا کیا خیال ہے، اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی شہوت کو پورا کرے تو کیا اسے گناہ ہوگا؟ اسی طرح اگر وہ حلال طریقے سے پورا کرے تو اس میں اسے اجر ملے گا۔'' بھی بظاہر اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کو بیوی سے جماع کرنے کا ثواب ملتا ہے خواہ اس کی نیت ثواب حاصل کرنے کی نہ ہو۔ کیونکہ بیوی سے جماع کرنے والا شخص اس کاشتکار کی مانند ہے جو زمین میں کاشت کرتا اور بیج بوتا ہے۔ یہ علماء کے ایک گروہ کا نظریہ ہے۔ ابو احمد بن قتیبہ رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی کی طرف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کھانے، پینے اور جماع میں بھی انسان کو اجر ملتا ہے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس حدیث سے استدلال کیا ہے:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُؤْجَرُ فِي كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى اللُّقْمَةِ يَرْفَعُهَا إِلَى فِيهِ»

''بے شک مومن کو ہر چیز میں اجر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس لقمہ میں بھی جسے وہ اپنے منہ کی طرف اٹھاتا ہے۔''

جبکہ یہ الفاظ جن سے انھوں نے استدلال کیا ہے، غیر معروف ہیں۔ دوسری طرف سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان معروف ہے:

«إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا، حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ»[2]

---

[1] رواه مسلم، كتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع، رقم الحديث: 7(1552)

[2] البخاري، كتاب الإيمان، باب ما جاء في أن الأعمال بالنية، رقم الحديث (56) ومسلم، كتاب الوصية، باب الوصية بالثلث، رقم الحديث: 5(1628)

''تم اللہ کی رضا کو طلب کرتے ہوئے جو بھی خرچ کرو گے اس پر تمھیں اجر دیا جائے گا، یہاں تک کہ اس لقمے پر بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔''

اِس حدیث میں اللہ کے لیے اخلاصِ نیت کی قید لگائی گئی ہے، لہٰذا جتنی مطلق احادیث وارد ہوئی ہیں وہ سب اس مقید حدیث پر محمول کی جائیں گی۔ واللہ اعلم

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے:

﴿ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾ [النساء: ۱۱۴]

''ان کی بہت ساری سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے۔ سوائے اس آدمی کے جو صدقہ یا بھلائی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے۔ اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا تو ہم اسے عنقریب اجرِ عظیم عطا کریں گے۔''

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین کاموں (صدقہ، نیکی اور اصلاح) میں خیر رکھی ہے، لیکن ان پر اجر مرتب نہیں کیا، سوائے اس کے کہ جو یہ کام اخلاصِ نیت کے ساتھ کرے تو وہ ماجور ہوگا۔ اور جو ان کاموں میں سے کوئی کام ریاکاری کے ساتھ کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔ تاہم تردد اِس بات میں ہے کہ جو اسے اچھی یا بری نیت کے بغیر انجام دے تو اسے کیا ملے گا؟

ابو سلیمان الدارانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جو شخص بغیر نیت کے کوئی عملِ خیر کرے تو اسے اسلام کو دیگر ادیان پر ترجیح دیتے ہوئے اس کو اختیار کرنے کی نیت ہی کافی ہوگی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگر نیت نہ بھی کرے تب بھی اسے اجر دیا جائے گا، کیونکہ اسے اسلام میں داخل ہونے کے بعد اجمالی طور پر تمام اعمالِ خیر کا اختیار دیا گیا ہے، لہٰذا وہ ان میں سے جو بھی عمل کرے گا اسے اسی نیت کے ساتھ اجر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

نبی ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''تمھارا کیا خیال ہے، اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی شہوت کو پورا کرے تو کیا اسے گناہ ہوگا؟ اسی طرح اگر وہ حلال طریقے سے پورا کرے تو اس میں اسے اجر ملے گا'' اسے اصولیوں کے ہاں قیاسِ عکس کہا جاتا ہے اور اسی سے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک بات ارشاد فرمائی اور میں نے ایک دوسری بات کہی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ النَّارَ»
اور میں نے کہا: "مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ"[1]

غیر مالی صدقہ کی دوسری قسم:

بغیر مال کے صدقے کی دوسری قسم وہ ہے جس کا نفع صرف اس کے کرنے والے ہی کی ملتا ہے۔ جیسا کہ ذکرِ الٰہی کی مختلف انواع ہیں، مثلاً: تسبیح، تحمید، تکبیر، تہلیل اور استغفار وغیرہ۔ اسی طرح مساجد کی طرف چل کر جانا بھی صدقہ ہے۔ کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ نماز، روزہ، حج اور جہاد بھی صدقہ ہیں۔ اِس قسم میں جتنے اعمال ہیں ان میں سے اکثر اعمال مالی صدقات سے افضل ہیں، کیونکہ نبی ﷺ نے ان کا ذکر فقراء کے ایک سوال کے جواب میں کیا تھا کہ وہ اغنیاء کے مالی صدقات کا مقابلہ کس طرح کریں؟ جہاں تک فرائض کا تعلق ہے تو ان میں وہ سب کے سب شریک تھے۔

ذکر صدقہ سے افضل ہے:

ذکر مالی صدقہ اور دیگر کئی اعمال سے افضل ہے۔ اِس بارے میں بہت ساری نصوص موجود ہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ، وَ أَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ، وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ، وَخَيْرٍ لَكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ، وَخَيْرٍ لَكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ؟»

"کیا میں تمھیں اس عمل کے بارے میں خبر نہ دوں جو اعمال میں سب سے افضل ہے؟ اور جو تمھارے بادشاہ (یعنی اللہ تعالیٰ) کے ہاں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے؟ اور جو تمھارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا ہے؟ اور جو تمھارے لیے سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی بہتر ہے؟ اور جو اِس سے بھی افضل ہے کہ تمھاری دشمن سے مڈبھیڑ ہو، پھر تم ان کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمھاری گردنیں اڑائیں؟"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: کیوں نہیں۔

[1] البخاري، كتاب الجنائز، باب في الجنائز من كان آخر كلامه لا إله إلا الله، رقم الحديث (1238) ومسلم، كتاب الإيمان، باب من مات لا يشرك بالله شيئاً، رقم الحديث: 150 (92)

تو آپ ﷺ نے فرمایا: «ذِكْرُ اللّٰهِ»[1] ''وہ اللہ کا ذکر ہے۔''

اسی طرح صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص یہ دعا دن میں سو مرتبہ پڑھے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»[2]

تو اسے سو مرتبہ پڑھنا دس گردنوں کو آزاد کرنے کے برابر ہے، اس کے لیے سو نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور اس کے سو گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اور یہ دعا شام ہونے تک اس کے لیے شیطان کے سامنے قلعہ بنی رہتی ہے۔ اور کوئی شخص اس جیسا عمل نہیں کر سکتا سوائے اس کے جو اس سے زیادہ عمل کرے۔''

اسی طرح اِس دعا کے بارے میں صحیحین میں سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، عَشْرَ مِرَارٍ كَانَ كَمَنْ أَعْتَقَ أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وُلْدِ إِسْمٰعِيلَ»[3]

''جو شخص یہ دعا دس مرتبہ پڑھے تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے اولادِ اسماعیل (علیہ السلام) میں سے چار غلاموں کو آزاد کر دیا۔''

اور جناب ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: اگر میں سو مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہوں تو یہ مجھے سو دینار صدقہ کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. نیک کام کرنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش ہوتی تھی۔

---

① مسند أحمد (195/5) الترمذي، كتاب الدعاء، باب (6)، رقم الحديث (3377)

② البخاري، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، رقم الحديث (3293) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب فضل التهليل والتسبيح، رقم الحديث: 28 (2691)

③ البخاري مختصرا، كتاب الدعوات، باب فضل التهليل، رقم الحديث (6404) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب فضل التهليل والتسبيح، رقم الحديث: 30 (2693)

2 اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے، چنانچہ عبادت میں ہر ایسا عمل آتا ہے جسے مسلمان نیک نیتی اور اچھے ارادے سے انجام دے (بشرطیکہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔)

3 مباح اعمال نیتِ صادقہ کے ساتھ عبادات بن جاتے ہیں۔

4 اِس حدیث میں تسبیح وتکبیر اور دیگر تمام اذکار کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

5 یہ حدیث قیاس کے جواز کی دلیل ہے اور یہی جمہور علمائے کرام کا مسلک ہے جس میں اہلِ ظاہر کے علاوہ ان کا کوئی مخالف نہیں۔

سوالات:

1 کیا صدقہ صرف ان امور میں منحصر ہے جو حدیث میں مذکور ہیں؟ اپنے جواب کی دلیل بھی پیش کریں۔

2 اِس حدیث پر عمل کرنے سے مومن کے سلوک اور اجتماعی زندگی میں اثر پڑتا ہے، اِس کی وضاحت کریں۔

3 اِس حدیث سے علماء نے قیاس کے جواز کی دلیل لی ہے تو آپ اس کی وضاحت کریں کہ یہ حدیث قیاس کے جواز کی دلیل کیسے بنتی ہے؟

4 حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے غیر مالی صدقے کی دو قسمیں ذکر کی ہیں، تو وہ کون سی ہیں؟ اور حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے اس تقسیم کا استنباط حدیث سے کیسے کیا ہے؟ دونوں قسموں کی مثالیں بھی ذکر کریں۔

5 اِس حدیث میں نماز، روزہ، حج اور جہاد کا ذکر نہیں کہ یہ بھی صدقے میں شامل ہیں، باوجود اِس کے کہ یہ افضل اعمال میں سے ہیں، تو اِس کی کیا وجہ ہے؟



صدقہ کی آسانی

(26) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كُلُّ سُلَامَى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيهِ الشَّمْسُ» قَالَ: «تَعْدِلُ بَيْنَ الِاثْنَيْنِ صَدَقَةٌ وَتُعِينُ الرَّجُلَ فِي دَابَّتِهِ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا أَوْ تَرْفَعُ لَهُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ» قَالَ: «وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ خُطْوَةٍ تَمْشِيهَا إِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيطُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ»[1]

”لوگوں کے ہر جوڑ پر ہر دن جس کا سورج طلوع ہو، صدقہ کرنا ضروری ہے۔تم دو آدمیوں کے درمیان عدل کرو صدقہ ہے۔تم کسی آدمی کی اس کے جانور کے معاملے میں مدد کرو، اسے اس پر بٹھاؤ، یا اس کا سامان اس کے اوپر رکھو، صدقہ ہے۔ پاکیزہ لفظ صدقہ ہے۔ نماز کے لیے چل کر جاؤ تو ہر قدم پر صدقہ ہے۔ راستے پر پڑی ہوئی تکلیف دہ چیز کو ہٹاؤ تو یہ بھی صدقہ ہے۔“

«عَلَى كُلِّ سُلَامَى صَدَقَةٌ» ”ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہے۔“

ابو عبید رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اصل میں «سُلَامَى» اس ہڈی کو کہتے ہیں جو اونٹ کے کھر میں ہوتی ہے۔ گویا حدیث کا معنی یہ ہوا کہ ابن آدم کی ہڈیوں میں سے ہر ہڈی پر صدقہ ہے۔

ابو عبید رحمہ اللہ اِس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ «سُلَامَى» ان چھوٹی ہڈیوں کا نام ہے جو اونٹ میں ہوتی ہیں۔ پھر ان کی تعبیر مجموعی طور پر آدمی وغیرہ کی ہڈیوں سے کی ہے۔تو حدیث کا معنی یہی ہوا کہ ابن آدم کی ہر ہڈی پر صدقہ ضروری ہے۔

بعض اہل لغت کا کہنا ہے کہ «سُلَامَى» ہاتھ اور پاؤں کے کنارے میں ایک ہڈی کو کہتے ہیں۔ اور نبی ﷺ نے اس کے ساتھ جسم کی تمام ہڈیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

«سُلَامَى» جمع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفرد ہے۔ علمائے طب نے ذکر کیا ہے کہ جسم کی

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الجهاد، باب من أخذ بالركاب، رقم الحديث (2989) ومسلم، كتاب الزكاة، باب بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، رقم الحديث: 56 (1009)

تمام ہڈیوں کی تعداد: ۲۴۸ ہے۔ چھوٹی چھوٹی ہڈیاں اِن کے علاوہ ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ٹوٹل ہڈیاں: ۳۶۰ ہیں، ان میں سے حسی طور پر ۲۶۵ ظاہر ہوتی ہیں اور باقی چھوٹی ہوتی ہیں جو ظاہر نہیں ہوتیں۔ اور شاید نبی ﷺ نے « سُلَامَی » کا لفظ بول کر انھی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ بنیادی طور پر بھی « سُلَامَی » اونٹ کے جسم میں سب سے چھوٹی ہڈی کو کہتے ہیں۔ اور اِس حدیث کی وہ روایت جو مسند بزار میں ہے اس میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ الفاظ ہیں: « أَوْ سِتَّةٌ وَّثَلَاثُوْنَ سُلَامَی » یا چھتیس ہڈیاں۔[1]

بہت اہم نعمتیں:

حدیث کا معنی یہ ہے کہ ان ہڈیوں کی ترکیب اور ان کی سلامتی بندے پر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اِس لیے ان میں سے ہر ہڈی صدقے کی محتاج ہے، جو ابن آدم نے ہر دن کرنا ہوتا ہے، تاکہ اِس نعمت کا شکرانہ ادا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴾ [الإنفطار: ٦۔ ٨]

”اے انسان! تجھے اپنے ربِ کریم سے کس چیز نے بہکایا؟ جس نے تجھے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھاک کیا، درست اور برابر بنایا جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔“

اسی طرح اللہ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ [الملك: ٢٣]

”کہہ دیجیے کہ وہی اللہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکر گزاری کرتے ہو۔“

نیز فرمایا:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ ۝ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیْنِ ﴾ [البلد: ٨۔ ٩]

”کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے؟“

[1] أخرجه البزار، كتاب الزكاة، أبواب صدقة التطوع، باب ما يؤجر فيه المؤمن: 454/1 (957)

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”یہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں ہیں جن کا وہ تمھیں اقرار کرا رہا ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔“

فضیل رحمہ اللہ ساری رات یہی آیتیں پڑھتے اور روتے رہے، ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا:

”کیا تم نے کبھی پوری رات اللہ تعالیٰ کے شکر میں گزاری کہ اس نے تمھیں دو آنکھیں دیں جن کے ساتھ تم دیکھتے ہو؟ اور کیا تم نے کبھی پوری رات اللہ تعالیٰ کے شکر میں گزاری کہ اس نے تمھیں ایک زبان دی جس کے ساتھ تم بولتے ہو؟ پھر انھوں نے اسی طرح سے مزید نعمتیں بھی شمار کیں۔“

یونس بن عبید رحمہ اللہ کے ہاں ایک آدمی نے اپنی تنگ حالی کی شکایت کی تو انھوں نے کہا:

”کیا تمھیں اچھا لگتا ہے کہ تمھاری یہ آنکھیں جن کے ساتھ تم دیکھتے ہو، انھیں چھین کر تمھیں ایک لاکھ درہم دے دیے جائیں؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے کہا: تمھارے یہ ہاتھ تم سے لے کر تمھیں ایک لاکھ درہم دے دیے جائیں؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے کہا: تمھارے یہ پاؤں تم سے لے کر تمھیں ایک لاکھ درہم دے دیے جائیں؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر انھوں نے کچھ اور نعمتیں بھی شمار کیں۔ پھر کہا: میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے پاس لاکھوں درہم ہیں اور پھر بھی تم شکایت کرتے ہو!“

بکر المزنی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”اے ابن آدم! اللہ تعالیٰ نے تمھیں جو نعمتیں دی ہیں، اگر تم ان کی قدر و قیمت جاننا چاہو تو بس ذرا اپنی آنکھیں بند کرلو۔“

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ»[1]

”دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن میں بہت سارے لوگ گھاٹے میں رہتے ہیں اور وہ ہیں: صحت اور فراغت۔“

نعمتوں کا شکرانہ:

اللہ تعالیٰ کی یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے شکرانے کے متعلق انسان سے قیامت کے روز پوچھ گچھ کی جائے گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب ما جاء في الرقاق وأن لا عيش إلا عيش الآخرة، رقم الحديث (6412)

﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ﴾ [التكاثر: ٨]

''پھر تم سے یقینی طور پر نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس آیت میں نعمتوں سے مراد امن اور صحت جیسی نعمتیں ہیں۔

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس آیت کے بارے میں کہا:

''قیامت کے دن بندوں سے پوچھا جائے گا کہ بدن، کان اور آنکھوں کی صحت کو تم نے کس چیز میں استعمال کیا؟ جبکہ وہ ان سے زیادہ اس چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴾ [الإسراء: ٣٦]

''کان، آنکھ اور دل ان میں ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔''

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اتنی نعمتیں دی ہیں کہ وہ انھیں شمار بھی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ﴾ [إبراهيم: ٣٤]

''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو کبھی ان کا حساب نہیں رکھ سکو گے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کریں۔ اگر وہ شکر ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے گا۔

سلیمان التیمی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے حساب سے نعمتوں سے نوازا ہے اور انھیں ان کے حساب سے شکرانے کا مکلف بنایا ہے۔ حتی کہ وہ بس اِس بات پر راضی ہو گیا ہے کہ بندے اس کی نعمتوں کا دل سے اقرار کریں اور زبان سے شکرانہ ادا کریں۔

جیسا کہ ابو داود اور نسائی میں سیدنا عبداللہ بن غنام رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص صبح کے وقت یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ مَا أَصْبَحَ بِي مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ، فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيكَ لَكَ، فَلَكَ الْحَمْدُ وَالشُّكْرُ»

اور شام کے وقت یہ پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ مَا أَمْسَى بِيْ مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ، فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، فَلَكَ الْحَمْدُ وَالشُّكْرُ»[1]

تو اس نے اس دن کا شکر ادا کر دیا اور جو اسے شام کے وقت پڑھ لے اس نے اس رات کا شکر ادا کر دیا۔"

«كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ»:

یعنی ابن آدم پر لازم ہے کہ وہ دنیا کے ایام میں سے ہر دن ان اعضاء کی طرف سے صدقہ کرے، کیونکہ یوم سے بعض اوقات ایک دن سے زیادہ مدت بھی مراد لی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے: یوم صفین، جبکہ صفین کی جنگ کئی دن تک جاری رہی تھی۔ اور بعض اوقات اس سے مراد مطلقاً وقت لیا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [هود: ٨]

وقت دن بھی ہوسکتا ہے اور رات بھی، چنانچہ جب یہ کہا گیا کہ ہر وہ دن جس کا سورج طلوع ہو، تو اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ ابن آدم دنیا میں جو ایام گزارے، ان میں سے ہر دن یہ صدقہ کرنا اس پر لازم ہے۔

شکر کے درجات:

اِس حدیث سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِس صدقے کے ساتھ شکرانہ ادا کرنا ہر مسلمان پر ہر دن واجب ہے، لیکن شکر کے دو درجے ہیں:

پہلا درجہ: واجب، یعنی وہ واجبات کو پورا کرے اور محرمات سے اجتناب کرے۔ یہ شکر انتہائی ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور یہ ان نعمتوں کے شکر میں کافی ہے۔ اسی بنا پر بعض سلف کا کہنا ہے کہ شکر ترکِ معاصی کا نام ہے۔ اور ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ شکر یہ ہے کہ نعمتوں میں سے کسی کے ذریعے اللہ کی معصیت نہ کی جائے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے ایک آدمی کو دیکھا جو اکڑ کر تکبر سے چل رہا تھا تو انھوں نے کہا:

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الأدب، باب ما يقول إذا أصبح، رقم الحديث (5073) والنسائي في السنن الكبرىٰ، كتاب عمل اليوم والليلة، باب ثواب من قال حين يصبح، رقم الحديث (9835) وفيه عبد الله بن عنبسة وهو مجهول، وحسنه الشيخ ابن باز.

''انسان کا ہر عضو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے، اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے نہ بنا جو تیری نعمت کے ذریعے تیری معصیت کا ارتکاب کریں۔''

دوسرا درجہ: مستحب، یعنی بندہ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کے ساتھ ساتھ نفلی عبادات بھی کرے۔ شکر کا یہ درجہ ان سبقت لے جانے والے لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ درجہ ہے جس کی طرف نبی ﷺ نے ان احادیث میں راہنمائی فرمائی ہے۔ خود نبی ﷺ نماز پڑھنے میں اجتہاد کرتے تھے اور اتنا لمبا قیام کرتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک پھٹنے لگتے۔ اور جب آپ ﷺ سے کہا جاتا کہ آپ ایسے کیوں کرتے ہیں جبکہ آپ کی اگلی پچھلی اخطاء کو معاف کر دیا گیا ہے؟ تو آپ ﷺ فرماتے: «أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا» [1] ''تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

اور بعض سلف کا کہنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ ﴾ [السبا: ١٣]

''اے آلِ داود! شکر کے طور پر عمل کرو۔''

تو دن اور رات کی ہر گھڑی میں ان میں سے کوئی نہ کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہوتا۔

یہ سب اِس کے باوجود کہ جو اعمال نبی ﷺ نے اِس حدیث میں ذکر فرمائے ان میں سے بعض واجب عینی ہیں، جیسا کہ نماز کی طرف چل کر جانا۔ یہ ان اہلِ علم کی رائے میں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مساجد میں باجماعت نماز پڑھنا واجب ہے۔ یا واجب کفائی ہیں، مثلاً: نیکی کا حکم دینا، برائی سے منع کرنا، محتاج کی مدد کرنا اور لوگوں میں عدل کرنا، ان کے درمیان فیصلہ کر کے یا اصلاح کر کے۔

صدقہ کی دو قسمیں:

نبی ﷺ نے اِس حدیث میں صدقہ کی جن انواع کی طرف اشارہ فرمایا، ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کا نفع دوسروں کو بھی پہنچتا ہے۔ مثلاً: اصلاح، کسی کو اس کی سواری پر بٹھانے میں یا اس کا سامان لادنے میں اس کی مدد کرنا، پاکیزہ کلمہ، جس میں سلام اور چھینکنے والے کو ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' کہنا شامل ہے، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے منع کرنا، مسجد میں پڑی ہوئی تھوک کو دفن کرنا، ضرورت مند کی مدد کرنا، بہرے کو سنانا، کم نظر کو دکھانا، نابینا کی راہنمائی کرنا اور جو راستہ گم کر چکا ہو اسے راستہ دکھلانا۔

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب التفسير -سورة الفتح- باب ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾، رقم الحديث (4836) ومسلم، كتاب صفات المنافقين، باب إكثار الأعمال، رقم الحديث: 81 (2820)

بعض انواع ایسی ہیں جن کا نفع صرف صدقہ کرنے والے ہی کو ہوتا ہے، مثلاً: تسبیح وتکبیر، تحمید و تہلیل، استغفار، نبی ﷺ پر درود بھیجنا، تلاوتِ قرآن، نماز کے لیے مساجد کی طرف چل کر جانا اور ان میں نماز کے انتظار میں یا اللہ کے دین کی گفتگو کو سننے کے لیے بیٹھنا اور چاشت کی نماز پڑھنا وغیرہ۔

اسی طرح اس میں لباس پہننے، چلنے اور اپنی سیرت میں تواضع اختیار کرنا، تکلف ترک کرنا، حلال کمانا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا بھی شامل ہے۔ نیز اس میں اپنے سابقہ اعمال کا محاسبہ کرنا، ندامت وشرمندگی کا اظہار کرنا اور پچھلے گناہوں سے توبہ کرنا وغیرہ بھی شامل ہے۔

مسند احمد میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

کیا تم جانتے ہو کہ کون سا صدقہ سب سے افضل ہے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو زیادہ علم ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"عطیہ یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کو درہم دو، یا اسے سواری کی پیٹھ پر سوار کرو، یا بکری یا گائے کا دودھ دو۔"[1]

اِس حدیث کا شاہد صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"بہترین عطیہ تازہ بیاہی ہوئی اور صاف ستھری اونٹنی ہے۔ اسی طرح صاف ستھری بکری جو صبح کو بھی ایک برتن بھر دے اور شام کو بھی۔"[2]

دراہم کا عطیہ کرنے سے مراد قرض دینا ہے اور سواری کی پیٹھ کے عطیہ سے مراد ہے اسے اس شخص کو ادھار پر دینا جو اس پر سواری کرنا چاہے اور بکری یا گائے کے دودھ کے عطیہ سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی کو بکری یا گائے دے تاکہ وہ اس کا دودھ نکال کر پیے، پھر اسے واپس لوٹا دے اور (منیحہ) کا لفظ جب بھی مطلقاً بولا جائے تو اس سے مراد یہی چیزیں ہوتی ہیں۔

صدقہ کی کچھ اور اقسام:

- لوگوں کو ہاتھ اور زبان کے ذریعے تکلیف نہ دینا:

جیسا کہ صحیحین میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کون سا عمل

---

[1] مسند أحمد (463/1) وفيه إبراهيم الهجري ضعيف.

[2] البخاري، كتاب الهبة، باب فضل المنيحة، رقم الحديث (2629) ومسلم، كتاب الزكاة، باب فضل المنيحة، رقم الحديث: 74 (1020) بمعناه.

سب سے افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ پر ایمان لانا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔'' میں نے کہا: کونسی گردن کو آزاد کرنا افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اپنے مالکوں کے نزدیک سب سے زیادہ عمدہ اور قیمتی ہو۔'' میں نے کہا: اگر میں نہ کرسکوں تو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کسی صنعت والے کی مدد کر دینا، یا جو شخص کوئی کام نہ جانتا ہو اسے کسی کام کی تعلیم دے دینا۔'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے اگر میں ان میں سے کوئی کام نہ کرسکوں تو پھر؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھنا، یہ بھی تمھارے لیے صدقہ ہے۔''[1]

❁ مسلمان کے مسلمان پر جو حقوق ہیں انھیں ادا کرنا:

صحیحین میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات کاموں کا حکم دیا:

''مریض کی عیادت کرنا، فوت شدہ کی نمازِ جنازہ پڑھنا (اور تدفین تک اس کے ساتھ رہنا)، چھینکنے والا (جب الحمد للہ کہے تو) اس کو ''يَرْحَمُكَ اللّٰه'' کہنا، قسم کو پورا کرنا، مظلوم کی مدد کرنا، دعوت قبول کرنا اور سلام کو پھیلانا۔ اور صحیح مسلم کی روایت میں ''قسم کو پورا کرنا'' کی جگہ پر ''راستہ گم پانے والے شخص کی راہنمائی کرنا'' ہے۔[2]

❁ آدمیوں کے واجب حقوق ان کو دلانے میں کوشش کرنا:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

''جو شخص اپنے بھائی کو اس کا حق دلانے میں اس کے ساتھ چلا، اس کے لیے ہر قدم پر صدقہ ہے۔''

❁ تنگ دست کو مہلت دینا:

مسند احمد میں سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دے تو قرض کی مدت پوری ہونے سے پہلے اسے ہر دن کے بدلے میں صدقے کا ثواب ملتا ہے۔ پھر جب قرض کی مدت پوری ہو جائے اور وہ اسے مزید مہلت دے دے تو اسے ہر دن کے بدلے میں دوگنا صدقے کا ثواب ملتا ہے۔''[3]

---

[1] رواه البخاري، كتاب العتق، باب أي الرقاب أفضل، رقم الحديث (2518) ومسلم، كتاب الإيمان، باب كون الإيمان بالله أفضل الأعمال، رقم الحديث: 136 (83)

[2] البخاري، كتاب النكاح، باب حق إجابة الوليمة والدعوة، رقم الحديث (5157) ومسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة، رقم الحديث: 3 (2066)

[3] مسند أحمد (360/5)

جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا:

نبی ﷺ سے جب جانوروں کو پانی پلانے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

''ہر زندہ جگر (جاندار) میں اجر ہے۔''[1]

اور نبی ﷺ نے ایک بدکارہ عورت کے بارے میں خبر دی کہ اس نے ایک کتے کو پانی پلایا جو پیاس کی وجہ سے ہانک رہا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔[2]

فوائدِ حدیث:

1. اللہ کی نعمتوں کا شکرانہ ادا کرنا ضروری امر ہے۔
2. شکر کی دو قسمیں ہیں: واجب، جو شرعی واجبات کو پورا کرنے اور محرمات سے اجتناب کرنے کے ساتھ ہوتا ہے اور مستحب، جو نفلی عبادات کے ساتھ ہوتا ہے۔
3. حدیث میں لوگوں کے مابین صلح کرانے اور ان سے اچھے اخلاق سے پیش آنے کی ترغیب ہے۔
4. ہمیشہ مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔
5. حدیث میں مذکورہ اعمال کا اجر وثواب اتنا ہے جو صدقہ کے اجر وثواب کے برابر ہے، اس آدمی کے لیے جو اس سے عاجز ہو۔
6. مومن جو بھی نیک کام کرے اسے اس پر اجر ملتا ہے، بشرطیکہ اس کی نیت میں اخلاص ہو۔
7. یہ حدیث مومن کو اِس بات کی طرف دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے اخلاق وکردار کو بہتر سے بہتر بنائے اور ہمیشہ اچھی گفتگو کرے۔
8. ایک صدقہ ایسا ہوتا ہے جس کا نفع صدقہ کرنے والے کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پہنچتا ہے اور ایک صدقہ ایسا ہوتا ہے جس کا فائدہ صرف صدقہ کرنے والے ہی کو ہوتا ہے۔

سوالات:

1. صدقہ کی کئی قسمیں ہیں، ایک وہ ہے جس کا نفع صدقہ کرنے والے کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پہنچتا

---

(1) البخاري، كتاب الأدب، باب رحمة الناس بالبهائم، رقم الحديث (6009) ومسلم، كتاب السلام، باب فضل ساقي البهائم، رقم الحديث: 153 (2244)

(2) البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب حدثنا أبو اليمان، رقم الحديث (3466) ومسلم، كتاب السلام، باب فضل ساقي البهائم، رقم الحديث: 154 (2245)

ہے اور ایک وہ ہے جس کا نفع صرف صدقہ کرنے والے ہی کو پہنچتا ہے۔ اِس کی وضاحت کریں اور ہر ایک کی مثالیں ذکر کریں۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ ان دونوں قسم کے صدقات کا اثر ایک فرد اور معاشرے پر کیا ہوتا ہے؟

2 درج ذیل عبارات میں سے جو عبارت حدیث کے مطابق صحیح ہو اس کے سامنے صحیح کا نشان لگائیں:

- ہر مسلمان پر ہر دن صدقہ کرنا لازم ہے۔
- مسلمان کے مال میں معاشرے کا بھی حق ہے۔
- بندے پر اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔
- دعا کرنے کی فضیلت ہے اور اسے ترک کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔
- نبی ﷺ اپنے پیروکاروں سے محبت کرنے والے تھے، چنانچہ آپ ﷺ انھیں دین ودنیا کی نفع بخش چیزوں کی تعلیم دیتے تھے۔

3 اِس حدیث اور درج ذیل قرآنی آیات کے مابین آپ کے نزدیک کیا ربط ہے؟

- ﴿ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ [الملك: ٢٣]
- ﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ ﴾ [السبا: ١٣]
- ﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ١١٤]
- ﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ښ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴾ [الحج: ٢٤]

4 اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ اور اس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کی زندگی خالص اور سچی مودت ومحبت سے بھرپور ہو اور سب مومنوں کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ حدیث سے دلیل پیش کریں جس سے یہ ثابت ہو کہ اسلام اِن معانی کو ثابت کرنے پر حریص ہے۔

5 راستے پر پڑی ہوئی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ایمان کے شعبوں میں سے ہے، اس کی وجہ بیان کریں۔



نیکی اور گناہ کی پہچان میں دل کی رائے

(27) سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ (جو شامی صحابہ میں سے ہیں، سترہ حدیثیں روایت کیں اور ۳۴ھ میں فوت ہوئے) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ»[1]

''نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو آپ کے دل میں کھٹکے اور آپ ناپسند کریں کہ کہیں لوگوں کو اس کی اطلاع نہ ہو جائے۔''

سیدنا وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھنے آئے ہو؟'' تو میں نے کہا: جی ہاں، تو آپ نے فرمایا:

«اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ، اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ، وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتُوْكَ»[2]

''اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے جس پر نفس مطمئن ہو اور اس پر دل کو اطمینان حاصل ہو۔ اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور اس کے بارے میں سینے میں تردد ہو (کہ کروں یا نہ کروں) اگرچہ لوگ تمھیں فتوے دیں (کہ کرلو)''

امام احمد رحمہ اللہ سیدنا ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے ان کا بیان روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے اس چیز کے بارے میں بتائیے جو میرے لیے حلال ہو اور جو میرے لیے حرام ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْبِرُّ مَا سَكَنَتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ، وَالْإِثْمُ مَا لَمْ تَسْكُنْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَلَمْ يَطْمَئِنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ، وَإِنْ أَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ»[3]

---

[1] رواه مسلم، كتاب البر والصلة، باب تفسير البر والإثم، رقم الحديث: 15 (2553)

[2] مسند أحمد (228/4) والدارمي، كتاب البيوع، باب دع ما يريبك، رقم الحديث (2438) وإسناده ضعيف. فيه الزبير أبو عبد السلام ضعيف، وفيه انقطاع أيضا.

[3] مسند أحمد (194/4) بإسناد جيد.

''نیکی وہ ہے جس سے نفس کو سکون اور دل کو اطمینان حاصل ہو اور گناہ وہ ہے جس سے نہ نفس کو سکون ملے اور نہ ہی دل کو اطمینان نصیب ہو، خواہ فتویٰ دینے والے تمھیں کوئی فتویٰ دیں۔''

''البر'' کا معنی:

مذکورہ احادیث میں ''البر'' اور ''الإثم'' کی تشریح کی گئی ہے، چنانچہ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''البر'' کی تفسیر حسنِ خلق سے کی ہے اور سیدنا وابصہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایت میں اس کی تفسیر اس کام سے کی جس سے دل اور نفس کو اطمینان حاصل ہو اور سیدنا ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہی تفسیر حلال کی فرمائی۔

''البر'' کی تفسیر مختلف انداز سے اس لیے فرمائی کہ ''البر'' کا اطلاق دو اعتبارات سے دو معنوں پر ہوتا ہے:

1. مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے کے اعتبار سے اس کا معنی ہے مخلوق سے حسنِ سلوک کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ خاص طور پر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے لیے بر الوالدین کا لفظ استعمال فرمایا اور عام طور پر تمام مخلوق سے حسنِ سلوک کے لیے بھی یہ لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

اور جب ''البر'' کے ساتھ تقویٰ کا بھی ذکر کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:
﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ ﴾ [المائدۃ: ۲] تو ''البر'' سے مراد مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک اور تقویٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا اور اس کی محرمات سے اجتناب کرنا ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''البر'' سے مراد واجبات کو پورا کرنا اور تقویٰ سے مراد محرمات سے اجتناب کرنا ہو۔

2. ''البر'' سے مراد تمام ظاہری و باطنی نیک اعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿ لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۷]

''نیکی صرف اس بات کا نام نہیں کہ تم مشرق و مغرب کی طرف منہ پھیر لو۔ بلکہ ''نیکی'' یہ ہے کہ

جو شخص اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور مال کی محبت کے باوجود اسے خرچ کرے رشتہ داروں پر، یتیموں پر، مسکینوں پر، مسافر پر، مانگنے والوں پر اور غلاموں کو آزاد کرانے میں۔ اور نماز قائم کرے۔ اور زکات ادا کرے۔ اور وہ جب عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کریں۔ اور بد حالی، مصیبت اور جنگ کے دوران صبر کریں۔ یہی لوگ راست باز ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

چنانچہ اس اعتبار سے "البر" میں تمام باطنی نیکیاں، مثلاً: اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانا۔ اور تمام ظاہری نیکیاں، مثلاً: مالوں کو ان چیزوں میں خرچ کرنا جو اللہ کو محبوب ہوں، نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، وعدہ پورا کرنا۔ اللہ کی تقدیروں، مثلاً: مرض اور فقر پر صبر کرنا، اسی طرح نیکیاں مستقل مزاجی سے کرتے رہنا اور دشمنوں سے جنگ کے دروان صبر کرنا وغیرہ سب "البر" میں شامل ہیں۔

اور ہوسکتا ہے کہ سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب اِن تمام نیکیوں کو شامل ہو، کیونکہ حسنِ خلق سے مراد شریعت کے تمام اخلاق کو اختیار کرنا اور اللہ کے ان آداب پر عمل کرنا ہے جن کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی کتاب میں دی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ [القلم: ٤] "اور آپ یقیناً عظیم اخلاق والے ہیں۔"

اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: «كَانَ خُلُقُهُ الْقُرآنَ»[1] "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔"

اور سیدنا وابصہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں "البر" کے بارے میں فرمایا: «مَا اطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ وَاطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ» "جس پر دل مطمئن ہو اور اس پر نفس کو اطمینان حاصل ہو۔" اور ایک روایت میں ہے: «مَا انْشَرَحَ لَهُ الصَّدْرُ»[2] "جس پر انشراحِ صدر حاصل ہو۔"

سیدنا ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں حلال کی تقریباً یہی تفسیر ذکر فرمائی۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حق کی پہچان، اس سے سکون حاصل کرنے اور اسے قبول کرنے پر پیدا کیا ہے اور ان کی طبیعتوں میں اس کی محبت اور اس کے الٹ (باطل) سے نفرت کو رکھ دیا ہے۔ شاید یہ سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل الفاظ میں داخل ہوسکتا ہے:

---

(1) مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب جامع صلاة اللیل، رقم الحدیث: 139 (746)

(2) ذکرہ الھیثمي في مجمع الزوائد (1/175)

« وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ، وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ، وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُشْرِكُوا بِي مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا ...... »[1]

''(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:) اور میں نے اپنے تمام بندوں کو اس حالت میں پیدا کیا کہ وہ سب کے سب مسلمان (اور شرک سے اعراض کرنے والے) تھے، پھر ان کے پاس شیاطین آئے اور انھیں ان کے دین سے دور لے گئے اور انھوں نے ان پر وہ چیز حرام کر دی جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھی۔ اور انھوں نے انھیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ اس چیز کو شریک بنائیں جس کی میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ....۔''

اسی طرح نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

''ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنائیں، یا نصرانی بنائیں یا مجوسی بنائیں، جیسا کہ ایک جانور کامل بچے کو جنم دیتا ہے، کیا تم نے کبھی ایسا بچہ دیکھا ہے جو کان کٹا ہو؟''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اگر تم چاہو تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لو:

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ﴾ [الروم: ۳۰]

''اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہ کرو۔''[2]

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہر ایسے کام کو معروف کا نام دیا ہے جس کا اس نے حکم دیا ہے اور ہر ایسے کام کو منکر کا نام دیا ہے جس سے اس نے منع کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [النحل: ۹۰]

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، برائی اور ظلم سے روکتا ہے۔''

---

[1] مسلم، كتاب الجنة، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة، رقم الحديث: 63 (2865)

[2] البخاري، كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فمات، رقم الحديث (1358) ومسلم، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، رقم الحديث: 22 (2658) واللفظ له.

اور نبی ﷺ کی صفات ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾ [الاعراف: ۱۵۷]

''اور وہ (نبی ﷺ) پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔''

دل کا اطمینان:

اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ مومنوں کے دلوں کو اس کے ذکر کے ساتھ اطمینان حاصل ہوتا ہے، چنانچہ وہ دل جس میں ایمان کا نور داخل ہو چکا ہو اور ایمان کے ساتھ اسے انشراح نصیب ہو چکا ہو، اسے حق کے ساتھ سکون واطمینان ملتا ہے اور وہ اسے قبول کرتا ہے۔ نیز وہ باطل سے نفرت کرتا ہے، اسے ناپسند کرتا ہے اور قبول نہیں کرتا۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ صاحبِ بصیرت مومن پر حق وباطل کے درمیان کوئی التباس نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پاس جو نور ہوتا ہے اس کے ذریعے وہ حق کو پہچان لیتا ہے، پھر اس کا دل اسے قبول کر لیتا ہے اور وہ باطل کو بھی پہچان لیتا اور اس سے نفرت کرتا ہے اور اس کا انکار کرتا ہے۔

حدیثِ وابصہ رضی اللہ عنہ اور اس کے ہم معنی دیگر احادیث اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب کسی امر میں اشتباہ ہو، تب دل کی طرف لوٹنا چاہیے۔ چنانچہ جس بات پر دل کو اطمینان ہو اور انشراحِ صدر ہو تو وہ نیکی اور حلال ہے۔ اور جو اس کے خلاف ہو وہ گناہ اور حرام ہے۔

نبی ﷺ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسا حکم دیتے تھے جس پر انھیں انشراحِ صدر نہ ہوتا، تو وہ اس پر عمل نہ کرتے، چنانچہ آپ ﷺ ناراض ہوجاتے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے حج کو عمرہ میں فسخ کرنے کا حکم دیا تو ان میں سے بعض نے اسے ناپسند کیا۔[1]

اسی طرح آپ ﷺ نے انھیں اپنی قربانیوں کو ذبح کرنے اور حدیبیہ کے عمرہ سے حلال ہونے کا حکم دیا تو انھوں نے اسے ناپسند کیا۔[2]

نیز انھوں نے آپ ﷺ کے قریش کے ساتھ اِس بات پر مذاکرات کو بھی ناپسند کیا کہ آپ ﷺ اس سال واپس لوٹ جائیں اور اہلِ مکہ میں سے جو شخص مسلمانوں کے پاس آئے تو وہ اسے واپس لوٹانے کے پابند ہونگے۔ [الحدیث السابق]

---

① مسلم، كتاب الحج، باب بيان وجوه الإحرام، رقم الحديث: 142 (1216)

② البخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد، رقم الحديث (2731، 2732)

خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں نص وارد ہوئی ہو اس میں مومن کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [الأحزاب: ٣٦]

''اور (دیکھو) کسی مومن مرد وعورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے کسی امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔''

مومن کو چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو برضا ورغبت قبول کرے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو کچھ مشروع کیا ہے اس پر ایمان لانا، اس پر راضی ہونا اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [النساء: ٦٥]

''پس قسم ہے تیرے رب کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس کے تمام اختلافات میں آپ کو حاکم (فیصل) نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ آپ ان میں کر دیں اس سے وہ دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی محسوس نہ کریں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔''

جس امر کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ امت میں سے کسی کا قول مروی ہو کہ جس کی اتباع کی جائے، تو وہ مومن جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، اس کا سینہ علم کے نور اور یقین کے ساتھ بھرا ہوا ہو، پھر اس کے سینے میں کسی شبہہ کی بنا پر کھٹکا پیدا ہو اور اسے کوئی ایسا مفتی نہ ملے جو اسے اس میں رخصت کا فتویٰ دے، سوائے اس شخص کے جس کے علم ودین پر اسے اعتماد نہ ہو اور وہ اتباعِ ھویٰ میں معروف ہو تو ایسی صورتِ حال میں مومن اپنے آپ کی طرف رجوع کرے اور اس چیز پر عمل کرے جس پر اس کا دل مطمئن ہو، خواہ فتویٰ دینے والے کچھ بھی فتویٰ دیں۔ اسی بات کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی صراحتاً بیان کیا ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. ''البر'' کے دو معنی ہیں: مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، نیکیاں سرانجام دینا اور برائیوں سے پرہیز کرنا۔

2 اللہ تعالیٰ نے بندوں کی فطرت میں حق کی پہچان، اس سے سکون حاصل کرنے اور باطل سے نفرت کرنے کو رکھ دیا ہے۔

3 جس امر کے بارے میں نص آگئی ہو اسے قبول کرنا ضروری ہے، خواہ اس پر دل مطمئن نہ بھی ہو، کیونکہ خلل نص میں نہیں، بلکہ دل میں ہے۔

4 نص کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنا واجب ہے۔

سوالات:

1 احادیث میں "البر" کے مختلف معانی ذکر کیے گئے ہیں، آپ ان معانی کو ذکر کریں۔

2 "البر" کے دو معنوں کی وضاحت کریں۔

3 گناہ کا معیار کیا ہے؟

4 مسلمان کو اپنے دل سے کب فتویٰ طلب کرنا چاہیے؟

5 لوگوں کے ساتھ نیکی کیسے ہوگی؟



الوداع کہنے والے کی نصیحت

28 سیدنا ابو نجیح عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں ایسی مؤثر نصیحت کی کہ اس سے دل دہل گئے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ تو ایک شخص نے کہا: لگتا ہے، یہ الوداع کہنے والے شخص کی نصیحت ہے، تو آپ ہمیں کس بات کی وصیت کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ، فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافاً كَثِيراً، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّينَ الرَّاشِدِينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِدِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1]

”میں تمھیں اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا اور (امیر/ خلیفہ کی) بات کو سننے اور اس کی اطاعت کرنے کا تاکیدی حکم دیتا ہوں اگرچہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ میرے بعد تم میں سے جو (لمبے عرصے تک) زندہ رہے گا وہ عنقریب (امت میں) بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ لہٰذا تم میری سنت اور میرے ان خلفاء کی سنت کو لازم پکڑنا جو ہدایت یافتہ اور نیکوکار ہوں گے۔ تم اسے مضبوطی سے تھام لینا اور ہاتھ سے نکلنے نہ دینا اور دین میں نئے نئے کام ایجاد کرنے سے بچنا، کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“

راویِ حدیث:

سیدنا عرباض بن ساریہ السلمی رضی اللہ عنہ نے بہت پہلے اسلام قبول کیا اور صفہ میں آ کر رہے۔ پھر حمص میں رہائش پذیر ہوئے اور ۷۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے چار احادیث روایت کی گئی ہیں۔[2]

[1] أبو داود، کتاب السنة، باب لزوم السنة، رقم الحدیث (4607) والترمذي، کتاب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة، رقم الحدیث (2676) وقال: حدیث حسن صحیح.

[2] الإصابة (412/7)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ «وَعَظَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَوْعِظَةً بَلِيغَةً» ''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مؤثر نصیحت فرمائی۔'' مسند احمد[1]

سنن ابی داود اور سنن ترمذی میں ہے کہ یہ نصیحت فجر کی نماز کے بعد تھی۔ نبی ﷺ خطبۂ جمعہ اور خطبۂ عیدین جیسے ریگولر خطبات کے علاوہ بھی اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا تھا:

﴿وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا﴾ [النساء: ٦٣]

''اور انھیں وہ بات کہیں جو ان کے دلوں میں گھر کرنے والی ہو۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ ٱلْحَسَنَةِ﴾ [النحل: ١٢٥]

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ دعوت دیتے رہیے۔''

لیکن آپ ﷺ انھیں ہر وقت نصیحت نہیں کرتے تھے، بلکہ وقتاً فوقتاً کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیحین میں ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں ہر جمعرات کو نصیحت کرتے تھے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا: اے ابوعبدالرحمن! ہم آپ کی گفتگو کو پسند کرتے ہیں اور ہمیں اس کی طلب رہتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں ہر روز کچھ نہ کچھ بیان کیا کریں۔ تو انھوں نے کہا:

''مجھے ہر دن تمھیں نصیحت کرنے سے کوئی مانع نہیں، سوائے اس کے کہ میں تمھاری اکتاہٹ کو ناپسند کرتا ہوں اور رسولِ اکرم ﷺ بھی ہمیں وقتاً فوقتاً نصیحت کرتے تھے کہ کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔''[2]

نبی کریم ﷺ اپنے خطبات کو لمبا نہیں کرتے تھے، بلکہ انتہائی جامع انداز سے مختصر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، تو آپ کی نماز بھی درمیانی ہوتی اور خطبہ بھی درمیانہ ہوتا۔''[3]

---

[1] مسند أحمد (127,126/4)

[2] البخاري، كتاب العلم، باب ما كان النبي ﷺ يتخولهم بالموعظة، رقم الحديث (68) ومسلم، كتاب المنافقين، باب الاقتصاد في الموعظة، رقم الحديث: 83 (2821)

[3] مسلم، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، رقم الحديث: 41 (866)

سنن ابی داود میں اس کے الفاظ یوں ہیں: رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن وعظ لمبا نہیں کرتے تھے، بلکہ چند کلمات ہی پر اکتفا فرماتے تھے۔[1]

صحیح مسلم میں ابو وائل کا بیان ہے کہ ہمیں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، ان کا خطبہ بڑا مختصر مگر جامع تھا۔ چنانچہ جب وہ منبر سے نیچے آئے تو ہم نے کہا: اے ابوالیقظان! آج تو آپ نے بڑا ہی مختصر مگر جامع خطبہ دیا ہے، کاش کہ آپ ذرا لمبا خطبہ دیتے! انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ، فَأَطِيلُوا الصَّلَاةَ وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ، وَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا »[2]

''بے شک آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور اس کے خطبے کا چھوٹا ہونا اس کے سمجھدار ہونے کی علامت ہے، لہٰذا تم نماز لمبی کیا کرو اور خطبہ چھوٹا، کیونکہ کچھ بیان جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔''

مومنوں کے دل:

''دلوں کا دہل جانا اور آنکھوں سے آنسو بہنا'' یہ دونوں وصف ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢]

''سچے مومن تو وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب اللہ کی آیات انھیں سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰۤی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ﴾ [المائدة: ٨٣]

''اور جو کچھ رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے جب اسے سنتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں اس لیے کہ وہ حق کو پہچان گئے ہیں۔''

---

[1] أبو داود، كتاب الصلاة، باب إقصار الخطب، رقم الحديث (1107)

[2] مسلم، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، رقم الحديث: 47 (869)

اور نبی کریم ﷺ جب وعظ و نصیحت کرتے تھے تو آپ کی حالت تبدیل ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ وَعَلَا صَوْتُهُ وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ حَتّٰى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُولُ: صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ»[1]

''رسول اللہ ﷺ جب خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور جلال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی حتی کہ ایسا لگتا جیسے آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے ہیں، فرما رہے ہیں کہ وہ (لشکر) صبح یا شام (تک) تمھیں آ لے گا۔''

وصیت طلب کرنا:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ کہنا کہ ''لگتا ہے یہ الوداع کہنے والے شخص کی نصیحت ہے، تو آپ ہمیں کس بات کی وصیت کرتے ہیں؟'' یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس نصیحت میں جتنی بلاغت سے کام لیا اتنا کسی اور نصیحت میں نہیں لیا۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے یہ سمجھا کہ جیسے یہ الوداع کہنے والے شخص کی نصیحت ہے، کیونکہ جس قدر الوداع کہنے والا شخص قول وفعل میں پختگی دکھاتا ہے اتنی کوئی نہیں دکھاتا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھنے والے ہر شخص کو حکم دیا کہ وہ نماز ایسے پڑھے جیسے وہ دنیا کو الوداع کہہ کر آخری نماز پڑھ رہا ہے۔[2] کیونکہ جس نمازی کو اِس بات کا شعور ہوتا ہے وہ اسے بہت ہی مکمل طریقے سے ادا کرتا ہے۔

ہو سکتا ہے نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خطبے میں الوداع کی طرف اشارہ کر دیا ہو جیسا کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور فرمایا تھا: «لَا أَدْرِي لَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هٰذَا» ''مجھے نہیں معلوم، شاید میں تمھیں اگلے سال نہ مل سکوں۔''[3]

چنانچہ لوگ اس حج کو حجۃ الوداع کہنے لگے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ کہنا کہ ''ہمیں وصیت کیجیے۔'' اِس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں جامع وصیت فرمائیں جو ہمارے لیے کافی ہو جائے، کیونکہ انھوں نے جب یہ سمجھا کہ یہ الوداع کہنے والے شخص کی وصیت ہے تو

---

[1] مسلم، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، رقم الحديث: 43 (867)

[2] مسند أحمد (412/5)

[3] أخرجه الدارمي في المقدمة، باب الاقتداء بالعلماء، رقم الحديث (229)

انھوں نے ایسی وصیت طلب کی جس کو آپ ﷺ کے بعد مضبوطی سے تھامنا ان کے لیے نفع بخش ثابت ہو اور جو اسے مضبوطی سے تھام لے اسے وہ کافی ہو جائے اور دنیا وآخرت کی سعادت نصیب ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ کی وصیت:

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''میں تمھیں اللہ سے ڈرنے، سننے اور فرمانبرداری کا حکم دیتا ہوں۔'' تو یہ دو کلمات ایسے ہیں جن میں دنیا وآخرت کی سعادت کو جمع کر دیا گیا ہے۔ رہا ''تقویٰ'' تو جو شخص اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے اسے وہ دنیا وآخرت کی سعادت کی گارنٹی دے دیتا ہے۔ یہی وصیت اللہ تعالیٰ نے پہلے لوگوں کو بھی کی اور پچھلے لوگوں کو بھی۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ [النساء:١٣١]

''تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انھیں ہم نے تاکیدی حکم دیا تھا۔ اور تمھارے لیے بھی یہی حکم ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔''

یاد رہے کہ ''تقویٰ'' کی مزید وضاحت اِس سے پہلے حدیث نمبر:١٨ کی شرح میں گزر چکی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کے حکمرانوں کی بات کو سننے اور ان کی فرمانبرداری کرنے کا تعلق ہے تو اس میں دنیا کی سعادت ہے اور اس کے ذریعے بندوں کی معاشی مصلحتیں منظم ہوتی ہیں اور انھیں اپنے دین پر عمل کرنے اور اپنے رب کی فرمانبرداری کرنے میں مدد ملتی ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ حکمرانوں کے متعلق کہتے ہیں:

''وہ ہمارے امور میں سے پانچ امور کے ذمہ دار ہوتے ہیں: جمعہ، جماعت، عید، جہادی محاذ اور حدود اللہ کا نفاذ۔ اللہ کی قسم! دین ان کے بغیر مستقیم نہیں رہ سکتا، خواہ وہ ظالم کیوں نہ ہوں۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے جو اصلاح فرماتا ہے وہ ان کے فساد سے زیادہ ہوتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت وفرمانبرداری ایمان کا حصہ ہے اور ان کی نافرمانی کفر ہے۔''

اسی بات کی وصیت نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی کی تھی۔ جیسا کہ سیدہ ام الحصین الاحمسیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں سنا تھا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللّٰهَ وَإِنْ أُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ مُجَدَّعٌ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا مَا أَقَامَ لَكُمْ كِتَابَ اللّٰهِ»[1]

[1] مسند أحمد: (70/4) والترمذي، كتاب الجهاد، باب ما جاء في طاعة الإمام، رقم الحديث (1706)

''لوگو! اللہ سے ڈرو، اور اگر کان کٹا ہوا حبشی غلام بھی تمھارا حاکم بنا دیا جائے تو اس کی بات مانو اور اس کی اطاعت کرو، جب تک وہ تمھارے لیے کتاب اللہ کو قائم کرے! (یعنی کتاب اللہ کے موافق حکم دے)۔''

غلاموں کی حکمرانی:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد: ''اگرچہ ایک حبشی غلام ہی تمھارا حکمران بن جائے۔'' تو اِس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے متعدد احادیث روایت کی گئی ہیں جن میں آپ ﷺ نے اپنی امت کو آگاہ فرمایا کہ آپ کے بعد ''امت'' پر کوئی حبشی غلام حکمران بن سکتا ہے۔

صحیح بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَإِنِ اسْتُعْمِلَ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيبَةٌ»[1]

''اپنے حاکم کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو اگرچہ کوئی سیاہ فام حبشی ہی تم پر حاکم بنا دیا جائے جس کا سر منقے جیسا ہو۔''

اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ خَلِيلِي وَصَّانِي أَنْ أَسْمَعَ وَأُطِيعَ، وَإِنْ كَانَ عَبْدًا مُجَدَّعَ الْأَطْرَافِ»[2]

''میرے خلیل ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ میں (امیر کی بات) سنوں اور اطاعت کروں، چاہے وہ (امیر) کٹے ہوئے اعضاء والا غلام ہی کیوں نہ ہو۔''

اِس جیسی احادیث اور بھی بہت زیادہ ہیں۔

کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حبشی غلام کا ذکر محض مثال کے طور پر ہی فرمایا، ورنہ ایسے کبھی ہوا نہیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ بَنَى مَسْجِدًا لِلّٰهِ كَمَفْحَصِ قَطَاةٍ أَوْ أَصْغَرَ بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»[3]

''جس نے اللہ کے لیے قطات کے گھونسلے جتنی یا اس سے بھی چھوٹی مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر تیار کرے گا۔''

اِس میں گھونسلے سے مراد چھوٹی مسجد ہے، ورنہ اتنی مسجد نہیں ہوتی۔

---

[1] البخاري، كتاب الأذان، باب إمامة العبد، رقم الحديث (693)

[2] مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء، رقم الحديث: 36 (1837)

[3] ابن ماجه، كتاب المساجد، باب من بنى لله مسجدا، رقم الحديث (738)

پہلی صدی کے بعد اختلاف:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد:

''اور میرے بعد تم میں سے جو (لمبے عرصے تک) زندہ رہے گا وہ عنقریب (امت میں) بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ لہٰذا تم میری سنت اور میرے ان خلفاء کی سنت کو لازم پکڑنا جو ہدایت یافتہ اور نیکوکار ہوں گے۔ تم اسے مضبوطی سے تھام لینا اور ہاتھ سے نکلنے نہ دینا۔''

اِس میں نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد امت میں بہت زیادہ اختلاف واقع ہونے کی خبر دی ہے جو دین کے اصول وفروع دونوں میں ہوگا۔ اور اقوال واعمال اور عقائد سب میں ہوگا۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد آپ ﷺ کے دوسرے ارشاد کے عین مطابق ہے جس میں آپ ﷺ نے خبر دی کہ آپ کی امت ستر سے زیادہ فرقوں میں بٹ جائے گی، ان میں سے ایک جنت میں اور باقی سب فرقے جہنم میں جائیں گے۔ جنت میں جانے والا فرقہ وہ ہوگا جو اس دین پہ چلتا رہے گا جس پر آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چلتے رہے۔[1]

اسی طرح اِس حدیث میں بھی نبی کریم ﷺ نے گروہ بندی اور اختلافات کی حالت میں اپنی سنت اور اپنے بعد خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور ''سنت'' سے مراد راستہ اور طرزِ عمل ہے، جس میں عقائد، اقوال اور افعال سب کے سب شامل ہیں، جن پر نبی ﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین قائم تھے۔ یہ ایک مکمل طرزِ زندگی ہے۔ سلف صالحین ''سنت'' کے لفظ کا اطلاق اسی پر کرتے تھے۔

یاد رہے کہ حکمران کے لیے سمع وطاعت کا ذکر کرنے کے بعد مذکورہ کلام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حکمران کی اطاعت تبھی ہوگی جب اس میں اللہ کی اطاعت ہوگی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ»[2] ''اطاعت صرف اچھے کاموں اور اچھی باتوں میں ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«سَيَلِي أُمُورَكُمْ بَعْدِي رِجَالٌ يُطْفِئُونَ السُّنَّةَ وَيَعْمَلُونَ بِالْبِدْعَةِ وَيُؤَخِّرُونَ

---

[1] أبو داود، كتاب السنة، باب شرح السنة، رقم الحديث (4596)

[2] البخاري، كتاب الأحكام، باب السمع والطاعة للإمام، رقم الحديث (7145) ومسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء، رقم الحديث: 39 (1840)

الصَّلَاةَ عَنْ مَوَاقِيتِهَا، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنْ أَدْرَكْتُهُمْ كَيْفَ أَفْعَلُ؟ قَالَ: تَسْأَلُنِي يَا ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ كَيْفَ تَفْعَلُ؟ لَا طَاعَةَ لِمَنْ عَصَى اللّٰهَ» [1]

''میرے بعد کچھ ایسے لوگ بھی تمھارے معاملات کے نگران (اور تمھارے حکمران) ہوں گے جو سنت کی روشنی بجھائیں گے، بدعت پر عمل پیرا ہوں گے اور نماز کو (افضل) وقت سے دیر کر کے پڑھیں گے۔ میں نے کہا: اللہ کے رسول! اگر میں انھیں پاؤں تو کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے امِ عبد کے بیٹے! مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا کرو گے؟ جو شخص اللہ کی نافرمانی کرے اس کی اطاعت نہیں۔''

خلفائے راشدین کی سنت:

نبی کریم ﷺ نے عموماً تمام حکمرانوں کے لیے سمع وطاعت کا حکم دینے کے بعد اپنی اور اپنے خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع کا جو حکم دیا اس میں اِس بات کی دلیل ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع بھی ویسے ہی کی جائے گی جیسا کہ آپ ﷺ کی سنت کی اتباع کی جائے گی، لیکن حکمرانوں کی اطاعت مشروط ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ۔

خلفائے راشدین سے مراد ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ حدیثِ سفینہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ سَنَةً ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ» [2]

''میری امت میں تیس سال تک خلافت رہے گی، پھر اس کے بعد ملوکیت آ جائے گی۔''

اِس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور اس کو خلفائے راشدین کی خلافت پر دلیل بنایا ہے۔ اِس کے علاوہ بہت سارے ائمہ نے صراحتاً کہا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی خلیفۂ راشد تھے۔ اِس پر سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث دلیل ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِيكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ فِيكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَاضًّا فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا

[1] ابن ماجه، كتاب الجهاد، باب لا طاعة في معصية الله، رقم الحديث (2865)

[2] مسند أحمد (220/5) والترمذي، كتاب الفتن، باب ما جاء في الخلافة، رقم الحديث (2226)

إِذَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكاً جَبْرِيًّا، فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، ثُمَّ سَكَتَ» [1]

''اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ عرصہ تک نبوت قائم رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے اسے اٹھالیں گے۔ نبوت کے بعد اس کے منہج پر اللہ کی مرضی کے مطابق کچھ عرصہ تک خلافت ہوگی، پھر اللہ تعالیٰ اسے ختم کر دیں گے، پھر اللہ کے فیصلے کے مطابق کچھ عرصہ تک بادشاہت ہوگی، جس میں ظلم و زیادتی ہوگی، بالآخر وہ بھی ختم ہو جائے گی، پھر جبری بادشاہت ہوگی، وہ کچھ عرصہ کے بعد زوال پذیر ہو جائے گی، اس کے بعد منہجِ نبوت پر پھر خلافت ہوگی، پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔''

جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلافت سنبھالی تو ان کے پاس ایک آدمی گیا اور انھیں یہ حدیث سنائی تو وہ اسے سن کر بہت خوش ہوئے۔

محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے بعض اوقات کچھ مشروبات کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتے: اس مشروب سے ہدایت کے امام عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے منع کیا ہے۔

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ خلفائے اربعہ کا کسی مسئلے پر اتفاق اجماع تصور کیا جائے گا یا جب دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے ان کی رائے سے مختلف ہو تو کیا ان کا اتفاق حجت ہوگا یا نہیں؟ اِس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایات منقول ہیں۔ ابو حازم الحنفی نے ''معتضد'' کے دورِ خلافت میں ذوالارحام کی وراثت کا فیصلہ کیا تھا اور خلفائے اربعہ کے مخالفین کی رائے کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ پھر ان کا فیصلہ پوری مملکت میں نافذ کر دیا گیا۔

اگر کسی مسئلہ میں خلفائے اربعہ میں سے کسی کا ایک قول ہو اور ان میں سے کسی نے اس قول سے اختلاف نہ کیا ہو، لیکن کسی اور صحابی نے اختلاف کیا ہو تو کیا اس خلیفہ راشد کا قول دوسرے اقوال پر مقدم ہوگا؟ اِس میں بھی علماء کے دو قول ہیں۔ جبکہ امام احمد رحمہ اللہ نے نصاً کہا ہے کہ ان کا قول دیگر صحابہ کے اقوال پر مقدم ہوگا۔ اسی طرح خطابی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے، بلکہ سلف صالحین میں سے اکثر کا کلام اسی پر دلالت کرتا ہے۔ خصوصاً سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد مختلف طرق سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] مسند أحمد: (273/4)، رقم الحديث (18596)

«إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ»[1]

''اللہ تعالیٰ نے عمر رضی اللہ عنہ کی زبان و دل پر حق کو جاری فرما دیا ہے۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے۔ اسی طرح سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی انہی کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے اور کہتے تھے: عمر رضی اللہ عنہ یقینی طور پر معاملہ فہم اور درست فیصلہ کرنے والے تھے۔

یاد رہے کہ ان خلفائے اربعہ کے بارے میں حدیث میں دو وصف ذکر کیے گئے ہیں:

پہلا وصف: «اَلرَّاشِدِيْنَ» یعنی انھوں نے حق کو پہچانا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا، کیونکہ لفظ راشد غاوی کے الٹ ہے اور اس کا معنی ہے: جس نے حق کو پہچانا، لیکن عمل اس کے خلاف کیا۔ اور دوسرا وصف: «اَلْمَهْدِيِّيْنَ» یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں حق کے لیے ہدایت دی اور حق پر قائم رکھا اور انھیں اس سے بھٹکنے نہیں دیا۔

یہ گویا کہ تین اقسام ہوگئیں: راشد، غاوی اور ضال۔ ''راشد'' وہ ہوتا ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کی پیروی بھی کی۔ ''غاوی'' وہ ہوتا ہے جس نے حق کو پہچانا، لیکن اس کی پیروی نہیں کی۔ اور ''ضال'' وہ ہوتا ہے جس نے حق کو سرے سے پہچانا ہی نہیں۔ یوں ہر راشد ہدایت یافتہ ہے اور ہر ہدایت یافتہ (جو مکمل طور پر ہدایت یافتہ ہو) راشد کہلاتا ہے، کیونکہ ہدایت حق کی معرفت اور اس پر عمل کرنے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔

دین میں نئے کام ایجاد کرنا بدعت ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''دین میں نئے نئے کام ایجاد کرنے سے بچنا، کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' اِس میں امت کو دین میں نئے نئے کام ایجاد کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ایجاد شدہ امور کی اتباع سے ڈرایا گیا ہے اور ہر بدعت کو گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ ''بدعت'' سے مراد دین میں ایجاد کیا گیا ہر وہ نیا کام ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل اور دلیل نہ ہو۔ جس کام کی اصل اور دلیل شریعت میں موجود ہو اسے شرعی طور پر بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے میں یوں ارشاد فرماتے تھے:

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[2]

---

[1] مسند أحمد (95/2) والترمذي، كتاب المناقب، باب في مناقب عمر بن الخطاب رضي الله عنه، رقم الحديث (3682)

[2] مسلم، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة، رقم الحديث: 43 (867)

''حمد وصلاۃ (کے بعد)، بلاشبہ بہترین حدیث (کلام) اللہ کی کتاب ہے اور زندگی کا بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقۂ زندگی ہے اور (دین میں) بدترین کام وہ ہیں جو خود ایجاد کیے گئے ہوں اور ہر ایجاد کیا ہوا کام گمراہی ہے۔''

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' جامع کلمات میں سے ہے، اِس سے دین میں ایجاد کیا ہوا کوئی بھی کام خارج نہیں۔ اور یہ اصولِ دین میں سے ایک عظیم ''اصول'' ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ ﷺ کا دوسرا فرمان ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ، فَهُوَ رَدٌّ» ①

''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسا عمل ایجاد کیا جو اس میں نہیں تھا تو وہ مردود ہے۔''

لہٰذا ہر وہ شخص جس نے کسی عمل کو ایجاد کر کے اسے دین کی طرف منسوب کر دیا اور دین میں اس کی کوئی اصل بھی نہیں تھی تو وہ گمراہی ہے اور دین اس سے بری ہے، خواہ وہ اعتقادی مسائل میں ہو یا ظاہری و باطنی اقوال و اعمال میں ہو۔

جہاں تک کسی نئے کام کا استحسان کلامِ سلف میں وارد ہوا ہے تو اس سے مراد لغوی اعتبار سے نیا کام بدعت ہے نہ کہ شرعی اعتبار سے، جیسا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کو قیامِ رمضان میں ایک امام کے پیچھے جمع کیا، پھر لوگوں کو اسی طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هَذِهِ" ''یہ اچھی بدعت ہے۔'' تو اِس سے مراد یہ ہے کہ یہ نماز اب سے قبل اِس طرح نہیں تھی، لیکن شریعت میں اس کی اصل موجود تھی جس کی طرف رجوع کیا جا سکتا تھا۔ اصل کیا تھی؟ وہ یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کو قیامِ رمضان کی ترغیب دیتے تھے۔ اور لوگ آپ کے زمانے میں مسجد میں متفرق ٹولیوں کی شکل میں یا الگ الگ نماز پڑھا کرتے تھے۔ خود نبی ﷺ نے بھی اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کئی راتیں یہ نماز باجماعت پڑھائی تھی۔ پھر اسے اِس لیے ترک کر دیا کہ کہیں یہ نماز ان پر فرض نہ کر دی جائے، اور وہ اس سے عاجز آ جائیں۔ ②

لیکن نبی ﷺ کی وفات کے بعد اس کی فرضیت کا خوف ختم ہو گیا۔

① أخرجه البخاري، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور، رقم الحديث (2697) ومسلم، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطل، رقم الحديث: 18 (1718)

② أخرجه البخاري، كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، رقم الحديث (2008) ومسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان، رقم الحديث: 178-177 (761)

اسی طرح آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے آخری عشرے کی بعض طاق راتوں میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیام کی نماز باجماعت پڑھائی۔[1]

اِس کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع کا حکم بھی دیا ہے۔ تو قیامِ رمضان کے حوالے سے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا حکم بھی سنتِ خلفائے راشدین میں شامل ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں، پھر ان کے بعد عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا۔

اسی طرح جمعہ کی پہلی اذان کا مسئلہ ہے، جس کی ابتدا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کی ضرورت کے پیشِ نظر کی گئی۔ پھر ان کے بعد اسے علی رضی اللہ عنہ نے بھی برقرار رکھا اور اس پر مسلمانوں کا عمل جاری رہا۔

اسی میں قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کرنا بھی شامل ہے۔ جس کے بارے میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے پہلے توقف کیا تھا اور انھوں نے ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما سے کہا تھا: آپ وہ کام کیسے کر سکتے ہیں جو نبی ﷺ نے نہیں کیا؟ پھر جب انھیں یقین ہوا کہ اس میں مصلحت ہے تو انھوں نے اس پر موافقت کر دی۔ جبکہ نبی کریم ﷺ وحی کی کتابت کا حکم دیا کرتے تھے۔ تو اِس میں کوئی فرق نہیں کہ اسے الگ الگ چیزوں پر لکھا جاتا یا ایک ہی مصحف میں، بلکہ اسے جمع کر کے ایک ہی مصحف میں لکھ دینا زیادہ مناسب تھا۔

اسی طرح حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا پوری امت کو ایک ہی مصحف پر جمع کرنا اور باقی تمام مصاحف کو امت میں تفرقہ کے اندیشے کے پیشِ نظر ختم کرنا بھی سنتِ خلفائے راشدین میں شامل ہے۔ ان کے اِس اقدام کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سراہا اور یہ مصلحت کے عین مطابق تھا۔

تاہم یہاں پر ایک بات انتہائی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حالیہ دور اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے دور کے درمیان چونکہ صدیوں کا فاصلہ آ گیا ہے، اس لیے جو کچھ ان سے نقل کیا جاتا ہے اس کے بارے میں تحقیق کرنا ضروری امر ہے، تاکہ جو کچھ ان کے زمانے میں واقعتاً موجود تھا اس میں اور جس جس چیز کو بعد میں ایجاد کیا گیا ہے اس میں فرق کیا جا سکے۔ اِس سے سنت اور بدعت کی پہچان بھی ہو سکے گی۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ انھوں نے کہا: آج تم فطرت پر قائم ہو، لیکن کچھ عرصہ بعد دین میں نئی نئی چیزیں ایجاد کی جائیں گی۔ لہٰذا جب تم ایسی چیزوں کو دیکھو تو ان سے اجتناب کرتے

[1] أخرجه الترمذي، كتاب الصوم، باب ما جاء في قيام رمضان، رقم الحديث (806) وأبو داود، كتاب الصلاة، باب في قيام شهر رمضان، رقم الحديث (1376)

ہوئے تم سب (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے) پرانے طرزِ عمل کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بات خلفائے راشدین کے دور میں کہی تھی۔

ابن مہدی رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: یہ بدعات نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیق، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں نہیں تھیں جو آج ایجاد کر لی گئی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ ان بدعات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو خوارج، روافض اور مرجئہ وغیرہ جیسے باطل فرقوں کی جانب سے دین کے بنیادی اصولوں کے بارے میں ایجاد کر لی گئی تھیں اور ان کے نتیجے میں امت میں تفرقہ اور گروہ بندی وجود میں آ گئی تھی۔ جیسا کہ مسلمانوں کو کافر کہنا، ان کا خون بہانا (قتل کرنا) درست قرار دینا، ان کے مالوں کو لوٹنا جائز سمجھنا، ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے، یا ان میں سے بعض لوگوں کو فاسق وفاجر قرار دینا.......... یا اِس کے برعکس یہ عقیدہ رکھنا کہ گناہوں سے گناہ کرنے والوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا اور اہلِ توحید میں سے کوئی شخص جہنم میں داخل نہیں ہوگا .... بلکہ اِس سے بھی سنگین یہ کہ بعض لوگوں نے اللہ کے افعال کے بارے میں کلام کیا، اللہ کی قضا وقدر کا انکار کر دیا اور دعویٰ یہ کیا کہ وہ تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو ظلم سے پاک قرار دے رہے ہیں! بلکہ اِس سے بھی زیادہ سنگین یہ کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے بارے میں وہ کلام کیا جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے سکوت اختیار کیا تھا۔ اسی طرح جن چیزوں کو صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں ایجاد کیا گیا ان میں یہ بھی شامل ہے کہ کئی لوگوں نے بغیر علم کے حلال وحرام میں کلام کیا اور ان احادیث کا انکار کر دیا جو ان کی آراء اور عقلی قیاسات کے خلاف تھیں۔ نیز ذوق اور کشف کی بنا پر حقیقتِ دین کے بارے میں کلام کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ حقیقت شریعت کے خلاف ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی محبت ہو تو صرف اس کی معرفت کافی ہے، اعمال کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ تصور کرنا کہ شریعت دنیاوی ترقی میں رکاوٹ ہے، یا یہ کہنا کہ شریعت کی بس عوام کو ضرورت ہے خاص لوگوں کو ضرورت نہیں۔ یہ تمام بدعات ہیں جنھیں بعد میں ایجاد کیا گیا۔

فوائدِ حدیث:

1. اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا لازم ہے اور اس سے مراد ہے: شرعی اوامر پر عمل کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا۔
2. حکمران جب تک اللہ کی اطاعت کا حکم دیتے رہیں تب تک ان کی فرمانبرداری کرنا لازم ہے۔ اِس سلسلے میں ان کی شکل وصورت کو نہیں دیکھا جائے گا۔

3 نبی کریم ﷺ کے معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے بعض غیبی امور کے متعلق پیشین گوئی فرمائی۔ وہ امور بالکل ویسے ہی واقع ہوئے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی۔

4 خلفائے راشدین سے مراد ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں، ان کے جو احکام صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں ان پر عمل کرنا دوسرے لوگوں کی پیروی کرنے سے بہتر ہے۔

5 بدعت کی مذمت صرف اس لیے نہیں کی گئی کہ وہ دین میں ایجاد کیا ہوا ایک نیا کام ہے، بلکہ اس لیے بھی کی گئی ہے کہ اس میں دین کی مخالفت ہوتی ہے اور وہ اس کے قواعد سے ٹکرانے والی چیز ہوتی ہے۔

سوالات:

1 حدیث کے الفاظ: «كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ» کا معنی ذکر کریں۔

2 اس حدیث کے فہم کی روشنی میں بتائیں:

- اس میں نبی کریم ﷺ نے کس کس بات کی وصیت فرمائی؟
- آپ ﷺ نے کس کی سنت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا اور کس بات سے ڈرایا؟
- مسلمانوں کے حکمرانوں کی اطاعت کس صورت میں ہوگی؟
- سنت سے مراد کیا ہے اور اس کے مقابلے میں کون سی چیز ہوتی ہے؟

3 بدعت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ذکر کریں۔

4 خلفائے راشدین کون ہیں اور نبی کریم ﷺ نے ان کی سنت کی اتباع کا حکم کیوں دیا؟

5 حدیث کے الفاظ: «عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ» سے کیا مراد ہے؟

6 سلف صالحین کا بدعت کے بارے میں کیا موقف تھا؟



خیر کے دروازے

(29) سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھا، ایک دن صبح کے وقت میں آپ ﷺ سے قریب ہوا، ہم سب چل رہے تھے، میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور رکھے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَقَدْ سَأَلْتَنِي عَنْ عَظِيمٍ وَإِنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ: تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ »، ثُمَّ قَالَ: « أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ » قَالَ ثُمَّ تَلَا: ﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ حَتَّى بَلَغَ ﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [السجدة: ١٦ـ ١٧]، ثُمَّ قَالَ: « أَلَا أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ كُلِّهِ وَعَمُودِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ؟ » قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: « رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ »، ثُمَّ قَالَ: « أَلَا أُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهِ؟ » قُلْتُ بَلَى يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ، قَالَ: « كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا »، فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُونَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ فَقَالَ: « ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ أَوْ عَلَى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ »[1]

”تم نے ایک بہت بڑی بات پوچھی ہے اور بے شک یہ عمل اس شخص کے لیے آسان ہے جس کے لیے اللہ آسان کر دے۔ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکات دو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔“

[1] أخرجه الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم الحديث (2616) وابن ماجه، كتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتنة، رقم الحديث (3973) ومسند أحمد (231/5)

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں بھلائی کے دروازے (راستے) نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہ کو ایسے بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ اور آدھی رات کے وقت آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا۔''

پھر آپ ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائی:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [السجدة: ١٦-١٧]

آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''کیا میں تمھیں دین کی اصل، اس کا ستون اور اس کی چوٹی نہ بتا دوں؟'' میں نے کہا: کیوں نہیں، اللہ کے رسول (ضرور بتائیے) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''دین کی اصل اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں ان تمام باتوں کا جس چیز پر دارومدار ہے وہ نہ بتا دوں؟'' میں نے کہا: ہاں، اللہ کے نبی! پھر آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا:

''اسے اپنے قابو میں رکھو۔''

میں نے کہا: اللہ کے نبی! کیا ہم جو کچھ بولتے ہیں اس پر پکڑے جائیں گے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

''معاذ! تمھاری ماں تم پر روئے، لوگ اپنی زبانوں کے بڑ بڑ ہی کی وجہ سے تو اوندھے منہ یا نتھنوں کے بل جہنم میں ڈالے جائیں گے۔''

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا بلیغ سوال:

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ مجھے ایسے عمل کے بارے میں بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم سے دور کر دے، تو یہ سوال بہت ہی بلاغت والا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ سے ایک ایسی بات پوچھنا چاہتا ہوں جس نے مجھے بیمار کر دیا ہے، جس نے مجھے کمزور کر دیا ہے اور جس نے مجھے غمزدہ کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم جو چاہو پوچھو۔'' تو انھوں نے کہا: مجھے ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور اس کے بارے میں مجھے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔[1]

[1] مسند أحمد (245/5)

یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ اعمالِ صالحہ کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ نیز اِس حدیث میں اِس بات کی بھی دلیل ہے کہ اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الزخرف: ٧٢]

''اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے نیک اعمال کے سبب وارث بنائے گئے ہو۔''

رہا نبی ﷺ کا وہ فرمان جس میں ہے:

«سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا، وَاعْلَمُوْا أَنْ لَنْ يُدْخِلَ أَحَدَكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ»①

''درستی کا قصد کرو، افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرو اور یقین کرو کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔''

تو اِس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص صرف اپنے عمل کی وجہ سے جنت کا مستحق نہیں ٹھہرے گا، بلکہ وہ اللہ کے فضل وکرم کا بھی محتاج ہوگا اور عمل کو جنت میں داخلے کا سبب بھی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے فضل سے بنا دیا ہے۔ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو ایسا ممکن نہ ہوتا۔ گویا جنت بھی اور اس میں داخلے کے اسباب بھی سب اللہ کے فضل کا نتیجہ ہے۔

نبی ﷺ کا یہ فرمان کہ ''تم نے ایک بہت بڑی بات پوچھی ہے۔'' یہ اس لیے کہ جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے نجات حاصل کرنا بہت ہی عظیم امر ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کیں اور رسول مبعوث فرمائے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا:

«مَا تَقُوْلُ فِي الصَّلَاةِ؟» قَالَ: أَتَشَهَّدُ، ثُمَّ أَسْأَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ، وَأَعُوْذُ بِهِ مِنَ النَّارِ، مَا وَاللّٰهِ مَا أُحْسِنُ دَنْدَنَتَكَ، وَلَا دَنْدَنَةَ مُعَاذٍ، فَقَالَ: «حَوْلَهَا نُدَنْدِنُ»②

''تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟'' اس نے کہا: میں تشہد پڑھتا ہوں، پھر اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم سے اس کی پناہ مانگتا ہوں۔ قسم ہے اللہ کی! مجھے وہ دعائیں تو آتی نہیں جو آپ

---

① أخرجه البخاري، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة في العمل، رقم الحديث (6464) ومسلم، كتاب صفات المنافقين، باب لن يدخل الجنة أحد بعمله، رقم الحديث: 75 (2816)

② أخرجه أحمد (474/3)، وابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما يقال في التشهد والصلاة على النبي ﷺ، رقم الحديث (910) وفي كتاب الدعاء، باب الجوامع من الدعاء، رقم الحديث (3847) وأبو داود، كتاب الصلاة، باب في تخفيف الصلاة، رقم الحديث (792)

آہستہ آہستہ پڑھتے رہتے ہیں یا جو معاذ رضی اللہ عنہ گنگناتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم بھی یہی کچھ گنگناتے ہیں۔''

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''بے شک یہ عمل اس شخص کے لیے آسان ہے جس کے لیے اللہ آسان کر دے۔'' تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توفیق تو پوری کی پوری اللہ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا جس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ ہدایت کو آسان کر دے تو وہ ہدایت پا جاتا ہے اور جس کے لیے آسان نہ کرے وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴾ [اللیل: ۵۔۱۰]

''رہا وہ شخص جو (اللہ کی راہ میں) مال دے اور تقویٰ اختیار کرے اور بھلی بات کی تصدیق کرے تو ہم اسے آسان راہ پر چلنے کی سہولت دیں گے اور جو شخص کنجوسی کرے اور بے پروا بنا رہے اور بھلائی کو جھٹلائے، تو ہم اسے تنگی کی راہ پر چلنے کی سہولت دیں گے۔''

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ، أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ السَّعَادَةِ، وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاءِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى .... ﴾ [اللیل: ۵۔۱۰] الآية»[1]

''تم عمل کرتے رہو کیونکہ ہر شخص کو ان اعمال کی توفیق دی جاتی ہے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، جو شخص نیک ہوگا اسے نیکوں کے عمل کی توفیق ملی ہوتی ہے اور جو بدبخت ہوگا، اسے بدبختوں کے عمل کی توفیق ملی ہوتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھیں:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى .... ﴾ [اللیل: ۵۔۱۰]

''جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا، پھر اچھی بات کی تصدیق کی ....''

نوافل کی فضیلت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''کیا میں تمھیں بھلائی کے دروازے (راستے) نہ بتاؤں؟'' جب

[1] أخرجه البخاري، كتاب التفسير، سورة الليل-باب ﴿ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴾ رقم الحديث (4949) ومسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي، رقم الحديث: 6(2647)

آپ ﷺ نے دخولِ جنت کے لیے واجباتِ دین کو ضروری قرار دیا تو اس کے بعد آپ ﷺ نے سائل کو خیر کے دروازوں کے بارے میں آگاہ کرنا مناسب سمجھا اور خیر کے دروازوں سے مراد نوافل ہیں اور اللہ کے اولیاء فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا مزید تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

1- روزہ ڈھال ہے:

نبی ﷺ کا فرمان: ''روزہ ڈھال ہے۔'' مختلف الفاظ کے ساتھ ثابت ہے، چنانچہ مسند احمد اور سنن نسائی میں سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق یہ الفاظ ہیں:

«اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ مَا لَمْ يَخْرِقْهَا»[1]

''روزہ ڈھال ہے جب تک وہ (روزہ دار) اسے پھاڑ نہ دے۔''

جب تک اسے پھاڑ نہ دے، یعنی بری باتوں کے ساتھ، جبکہ بعض سلف کا کہنا ہے کہ غیبت روزے کو پھاڑتی ہے اور استغفار اس کی پیوند کاری کرتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس کی استطاعت رکھتا ہو کہ اس کا روزہ پھٹا ہوا نہ ہو تو وہ ایسا ضرور کرے۔ کیونکہ ڈھال وہ ہوتی ہے جس کو پہن کر انسان جنگ میں اپنے آپ کو دشمن کے واروں سے بچاتا ہے۔ اسی طرح روزہ بھی ڈھال بن کر دنیا میں انسان کو برائیوں سے بچاتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ [البقرة: ١٨٣]

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے تاکہ تم بچ سکو۔''

لہٰذا جس شخص کے لیے اس کا روزہ دنیا میں برائیوں سے ڈھال بن جاتا ہے اس کا روزہ آخرت میں اس کے لیے جہنم سے ڈھال بن جائے گا اور جس کا روزہ دنیا میں اس کے لیے برائیوں سے ڈھال نہیں بنتا، اس کا روزہ آخرت میں اس کے لیے جہنم سے ڈھال نہیں بنے گا۔

---

[1] مسند أحمد (195/1) والنسائي، كتاب الصيام، باب ذكر الاختلاف على محمد بن أبي يعقوب، رقم الحديث (2232) والدارمي، كتاب الصوم، باب الصائم يغتاب فيخرق صومه، رقم الحديث (1683)

2- صدقہ برائیوں کی آگ کو بجھاتا ہے:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد: ''صدقہ گناہ کو ایسے بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔''
آپ ﷺ سے کچھ دوسری روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«يَا كَعْبَ بْنَ عُجْرَةَ! اَلصَّلَاةُ بُرْهَانٌ وَالصَّوْمُ جُنَّةٌ حَصِينَةٌ وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ» [1]

''اے کعب بن عجرہ! نماز دلیل ہے، روزہ مضبوط ڈھال ہے، صدقہ گناہوں کو بجھا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔''

علی بن الحسین رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ رات کے اندھیرے میں اپنی پشت پر روٹیاں اٹھا کر مساکین کو پہنچاتے تھے اور کہتے تھے: رات کی تاریکی میں صدقہ رب کے غضب کو بجھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۚ ﴾ [البقرة: ٢٧١]

''اگر تم صدقہ خیرات کو ظاہر کرو تو وہ بھی اچھا ہے۔ اور اگر تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہوں کو مٹا دے گا۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ صدقے کے ذریعے گناہ مٹ جاتے ہیں، یا تو مطلقاً ہر قسم کے صدقے سے، یا پھر چھپ کر صدقہ کرنے سے۔

3- آدھی رات میں نماز پڑھنا:

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی: ''اور آدھی رات کے وقت آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا۔'' یعنی یہ عمل بھی گناہ کو ایسے ہی بجھا دیتا ہے جیسے صدقہ بجھاتا ہے۔ اِس کی ایک اور دلیل مسند احمد میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنگِ تبوک سے واپس آ رہے تھے......

[1] مسند أحمد (321/3) بدون قوله: "كما يطفئ ..." وهو عند الترمذي بتمامه في كتاب الجمعة، باب ما ذكر في فضل الصلاة، رقم الحديث (614)

اسی قصہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''روزہ ڈھال ہے اور صدقہ کرنا اور آدھی رات میں بندے کا قیام کرنا گناہوں کو مٹاتا ہے۔''[1]

نیز صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللهِ الْمُحَرَّمِ، وَأَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ صَلَاةُ اللَّيْلِ»[2]

''رمضان کے بعد سب سے افضل روزے اللہ کے مہینے ''محرم'' کے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔''

اِس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ لوگ دن کے وقت گناہوں کی آگ میں جلتے ہیں، اور وہ جونہی فرض نمازوں میں سے کسی نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ اپنے گناہوں کی آگ کو بجھاتے ہیں۔ اسی طرح نماز تہجد بھی گناہوں کو مٹاتی ہے، کیونکہ وہ نفل نمازوں میں سب سے افضل نماز ہے۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رات کی نماز کو دن کی نماز پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جیسے خفیہ صدقے کو اعلانیہ صدقے پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ خفیہ صدقہ رب تعالیٰ کے غضب کو بجھاتا ہے، اسی طرح رات کی نماز بھی ہے۔ آپ ﷺ نے اِن آیتوں کو پڑھا:

﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [السجدة: ١٦-١٧]

''رات میں ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، اپنے رب کو اس کے عذاب کے ڈر سے اور اس کی جنت کی لالچ میں پکارتے ہیں۔ اور ہم نے انھیں جو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے نیک اعمال کے بدلے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی کون سی نعمتیں چھپا کر رکھی گئی ہیں۔''

یعنی نبی کریم ﷺ نے رات کی نفل نماز کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اِن آیات کی تلاوت فرمائی۔

جب کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت نمازِ عشاء کے انتظار کی فضیلت میں نازل ہوئی۔[3]

---

[1] مسند أحمد (237/5)

[2] أخرجه مسلم، كتاب الصيام، باب فضل صوم المحرم، رقم الحديث: 202 (1163)

[3] أخرجه الترمذي، كتاب التفسير، باب من سورة السجدة، رقم الحديث (3196)

اسی طرح ان سے اسی آیت کے حوالے سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے کہا: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مغرب اور عشاء کے درمیان نفل نماز پڑھتے تھے۔[1]

یہ تمام روایات آیت کے عموم میں شامل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جن کے پہلو اللہ سے دعا مانگنے کے لیے بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ لہٰذا اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جو رات کے وقت نیند کو چھوڑ کر اللہ کے ذکر اور دعا میں مشغول ہو جائے۔ اس میں وہ بھی شامل ہے جو مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھے۔ نیز وہ بھی شامل ہے جو نمازِ عشاء کے انتظار میں بیٹھا رہا اور اس وقت تک سویا نہیں جب تک نماز نہیں پڑھ لی۔ خاص طور پر جب اس کے سونے کی ضرورت تھی اور وہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے فرض نماز کی خاطر جاگتا رہا۔ نبی کریم ﷺ نے ان صحابہ کرام سے کہا تھا جو عشاء کے انتظار میں بیٹھے رہے:

«إِنَّكُمْ لَنْ تَزَالُوا فِي صَلَاةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلَاةَ»[2]

''تم برابر نماز میں رہے، کیونکہ تم نماز کا انتظار کر رہے تھے۔''

اسی طرح اس میں وہ شخص بھی شامل ہے جو سو جائے، پھر نیند سے بیدار ہو کر تہجد کی نماز پڑھے۔ بلکہ یہ نفل نمازوں کی سب سے افضل قسم ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ شخص بھی شامل ہو جو نیند کو ترک کر کے فجر کی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور نماز ادا کرے۔ خاص طور پر جب اس پر نیند غالب آ رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فجر کی اذان میں مؤذن کو «اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ» کہنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کا معنی ہے: ''نماز نیند سے بہتر ہے۔''

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی: ''اور آدھی رات کے وقت آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا۔'' اس میں آپ ﷺ نے نمازِ تہجد کا سب سے افضل وقت ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے: آدھی رات۔ کیونکہ ''جوف'' سے مراد رات کا درمیانہ وقت ہے۔ اور اگر ''جوف اللیل الآخر'' کہا جائے تو اس سے مراد رات کے دوسرے نصف کا درمیانہ وقت ہے، جو کہ مجموعی طور پر رات کا چھٹا حصہ بنتا ہے اور اسی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا آسمانِ دنیا پر نزول ہوتا ہے۔

---

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الصلاة، باب وقت قيام النبي ﷺ، رقم الحديث (1321)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الأذان، باب يستقبل الإمام الناس إذا سلم، رقم الحديث (847)

توحید، نماز اور جہاد:

آپ ﷺ کا ارشاد: ''کیا میں تمھیں دین کی اصل، اس کا ستون اور اس کی چوٹی نہ بتا دوں؟'' اِس میں نبی ﷺ تین چیزوں کے بارے میں آگاہ فرما رہے ہیں:

1. « رَأْسُ الْأَمْرِ » یعنی دین کی جڑ، جس کے ساتھ آپ ﷺ کو بھیجا گیا اور وہ ہے: اسلام۔ دوسری روایت میں اس کی تفسیر شہادتین کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ لہٰذا جو شخص شہادتین کا ظاہری اور باطنی طور پر اقرار نہیں کرے گا اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔
2. « عُمُوْدُہٗ » دین کا ستون، جس پر دین کی عمارت قائم ہے اور وہ ہے: نماز۔
3. « ذِرْوَۃُ سَنَامِہٖ » دین کی چوٹی جہاد ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرائض کے بعد جہاد افضل ترین عمل ہے۔ جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا موقف ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِیْمَانٌ بِاللّٰہِ، وَجِھَادٌ فِيْ سَبِیْلِہٖ »[1] ''اللہ پر ایمان لانا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔''

اسی طرح صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: « إِیْمَانٌ بِاللّٰہِ » قَالَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: « اَلْجِھَادُ فِيْ سَبِیْلِ اللّٰہِ » قَالَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: « حَجٌّ مَبْرُوْرٌ » وَفِيْ رِوَایَۃِ مُحَمَّدِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ: « إِیْمَانٌ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ »[2]

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ عزوجل پر ایمان لانا۔'' پوچھا گیا: پھر اس کے بعد کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔'' پوچھا گیا: پھر کون سا؟ فرمایا: ''حج مبرور'' (ایسا حج جو سراسر نیکی اور تقوے پر مبنی اور مکمل ہو۔) محمد بن جعفر کی روایت میں ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان'' کے الفاظ ہیں۔

اِس معنی میں اور بھی بہت ساری احادیث مروی ہیں۔

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب العتق، باب أي الرقاب أفضل، رقم الحديث (2518) ومسلم، كتاب الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، رقم الحديث: 136 (84)

[2] مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، رقم الحديث: 135 (83)

زبانوں کی کارستانیاں:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد: ''کیا میں تمھیں ان تمام باتوں کا جس چیز پر دارومدار ہے وہ نہ بتا دوں؟'' میں نے کہا: ہاں، اللہ کے نبی! پھر آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: ''اسے اپنے قابو میں رکھو۔'' یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ زبان کو روکنا اور اسے کنٹرول کرنا ''خیر'' کی جڑ اور بنیاد ہے۔ لہٰذا جو شخص اسے قابو کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے وہ اپنے تمام معاملات کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اِس کی مزید وضاحت حدیث نمبر:15 میں گزر چکی ہے۔

''زبانوں کی کارستانیوں'' سے مراد حرام گفتگو کا بدلہ اور اس کی سزا ہے، کیونکہ انسان اپنے قول وعمل کے ساتھ نیکیاں اور برائیاں کاشت کرتا ہے، دنیا میں جو بوتا ہے قیامت کے دن اسی کو کاٹے گا۔ جس نے اپنے قول وعمل کے ذریعے خیر کو بویا وہ عزت وتکریم پائے گا اور جس نے شر کو بویا اسے کل قیامت کے روز حسرت وندامت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

اِس حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ جس چیز کی وجہ سے لوگ جہنم میں جائیں گے وہ ان کی زبانوں کی کارستانیاں ہیں اور ان میں شرک بھی شامل ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔ اسی طرح ان میں اللہ پر بغیر علم کے بات کرنا بھی شامل ہے، جسے شرک کا ساتھی قرار دیا گیا ہے۔ نیز ان میں جھوٹی گواہی دینا، جادو کا عمل کرنا، تہمت لگانا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، چغل خوری کرنا اور تمام چھوٹے اور بڑے گناہ بھی شامل ہیں جو عموماً ایسی بات سے خالی نہیں ہوتے جو ان گناہوں کے کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ يَنْزِلُ بِهَا فِي النَّارِ أَبْعَدَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ»[1]

''(بعض اوقات) بندہ کوئی کلمہ کہہ دیتا ہے جس کی وجہ سے دوزخ میں اس سے بھی زیادہ دور اتر جاتا ہے جتنی دوری مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس اللہ کی قسم کھا کر کہا کرتے تھے جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں کہ زمین پر سب سے زیادہ جس چیز کو جیل میں بند کرنے کی ضرورت ہے وہ ہے: زبان۔

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم الحديث (6477) ومسلم، كتاب الزهد، باب التكلم بالكلمة يهوي بها في النار، رقم الحديث: 50 (2988)

امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: زبان جسم کی امیر ہے۔ چنانچہ جب زبان گناہ کرتی ہے تو جسم کے باقی اعضاء بھی کرتے ہیں اور جب زبان بچ جاتی ہے تو جسم کے باقی اعضاء بھی بچ جاتے ہیں۔

فوائدِ حدیث:

1. صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے دینی امور کا علم حاصل کرنے کے لیے انتہائی حریص تھے اور رسولِ اکرم ﷺ سے ہر اس چیز کے بارے میں سوال کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے۔
2. جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے نجات پانا بڑے بڑے اعمال کا محتاج ہے۔
3. جو شخص اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے اور خالصتاً اس کی رضا کے لیے عمل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر مشکل عمل کو آسان کر دیتا ہے اور اس کی تمنا کو پورا کرتا ہے۔
4. اللہ تعالیٰ کے فرائض کو پورا کرنا اللہ کی رضامندی اور اس کی جنت کے حصول کا قریب ترین راستہ ہے۔
5. نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے سے خیر کے دروازے کھلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی حاصل ہوتی ہے۔
6. زبان کی شہوت میں پھسلنا اور اسے اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں میں استعمال کرنا انتہائی خطرناک ہے۔
7. عالم پر واجب ہے کہ وہ نصیحت و خیرخواہی میں کوئی کسر نہ چھوڑے اور واضح طور پر طالبِ نصیحت کو نصیحت کرے۔

سوالات:

1. درج ذیل الفاظ کے معانی ذکر کریں: ”لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، جُنَّةٌ، جَوْفُ اللَّيْلِ، رَأْسُ الْأَمْرِ“
2. نبی کریم ﷺ کے الفاظ: «لَقَدْ سَأَلْتَنِي عَنْ عَظِيمٍ» میں کس بات کی طرف اشارہ ہے؟
3. نبی کریم ﷺ کے الفاظ: «وَأَنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ» سے کیا مراد ہے؟ اور صدق واخلاص کا بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور توفیق میں کتنا اثر ہوتا ہے؟
4. «تَعْبُدُ اللّٰهَ» مسلمان اللہ تعالیٰ کے لیے عبودیت کو کیسے خالص کر سکتا ہے؟
5. رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی توحید اور اسے شریک سے پاک کرنے کو جمع کیوں فرمایا؟
6. حدیث میں خیر کے کاموں میں سبقت لے جانے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب ہے۔ یہ مفہوم آپ نے حدیث کے کن الفاظ سے سمجھا ہے؟

7 حدیث مبارکہ میں خیر کے کن کن دروازوں کو ذکر کیا گیا ہے؟

8 رات کی افضل نماز کون سی ہے؟

9 دین کی جڑ، اس کا ستون اور اس کی چوٹی سے مراد کیا ہے؟

10 نبی کریم ﷺ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنی زبان کو کنٹرول کرنے کی نصیحت کی۔ تو اِس پر عمل کرنے سے فرد اور معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟



شریعت میں حکمت ورحمت

(30) سیدنا ابوثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا »[1]

"بے شک اللہ نے فرائض مقرر کیے ہیں، انھیں ضائع نہ کرو۔ اس نے حرمات کو حرام قرار دیا ہے، پس ان کے قریب نہ جاؤ۔ اور اللہ نے حدود متعین کی ہیں، پس ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور اس نے جانتے بوجھتے کچھ چیزوں سے سکوت فرمایا، پس ان کے متعلق بحث نہ کرو۔"

راویِ حدیث:

سیدنا ابوثعلبہ جرثوم بن ناشر الخشنی رضی اللہ عنہ، اپنی کنیت کے ساتھ مشہور تھے۔ قبیلہ بنوخشین سے تعلق رکھتے تھے جو قضاعہ میں سے تھا۔ شام میں رہائش پذیر رہے۔ صلح حدیبیہ میں درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شامل تھے۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں ان کی قوم کی طرف داعی بنا کر بھیجا تو قوم کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے ۴۰ احادیث روایت کیں اور ۷۵ھ میں فوت ہوئے۔

احکام کی اقسام:

اِس حدیث میں نبی ﷺ نے احکام کی چار قسمیں ذکر کیں: فرائض، محارم، حدود اور وہ امور جن پر خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ یہ چاروں اقسام دین کے تمام احکام کو شامل ہیں۔ اسی لیے ابوبکر سمعانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث دین کے اصولوں میں سے ایک اصل پر مشتمل ہے۔

جہاں تک "فرائض" کا تعلق ہے تو ان سے مراد وہ عبادات ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، جیسے: نماز، زکات، روزہ اور حج۔

اور "محارم" سے مراد وہ امور ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر لیا ہے اور ان کے قریب جانے اور ان

---

[1] رواه الدارقطني (184/4)، رقم الحديث (4350) والبيهقي (10/13-12)

کا ارتکاب کرنے سے منع کیا ہے۔ اور وہ محرمات جن میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اللہ کی کتاب اور احادیث میں مذکور ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾

[الأنعام: ۱۵۱۔ ۱۵۲]

''آپ ان سے کہیے: آؤ میں تمھیں پڑھ کر سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے تم پر کیا کچھ حرام کیا ہے اور وہ یہ باتیں ہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اور یہ کہ والدین سے اچھا سلوک کرو۔ اور یہ کہ مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو (کیونکہ) ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں تو ان کو بھی ضرور دیں گے۔ اور یہ کہ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ یہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں۔ اور یہ کہ جس جان کے مارنے کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرو الا یہ کہ حق کے ساتھ ہو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا اللہ نے تمھیں تاکیداً حکم دیا ہے۔ شاید کہ تم عقل سے کام لو۔ نیز یہ کہ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو (اس کے حق میں) بہتر ہو۔ تا آنکہ وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جائے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

[الأعراف: ۳۳]

''آپ ان سے کہیے کہ میرے پروردگار نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں: بے حیائی کے کام، خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اور گناہ کے کام، اور ناحق زیادتی، اور یہ کہ تم اللہ کے شریک بناؤ جس کے لیے اس نے کوئی سند نہیں اتاری۔ اور یہ کہ تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگا دو جن کا تمھیں علم نہیں۔''

اللہ کی حدود:

اللہ کی حدود جن سے تجاوز کرنا جائز نہیں، ان سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے، خواہ وہ واجب ہوں یا مستحب ہوں، اوران سے تجاوز کرنے کا معنی یہ ہے کہ ان سے آگے بڑھتے ہوئے ان کاموں کا ارتکاب کیا جائے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

[البقرة: ٢٢٩]

''یہ اللہ کی حدود ہیں، لہٰذا ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کی اجازت دی ہے ان کی ایک حد ہے اور اس حد سے آگے بڑھنا ممنوع کاموں کے ارتکاب کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حدود کی حفاظت کرنے والوں کی تعریف اور حلال وحرام کی حدوں کو نہ پہچاننے والوں کی مذمت کی ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ﴾

[التوبة: ٩٧]

''دیہاتی عرب کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان میں یہ امکان زیادہ ہے کہ وہ (اس دین کی) حدود کو نہ سمجھ سکیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں۔''

جو شخص جائز کاموں سے تجاوز کرتے ہوئے ناجائز کاموں کا ارتکاب نہیں کرتا وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے اور جو ان سے آگے بڑھتا ہے وہ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والا ہوتا ہے۔

بعض اوقات حدود سے مراد خود محرمات وممنوعات بھی ہوتے ہیں۔ تبھی یہ کہا گیا ہے کہ تم اللہ کی حدود کے قریب بھی نہ جاؤ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''یہ اللہ کی حدیں ہیں، لہٰذا تم ان کے قریب تک نہ جاؤ۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ میں روزے اور مساجد میں اعتکاف کی حالت میں جن امور سے منع کیا گیا ہے ان کا ارتکاب نہ کرو۔ اسی معنی میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے:

«مَثَلُ الْقَائِمِ عَلَى حُدُودِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيهَا، كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهَمُوا عَلَى سَفِينَةٍ»[1]

''اس شخص کی مثال جو اللہ کی حدود پر قائم ہو اور جو ان میں مبتلا ہو گیا ہو، ان لوگوں کی سی ہے جنھوں نے ایک کشتی کے ذریعے قرعہ تقسیم کر لیا۔''

اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو محرمات سے خود بچنے اور دوسروں کو ان سے روکنے والا ہو۔ اسی معنی میں اس شخص کی بات ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا: میں نے ایک حد کا ارتکاب کر لیا ہے، لہٰذا آپ اسے مجھ پر نافذ کریں۔[2]

بعض اوقات حدود سے مراد وہ سزائیں ہوتی ہیں جو جرائم کی بیخ کنی اور بڑی بڑی محرمات کے ارتکاب سے روکنے اور مجرموں کو ڈرانے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: زنا کی حد، چوری کی حد اور شراب نوشی کی حد وغیرہ

اِس حدیث میں جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے کچھ حدیں مقرر کی ہیں، لہٰذا تم ان سے تجاوز نہ کرو۔'' تو بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ ان حدوں سے مراد وہی سزائیں ہیں جو محرمات سے روکنے اور مجرموں کو ڈرانے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرنے کا معنی یہ ہوگا کہ ان مجرموں کو چھوڑنا نہیں، بلکہ انھیں یہ سزائیں ہر حال میں دینی ہیں۔

رحمتِ باری تعالیٰ، نہ کہ نسیان:

جن امور پر خاموشی اختیار کی گئی ہے ان سے مراد وہ امور ہیں جن کا حکم ذکر نہیں کیا گیا، حلت وحرمت، یا استحباب وکراہت اور جواز وعدمِ جواز کے اعتبار سے۔ تو ایسے امور میں انسان پر کوئی حرج نہیں، اگر وہ ان میں سے کوئی کام کرے گا تو اس پر اس سے پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ اِن امور پر اللہ تعالیٰ نے جو خاموشی اختیار کی تو وہ بندوں پر رحمت کرتے ہوئے کی نہ کہ بھولتے ہوئے۔ ان امور کو حرام نہیں کیا کہ ان کا ارتکاب کرنے والا سزا کا مستحق ہو، اور نہ ہی انھیں واجب کیا کہ ان کو چھوڑنے والا قابلِ مؤاخذہ ہو، بلکہ خاموشی اختیار کی تاکہ نہ ان امور کے کرنے والوں کو کوئی حرج ہو اور نہ ہی چھوڑنے والوں کو کوئی سزا ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا حج ہر سال فرض ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الشركة، باب هل يقرع في القسمة، رقم الحديث (2493)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الحدود، باب إذا أقر بالحد، رقم الحديث (6823) ومسلم، كتاب التوبة، باب قوله تعالى: ﴿ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾، رقم الحديث: 45 (2765)

«دَعُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»[1]

''جب تک میں تم سے یکسو رہوں تم بھی مجھے چھوڑے رکھو (اور سوالات وغیرہ نہ کرو) کیونکہ تم سے پہلے لوگ زیادہ سوال کرنے اور اپنے انبیائے کرام سے اختلاف کرنے کے سبب ہلاک ہوئے۔ لہٰذا جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کروں تو رک جاؤ اور جب میں تمھیں کسی چیز کی بجا آوری (تعمیل) کا حکم دوں تو اپنی طاقت کے مطابق اسے بجا لاؤ۔''

نبی ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''تم ان کے متعلق بحث نہ کرو'' ہوسکتا ہے کہ یہ نہی تب تھی جب نبی کریم ﷺ اِس دنیا میں بقیدِ حیات تھے، کیونکہ آپ کی حیاتِ مبارکہ میں ایسے امور کے بارے میں کثرتِ بحث وسوال سختی کا سبب بن سکتی تھی، وجوب یا تحریم کے اعتبار سے۔ اس لیے اس سے منع کر دیا گیا اور عین ممکن ہے کہ اسی کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہو: «هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ» قَالَهَا ثَلَاثًا. ''غلو میں گہرے اترنے والے ہلاک ہوگئے۔'' آپ نے تین بار یہ بات ارشاد فرمائی۔[2]

''المتنطع'' سے مراد وہ شخص ہے جو ایسے امور کے بارے میں بہت زیادہ بحث کرے جن سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ اسی میں وہ ظاہریہ بھی شامل ہیں جو صرف ظاہری الفاظ کو سامنے رکھتے ہیں اور معانی اور قیاس کی نفی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن امور پر خاموشی اختیار کی گئی ہے اور ان کے بارے میں کوئی خاص یا عام نص موجود نہیں تو ان کے متعلق بحث کرنے کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: باحث صحیح نصوص کی دلالت کے بارے میں تحقیق کرے، ان کا صحیح مفہوم متعین کرنے، صحیح قیاس کرنے اور ان کے مطابق فتویٰ دینے کی کوشش کرے تو یہ برحق ہے۔ اور احکامِ شرعیہ کی معرفت کے لیے مجتہدین پر یہی لازم ہے۔

دوسری قسم: باحث اپنی بحث وتحقیق اور فکر ونظر کو بہت ہی پیچیدہ امور کے لیے خاص کر دے اور مختلف چیزوں

[1] أخرجه البخاري، كتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنة رسول الله ﷺ، رقم الحديث (7288) ومسلم، كتاب الفضائل، باب توقيره ﷺ، رقم الحديث: 130 (1337) نحوه.

[2] أخرجه مسلم، كتاب العلم، باب هلك المتنطعون، رقم الحديث: 7 (2670)

میں فروق بیان کرنے کے لیے دور کی کوڑی لائے، پھر ایک جیسی دو چیزوں کو محض اس لیے جدا جدا کر دے کہ ان میں کوئی ایسا فرق ہو جس کا بظاہر شریعت میں کوئی اثر نہ ہو۔ اور اس کے برعکس ان دو چیزوں کو جمع کرنے کے لیے جو شرعی اوصاف مطلوب ہوں وہ بھی موجود ہوں۔ یا پھر وہ دو الگ الگ چیزوں کو ان عارضی اوصاف کی بنا پر جمع کر دے جو غیر مناسب ہوں اور شریعت میں ان کی تاثیر کی کوئی دلیل بھی نہ ہو۔ اِس قسم کی بحث شرعاً پسندیدہ اور قابلِ ستائش نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ اس میں فقہاء کے کئی گروہ واقع ہوئے ہیں۔

بہر حال قابلِ ستائش فکر ونظر وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد قرونِ اولیٰ کے دیگر سلف صالحین کی فکر ونظر کے مطابق ہو۔

جن چیزوں میں بحث کرنا ممنوع ہے ان میں وہ غیبی امور بھی ہیں جن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی کیفیت بیان نہیں کی گئی۔ ان میں سے بعض کے بارے میں ہوسکتا ہے اِس عالم رنگ وبو میں کوئی شاہد ہی نہ ہو۔ لہٰذا ایسے امور کے متعلق غور وفکر کرنا اور ان کی کیفیت کا پتا چلانے کی کوشش کرنا عبث ہے اور اِس سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں جو تکذیب تک پہنچا دیں اور انسان ایمان کی دولت سے محروم ہو جائے۔ والعیاذ باللہ

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتَّى يُقَالَ: هَذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ، فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ؟ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئاً، فَلْيَقُلْ: آمَنْتُ بِاللّٰهِ»[1]

"لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے (فضول) سوالات کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ سوال بھی ہوگا کہ اللہ نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے، تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جو شخص ایسی کوئی چیز دل میں پائے تو کہے: میں اللہ پر ایمان لایا ہوں۔"

جبکہ صحیح بخاری میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ فَيَقُولُ: مَنْ خَلَقَ كَذَا، مَنْ خَلَقَ كَذَا، حَتَّى يَقُولَ: مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؟ فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ»[2]

---

[1] أخرجه مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الوسوسة من الإيمان، رقم الحديث: 212 (134)

[2] أخرجه البخاري، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، رقم الحديث (3276)

''شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: یہ کس نے پیدا کیا؟ وہ کس نے پیدا کیا؟ حتیٰ کہ سوال کرنے لگتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ لہٰذا جب نوبت یہاں تک آ پہنچ جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہیے اور اس شیطانی خیال کو ترک کر دینا چاہیے۔''

فوائد حدیث:

1. یہ حدیث اصولِ دین میں سے ایک بہت بڑے اصل پر مشتمل ہے۔
2. اللہ کی ''حدود'' کا اطلاق ان امور پہ ہوتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یا جن سے منع کیا ہے۔ اور ان حدود سے اعتداء وتجاوز ماموارت کو چھوڑنے یا ممنوعات کو کرنے کی شکل میں ہوتا ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ اور بعض حدود کا اطلاق ان سزاؤں پر بھی ہوتا ہے جو جرائم کی بیخ کنی کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً: زنا کی حد اور چوری کی حد وغیرہ۔
3. صحیح نصوص کی دلالت کے بارے میں بحث وتحقیق کرنا اور غور وفکر کرنا جائز بلکہ شرعاً مطلوب ہے۔ تاکہ اسی بنا پر باحث نصوص کا صحیح مفہوم متعین کرتے ہوئے اور صحیح قیاس کرتے ہوئے فتویٰ وغیرہ دے سکے۔
4. غیبی امور کے متعلق بحث کرنا اس تنطع کا حصہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

سوالات:

1. بعض اشیاء سے خاموشی اختیار کرنے اور کسی چیز کے واجب یا حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کسی نص کی عدمِ موجودگی میں شرعاً کیا حکمت ہے؟
2. جس چیز میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو اس کا حکم جاننے کے لیے بحث کرنا کیسا ہے؟
3. جن امور پر خاموشی اختیار کی گئی ہے ان کے بارے میں ایک مسلمان کا کیا موقف ہونا چاہیے؟
4. ''تنطع'' کسے کہتے ہیں؟ اور اس کا کیا حکم ہے؟
5. احکام کی چار قسمیں ذکر کریں۔
6. صحیح یا غلط کی نشاندہی کریں:

1- حدود سے مراد اوامر ونواہی پر رک جانا ہے۔
2- جرائم کی بیخ کنی کے لیے مقررہ سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے۔
3- غیبی امور کے بارے میں بحث کرنا جائز ہے۔
4- جس چیز کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہو وہ مباح ہے اوراس پر عمل کرنا جائز ہے۔



نقصان پہنچانا ممنوع ہے۔

(31) سیدنا ابوسعید سعد بن مالک بن سنان خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ»[1]

''نہ (بلا وجہ) نقصان پہنچانا ہے اور نہ ہی بدلے میں نقصان پہنچانا ہے۔''

راویِ حدیث:

ابوسعید سعد بن مالک بن سنان خدری رضی اللہ عنہ ''خدرہ'' کی طرف منسوب ہیں، جو خزرجی قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔ آپ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور تھے۔ جنگِ احد کے موقع پر کم عمری کی وجہ سے انھیں اس میں شرکت کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد تمام غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۱۷۰ احادیث روایت کی ہیں۔ موصوف کا شمار ان صحابہ کرام میں ہوتا ہے جو فقہاء اور علماء سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی وفات ۶۵ھ یا ۶۴ھ میں ہوئی۔

ضرر اور ضرار:

- کہا گیا ہے کہ ''ضرر'' اسم ہے اور ''ضرار'' فعل ہے۔ معنی یہ ہے کہ شریعت میں ضرر کی کلی طور پر نفی کر دی گئی ہے، لہٰذا نہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانا جائز ہے اور نہ کسی اور کو ناحق نقصان پہنچانا جائز ہے۔
- یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''ضرر'' سے مراد کسی اور کو نقصان پہنچانا ہے کہ جس سے نقصان پہنچانے والے کو فائدہ ہو۔ اور ''ضرار'' سے مراد کسی اور کو نقصان پہنچانا ہے چاہے نقصان پہنچانے والے کو کوئی فائدہ نہ ہو۔ یہ معنی ابن عبدالبر اور ابن الصلاح رحمہم اللہ وغیرہ نے راجح قرار دیا ہے۔
- اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''ضرر'' کا معنی ہے اس شخص کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا جس نے اس کا کوئی نقصان نہ کیا ہو۔ اور ''ضرار'' کا معنی ہے اس شخص کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا جس نے اسے ناحق نقصان پہنچایا ہو۔

---

[1] رواه الدارقطني في السنن، كتاب البيوع (228/4) والحاكم في المستدرك (58,57/2) وقال: صحيح الإسناد على شرط مسلم وسكت الذهبي، وصححه الألباني في الإرواء (896)

بہر حال نبی ﷺ نے ضرر کی نفی کر دی ہے اور کسی کو ناحق طور پر نقصان پہنچانے سے منع کر دیا ہے۔
جہاں تک کسی کو بجا طور پر نقصان پہنچانے کا تعلق ہے، مثلاً: کسی نے اللہ کی حدود میں سے کسی حد کا ارتکاب کیا اور اسے اس کے جرم کے مطابق سزا دی گئی، یا اس نے کسی پر ظلم کیا اور مظلوم نے عدل وانصاف کے ساتھ اپنے حق کا مطالبہ کیا تو یہ اِس حدیث میں داخل نہیں ہے۔ اِس میں صرف ناحق نقصان پہنچانے کی نفی ہے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: کسی کو ناحق نقصان پہنچانا ہی مقصود ہو، اِس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہ ہو۔ اِس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور قرآن مجید میں متعدد مواقع پر نقصان پہنچانے کی نفی وارد ہوئی ہے۔ مثلاً:

1. وصیت میں کسی کو ضرر پہنچانے کا قصد کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصَىٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرّٖۚ وَصِيَّةٗ مِّنَ ٱللَّهِۗ﴾ [النساء: ۱۲]

”(وراثت کی یہ تقسیم) وصیت کی تنفیذ، یا اگر قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ اس حال میں کہ (اس وصیت یا اس قرض کے اعتراف سے) کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔“

سنن ترمذی میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّيْنَ سَنَةً، ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ، فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ، ثُمَّ قَرَأَ عَلَيَّ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: ﴿مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصَىٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرّٖۚ وَصِيَّةٗ مِّنَ ٱللَّهِۗ﴾ إلى قوله: ﴿وَذَٰلِكَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ﴾ [النساء: ۱۲۔ ۱۳] »[1]

”مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، پھر ان کی موت کا وقت آتا ہے اور وہ وصیت کرنے میں (ورثاء کو) نقصان پہنچاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان دونوں کے لیے جہنم واجب ہو جاتی ہے۔ پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیات تلاوت کیں:

﴿مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصَىٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرّٖۚ وَصِيَّةٗ مِّنَ ٱللَّهِۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٞ ۝ تِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِۚ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ يُدۡخِلۡهُ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَاۚ وَذَٰلِكَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ﴾ [النساء: ۱۲۔ ۱۳]

[1] سنن الترمذي، كتاب الوصايا، باب ما جاء في الضرار في الوصية، رقم الحديث (2117)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: وصیت میں نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ پھر انھوں نے مذکورہ آیت کی تلاوت کی۔

وصیت میں نقصان پہنچانے کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ فوت ہونے والا شخص اپنے کسی وارث کو اس کے مقررہ حصے سے زیادہ دینے کی وصیت کرے، یوں وہ دیگر ورثاء کو نقصان پہنچائے گا۔

اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ»①

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔''

اسی طرح وصیت میں نقصان پہنچانے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ وہ کسی اجنبی شخص کے حق میں ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کر دے۔ اِس سے ورثاء کے حقوق میں کمی واقع ہوگی۔ اگر اس نے اِس وصیت کے ساتھ ورثاء کو نقصان پہنچانے کی نیت کی تو وہ یقیناً گناہ گار ہوگا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اَلثُّلُثُ، وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ أَوْ كَبِيرٌ»②

''ہاں ثلث (تہائی) ٹھیک ہے، لیکن ثلث کی مقدار بھی زیادہ یا بڑی ہے۔''

یاد رہے کہ اگر ایک شخص کسی اجنبی کے لیے تہائی سے زیادہ کی وصیت کرے تو اس کی وصیت نافذ نہیں کی جائے گی، خواہ اس نے نقصان پہنچانے کی نیت کی یا نہیں۔ ہاں اگر اس کے ورثاء اس کی اجازت دے دیں تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

② طلاق سے رجوع کے معاملے میں خواتین کو نقصان پہنچانا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۱]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آ جائے تو پھر یا تو سیدھی طرح انھیں اپنے پاس رکھو یا پھر بھلے طریقے سے انھیں رخصت کر دو۔ انھیں دکھ پہنچانے کی

① أخرجه النسائي، كتاب الوصايا، باب إبطال الوصية لوارث، رقم الحديث (3643) والترمذي، كتاب الوصايا، باب ما جاء لا وصية لوارث، رقم الحديث (2121) وابن ماجه، كتاب الوصايا، باب لا وصية لوارث، رقم الحديث (2713)

② أخرجه البخاري، كتاب الوصايا، باب الوصية بالثلث، رقم الحديث (2744) ومسلم، كتاب الوصية، باب الوصية بالثلث، رقم الحديث: 5 (1628)

خاطر نہ روکے رکھو (یعنی رجوع کر لو) کہ تم ان پر زیادتی کر سکو۔ اور جو شخص یہ کام کرے گا تو وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرے گا۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ﴾ [البقرۃ: ۲۲۸]

''اور اگر ان کے خاوند اس مدت میں پھر سے تعلقات استوار کرنے پر آمادہ ہوں تو وہی انھیں زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ رجوع سے جس کا مقصد عورت کو نقصان پہنچانا ہو تو وہ گناہ گار ہے۔ جیسا کہ اوائلِ اسلام میں لوگ کرتے تھے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا، پھر اسے چھوڑ دیتا یہاں تک کہ جب اس کی عدت مکمل ہونے کا وقت قریب آتا تو اس سے رجوع کر لیتا، اس کے بعد پھر طلاق دے دیتا، .... پھر ہمیشہ کے لیے ایسے ہی کرتا رہتا، تو وہ عورت لٹکی رہتی، نہ وہ مطلقہ ہوتی اور نہ ہی اسے گھر میں بسایا جاتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اِس طریقِ کار کو باطل قرار دے دیا اور طلاق کو بس تین کے عدد تک محدود کر دیا۔

3 رضاعت کے معاملے میں نقصان پہنچانا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۳]

''نہ تو والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ ہی باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے۔''

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''وہ بچے کی ماں کو دودھ پلانے سے منع نہ کرے کہ جس سے وہ پریشان ہو جائے۔''

دیگر ائمہ کرام عطاء، قتادہ، زہری، سفیان اور سدی رحمہم اللہ وغیرہ کہتے ہیں:

''جب وہ اس چیز پر راضی ہو جائے جس پر دوسری عورتیں راضی ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے بچے کی زیادہ حق دار ہے۔''

یہی بات امام احمد رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ''اور نہ ہی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے۔'' اِس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر مطلقہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے کا مطالبہ کرے، اس اجرت کے بدلے میں جو اس جیسی عورتوں کو عموماً دی جاتی ہے، تو اس بچے کے باپ پر لازم ہے کہ وہ اس کا مطالبہ پورا کرے۔

خواہ اسے دودھ پلانے والی کوئی اور عورت ملے یا نہ ملے، لیکن اگر وہ اپنے جیسی عورتوں سے زیادہ اجرت کا مطالبہ کرے اور باپ کو کوئی اور ایسی عورت مل رہی ہو جو اس جیسی عورتوں کی اجرت کے بدلے میں دودھ پلانے پر تیار ہو تو باپ پر لازم نہیں کہ وہ بچے کو اس کی ماں ہی سے دودھ پلائے، کیونکہ وہ اسے نقصان پہنچانے کا قصد کر رہی ہے۔

4 خرید وفروخت میں نقصان پہنچانا۔ جیسا کہ ایک شخص مجبور ہو، تو اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے کوئی چیز مہنگے داموں بیچنا، مثلاً: ایک چیز دس درہم کی ہو اور آپ اسے بیس درہم میں بیچیں۔ یا اس کی مجبوری کی بنا پر اس کے پاس جو ساز وسامان برائے فروخت ہو اسے انتہائی سستے داموں خریدنا۔ ان دونوں صورتوں میں یقیناً اسے نقصان ہوگا۔

اسی طرح اگر ایک شخص خرید وفروخت کے معالات میں بہت زیادہ سمجھدار نہ ہو تو اسے دھوکا دیتے ہوئے اس کے ساتھ خرید وفروخت کا ایسا معاملہ کرنا جس میں اس کا نقصان ہو۔

دوسری قسم: انسان کا مقصد نقصان پہنچانا نہ ہو، بلکہ اس کے مدِ نظر اچھا مقصد ہو، مثال کے طور پر وہ اپنی مملوکہ چیز میں کوئی ایسا تصرف کرے جس میں اس کی مصلحت ہو، لیکن اس کی وجہ سے کسی اور کا نقصان ہو جائے، یا وہ کسی کو اپنی مملوکہ چیز سے فائدہ اٹھانے سے منع کرے، لیکن جس شخص کو منع کیا گیا اس کا اس سے نقصان ہو جائے۔

پہلی صورت کی مثال: کوئی شخص اپنی زمین میں اس وقت آگ جلائے جب تیز آندھی چل رہی ہو، اور وہ آس پاس کی زمین میں کئی چیزوں کو جلا دے۔ تو وہ شخص یقیناً زیادتی کرنے والا تصور کیا جائے گا اور نقصان کی تلافی کرنے کا پابند ہوگا۔ اور اگر وہ کسی ایسے وقت میں آگ جلائے جب آندھی نہ چل رہی ہو، لیکن پھر بھی نقصان ہو جائے تو اس کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اسے اِس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اسے منع کیا جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بعض صورتوں میں ان کی موافقت کی ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

1 وہ اپنی بلند وبالا بلڈنگ میں کھڑکیاں بنائے جو اس کے پڑوسی پر کھلتی ہوں۔

2 وہ بلند وبالا بلڈنگ بنائے اور پڑوسیوں کی طرف اسے کھلا رکھے جس سے پڑوسیوں کے لیے پردے کے مسائل پیدا ہوں۔ تو امام احمد اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض شاگردوں کے نزدیک اسے پابند کیا جائے گا کہ وہ اس بلڈنگ کو پڑوسیوں کی طرف کھلا نہ رکھے۔

③ وہ بلند و بالا بلڈنگ تعمیر کرے اور پڑوسیوں سے سورج کی دھوپ اور چاند کی روشنی کو روکنے کا قصد کرے تو اسے اِس سے منع کیا جائے گا۔

④ وہ اپنے پڑوسی کے کنویں کے قریب کنواں کھودے، جس سے پڑوسی کے کنویں کا پانی ختم ہو جائے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس کے کنویں کو بند کر دیا جائے گا۔

⑤ وہ اپنی مملوکہ چیز میں کوئی ایسا تصرف کرے جس سے پڑوسی کی مملوکہ چیز میں نقصان ہو۔ تو اسے اِس سے منع کیا جائے گا۔

⑥ اسی طرح اگر اس کے گھر سے اٹھنے والی بدبو پڑوسیوں کے لیے تکلیف دہ ہو تو اسے اس سے منع کیا جائے گا۔

⑦ اگر کسی کی زمین میں اس کی کوئی چیز ہو اور صاحبِ زمین کو اس کے وہاں جانے سے نقصان ہو تو اسے اس چیز کو وہاں سے ہٹانے پر مجبور کیا جائے گا تاکہ مالکِ زمین کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

سنن ابی داود میں جناب سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری کے باغ میں ان کے کھجوروں کے چند درخت تھے اور اس انصاری کے ساتھ اس کے گھر والے بھی رہائش پزیر تھے۔ سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ اپنے درختوں کے لیے جاتے تو اس (انصاری) کو بڑی اذیت ہوتی اور اسے ان کا اس طرح آنا جانا برا لگتا تھا۔ انصاری نے سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے چاہا کہ یہ درخت اس کو بیچ دیں، مگر سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا، پھر انصاری نے مطالبہ کیا کہ ان کے بدلے میں دوسرے درخت لے لیں۔ تو پھر بھی سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا، پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور یہ واقعہ کہہ سنایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اپنے درخت اس (انصاری) کو فروخت کر دے تو اس نے انکار کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ان کے بدلے میں دوسرے درخت لے لے، تو بھی اس نے انکار کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اس کو ہبہ کر دے تجھے اتنا اتنا اجر ملے گا۔ اس کو بہت ترغیب دی مگر اس نے انکار کر دیا۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نقصان دینے والا ہے۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے فرمایا:

«اِذْهَبْ فَاقْلَعْ نَخْلَهُ»[1] ''جاؤ اور اس کی کھجوروں کو اکھیڑ ڈالو۔''

امام احمد رحمہ اللہ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: ہر وہ کام جو اِس طرز کا ہوگا اور اس میں دوسرے کے لیے ضرر کا پہلو ہوگا تو اس کے کرنے والے کو اس سے منع کیا جائے گا۔ اگر وہ قبول کرے گا تو ٹھیک، ورنہ حاکم اسے مجبور کرے گا، تاکہ وہ اپنے بھائی کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا سکے۔

---

① أخرجه أبو داود، كتاب الأقضية، أبواب من القضاء، رقم الحديث (3636)

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے اور وہ ہے کسی کو اپنی مملوکہ چیز سے فائدہ اٹھانے سے منع کرنا، تو اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی بندہ کسی ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے اپنے پڑوسی کو اپنی مملوکہ چیز سے فائدہ اٹھانے سے منع کرے، جیسا کہ ایک شخص کی ایک دیوار اتنی کمزور ہو کہ وہ لکڑی وغیرہ کا بوجھ برداشت نہ کر سکتی ہو، تو اس پر وزنی چیزیں ڈالنے سے منع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو منع نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرِزَ خَشَبَهُ فِي جِدَارِهِ»، ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ: مَا لِي أُرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِينَ وَاللّٰهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ.[1]

''کوئی پڑوسی دوسرے پڑوسی کو اپنی دیوار میں کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔''

پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا بات ہے کہ میں تمھیں اس بات سے روگردانی کرتے دیکھتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں یہ حدیث تم سے بیان کرتا رہوں گا۔

اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ جاری کیا تھا کہ ان کے پڑوسی کا پانی ان کی زمین سے گزر سکتا ہے، انھوں نے فرمایا تھا: پانی ہر صورت میں گزرے گا چاہے تمھارے پیٹ کے اوپر ہی سے گزرے۔

اگر کوئی بندہ اپنی زمین کی ضرورت سے بچا ہوا پانی دوسرے کی زمین میں جانے سے روکے گا تو اس کو اس سے منع کیا جائے گا۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَمْنَعُوا فَضْلَ الْمَاءِ لِتَمْنَعُوا بِهِ فَضْلَ الْكَلَأِ»[2]

''ضرورت سے زائد پانی سے کسی کو اس غرض سے نہ روکو کہ (اس طرح) تم ضرورت سے زائد گھاس کو بچاؤ۔''

صحیح مسلم میں اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«لَا يُمْنَعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِيُمْنَعَ بِهِ الْكَلَأُ»[3]

''فالتو پانی نہ روکا جائے کہ اس طرح زائد گھاس بچانا مقصود ہو۔''

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب المظالم، باب لا يمنع جار جاره أن يغرز خشبه في جداره، رقم الحديث (2463) ومسلم، كتاب المساقاة، باب غرز الخشب في جدار الجار، رقم الحديث: 136 (1609)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، باب من قال: أن صاحب الماء أحق بالماء، رقم الحديث (2354)

[3] أخرجه مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم بيع فضل الماء، رقم الحديث: 37 (1566)

لہٰذا بچا ہوا پانی چھوڑ دینا واجب ہے، خواہ وہ انسانوں کے پینے کے لیے ہو، یا جانوروں کے پینے کے لیے، یا کھیتی باڑی کے لیے۔

بندوں کی مصلحتیں:

« لَا ضَرَرَ » کے عموم میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کوئی ایسا کام کرنے کا حکم نہیں دیا جو ان کے لیے ضرر کا باعث ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جن کاموں کا حکم دیا ہے وہ ان کی دینی و دنیاوی مصلحتوں کے عین مطابق ہے۔ اور انھیں جن کاموں سے منع کیا ہے وہ ان کی دینی ودنیاوی مصلحتوں کے فساد کا ذریعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیا جو ان کے جسموں کے لیے نقصان دہ ہو۔ اسی لیے اس نے پانی کے ساتھ طہارت کو مریض سے ساقط کر دیا ہے اور مٹی سے تیمم کی رخصت دے دی ہے۔ آیتِ تیمم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ﴾ [المائدۃ: ٦]

''اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ تمھارے اوپر کوئی تنگی پیدا کرے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر سے روزے کی فرضیت کو ساقط کر دیا اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ [البقرۃ: ١٨٥]

''تم میں سے جو شخص مریض یا مسافر ہو تو وہ (رمضان کے روزے چھوڑ کر) دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنِّي أُرْسِلْتُ بِحَنِيْفِيَّةٍ سَمْحَةٍ »[1]

''بے شک مجھے اس دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے جو سیدھا اور آسان ہے۔''

اسی حوالے سے صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے آدمی کو اس کے دو بیٹوں کے سہارے پیدل چلتے ہوئے دیکھا اور آپ کو بتایا گیا کہ اس نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی ہوئی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنْ تَعْذِيْبِ هٰذَا نَفْسَهُ »

---

[1] مسند أحمد (116/6)

''اللہ تعالیٰ اس سے بے پروا ہے کہ یہ شخص اپنی جان کو عذاب میں ڈالے۔''

پھر آپ ﷺ نے اسے سواری پر سوار ہونے کا حکم دیا۔[1]

اسی طرح «لَا ضَرَرَ» کے عموم میں یہ بھی شامل ہے کہ جس شخص پر قرضہ ہو اور وہ تنگ دست ہو تو اس سے قرضے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے مہلت دی جائے گی یہاں تک کہ وہ آسانی سے قرضہ واپس لوٹا سکے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

[البقرة: ٢٨٠]

''اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی آسودہ حالی تک مہلت دینی چاہیے اور اگر (رأس المال بھی) چھوڑ ہی دو تو یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے۔ اگر تم یہ بات سمجھ سکو۔''

فوائدِ حدیث:

1. یہ حدیث ان اصولی قواعد میں سے ہے جن پر علمائے اسلام نے اجماع کیا ہے۔
2. کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو یا کسی کو نقصان پہنچائے۔
3. اسلامی سزاؤں، مثلاً: قصاص میں قتل کرنا، کوڑے مارنا وغیرہ کو ''ضرر'' نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اِن کو نافذ کرنے کا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔
4. اسلام انسان کے نفس کو دشمنی پر مبنی ان تمام جذبات سے پاک کرتا ہے جو لوگوں کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔
5. ''ایمان'' ایسی چیز نہیں جو صرف زبانی کلامی ہو، بلکہ ایسی چیز ہے جو دل میں مستقر ہو اور انسان اپنے عمل کے ذریعے اس کی تصدیق کرتا ہو۔
6. اِس حدیث میں اِس بات کی طرف دعوت ہے کہ آپسی رابطوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے، تاکہ پورا معاشرہ ایک دوسرے سے محبت اور تعاون کرنے والا بن جائے۔

سوالات:

1. ابو سعید خدری کون ہے؟

[1] أخرجه البخاري، كتاب الإيمان والنذور، باب النذر فيما لا يملك، رقم الحديث (6701) ومسلم، كتاب النذر، باب من نذر أن يمشي إلى الكعبة، رقم الحديث: 9 (1642)

2 ضرر اور ضرار میں کیا فرق ہے؟

3 قرآن مجید میں کئی مقامات پر نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے، ان میں سے بعض کا تذکرہ کریں۔

4 نبی کریم ﷺ نے وارث کے لیے وصیت کرنے سے کیوں منع کیا؟

5 وصیت، بیع اور طلاق میں نقصان پہنچانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

6 بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی سزاؤں میں بھی ضرر ہے، لہٰذا انھیں نافذ نہیں کرنا چاہیے۔ تو آپ ان کا رد کیسے کریں گے؟

7 جو نقصان دوسروں کو پہنچایا جاتا ہے اسے علماء نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ کون سی ہیں؟

8 درج ذیل مسائل میں علماء کیا کہتے ہیں:

- ایک شخص نے تیز آندھی کے دوران اپنی زمین میں آگ جلائی۔
- ایک تاجر نے دس دینار کی چیز کو بیس دینار میں بیچا۔
- ایک شخص نے ایک بلند و بالا عمارت بنائی جس سے اس کے پڑوسی کو نقصان ہو رہا ہو۔

9 نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: «إِنِّي أُرْسِلْتُ بِحَنِيفِيَّةٍ سَمْحَةٍ» کس بات پر دلالت کرتا ہے؟



ثبوت مدعی کے ذمے ہے

(32) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ، لَادَّعَى رِجَالٌ أَمْوَالَ قَوْمٍ وَدِمَاءَهُمْ، وَلَكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ» ①

''اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کے اموال اور خونوں پر دعویٰ کرنے لگیں گے، لیکن ثبوت مدعی کے ذمے ہے اور قسم مدعا علیہ پر ہے۔''

اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے جس کے راوی ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اور اس کے الفاظ یوں ہیں:

«لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ، لَادَّعَى أُنَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَأَمْوَالَهُمْ، وَلَكِنَّ الْيَمِينُ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ» ②

''اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کے خون اور ان کے اموال پر دعوی کرنے لگیں گے، لیکن قسم مدعا علیہ پر ہے۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضَى أَنَّ الْيَمِينَ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ» ③

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ہے کہ قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمے ہے۔''

اس معنی کی اور احادیث بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَتْ بَيْنِي وَ بَيْنَ رَجُلٍ خُصُومَةٌ فِي بِئْرٍ، فَاخْتَصَمْنَا إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ،

① حديث حسن رواه البيهقي في السنن الكبرىٰ (246/10) وغيره هكذا، وبعضه في الصحيحين.

② أخرجه البخاري، كتاب التفسير، باب قوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾، رقم الحديث (4552) ومسلم، كتاب الأقضية، باب اليمين على المدعى عليه، رقم الحديث: 1 (1711)

③ أخرجه البخاري، كتاب الرهن، باب إذا اختلف الراهن والمرتهن، رقم الحديث (2514) ومسلم، كتاب الأقضية، باب اليمين على المدعى عليه، رقم الحديث: 2 (1711)

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: « شَاهِدَاكَ أَوْ يَمِينُهُ »، قُلْتُ: إِنَّهُ إِذًا يَحْلِفُ وَلَا يُبَالِي، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: « مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِيْنٍ يَسْتَحِقُّ بِهَا مَالًا وَهُوَ فِيْهَا فَاجِرٌ، لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ » فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَ ذٰلِكَ، ثُمَّ اقْتَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ إلى قوله: ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۷۷] »[1]

''میرے اور ایک شخص کے درمیان کنویں کے متعلق جھگڑا تھا تو ہم نے اپنا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے حضور پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم گواہ پیش کرو یا وہ قسم اٹھالے۔'' میں نے عرض کیا: وہ تو بے پروا قسم کا انسان ہے، اس بات پر قسم اٹھالے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی کسی کا مال ہتھیانے کے لیے جھوٹی قسم اٹھائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق نازل فرمائی۔ بعدازاں انھوں نے یہ آیت پڑھی:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۷۷]

''بے شک جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں تھوڑی قیمت کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ان کے ان الفاظ ''وہ تو بے پروا قسم کا انسان ہے، اس بات پر قسم اٹھا لے گا۔'' کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں: « لَيْسَ لَكَ مِنْهُ إِلَّا ذٰلِكَ »[2] ''تمھیں اس سے اس (قسم) کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔''

اِس کے علاوہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو جو

① أخرجه البخاري، كتاب الرهن، باب إذا اختلف الراهن والمرتهن، رقم الحديث (2515) ومسلم، كتاب الإيمان، باب وعيد من اقتطع حق مسلم، رقم الحديث: 220 (138)

② مسلم، كتاب الإيمان، باب وعيد من اقتطع حق مسلم، رقم الحديث: 223 (139)

خط لکھا تھا اس میں یہ بھی تھا: ''ثبوت مدعی کے ذمے ہے اور قسم اس پر ہے جو انکار کرے۔'' اور اسی اصول کی بنا پر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے لیے عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ دیا تھا اور ان دونوں نے انکار نہیں کیا تھا۔

بہت ہی اچھا ضابطہ:

ابن المنذر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اہلِ علم کا اِس بات پر اجماع ہے کہ ثبوتِ دلیل مدعی پر ہے اور قسم مدعا علیہ پر۔''

ان کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''ثبوت مدعی پر ہے۔'' کا معنی یہ ہے کہ مدعی ثبوت کی بنا پر اس چیز کا مستحق بن جاتا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ ثبوت واجب ہے اور اسے قبول کرنا ضروری ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''قسم مدعا علیہ پر ہے۔'' کا معنی یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ساتھ بری ہو جاتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ اس پر واجب ہے اور اسے ہر حال میں قبول کرنا ضروری ہے۔

ثبوت کے بغیر کوئی دعویٰ قابلِ قبول نہیں:

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ: ''تمھیں اس سے اس (قسم) کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔'' سے مراد عام نفی نہیں ہے، بلکہ خاص نفی ہے۔ اور وہ وہ چیز ہے جس کا ارادہ مدعی نے کیا کہ بات وہی ہے جو اس نے بغیر ثبوت کے کی ہے۔ تو مدعا علیہ اسے اس سے منع کرے گا اور اس کی بات کا انکار کر دے گا۔ اسی طرح حدیث کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ: ''قسم کھانا مدعا علیہ کے ذمے ہے۔'' سے مراد وہ قسم ہے جس میں کوئی گواہی نہ ہو۔ حدیث کا ابتدائی حصہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ (اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کے خون اور ان کے اموال پر دعویٰ کرنے لگیں گے۔) لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمے ہے۔'' اِس کی دلیل ہے کہ جب ثبوت نہ ہو تو قسم فریقین کے نزاع کو ختم کر دے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کے خون اور ان کے اموال پر دعویٰ کرنے لگیں گے۔'' اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خون اور مال کا دعویٰ کرنے والے شخص پر لازم ہے کہ وہ دلیلِ ثبوت پیش کرے جو اس کے دعوے کی تصدیق کرے۔

قسم اس پر ہے جو انکار کرے:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد: ''قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمے ہے۔'' اس بات کی دلیل ہے کہ ہر وہ شخص جس کے خلاف کوئی دعویٰ کیا گیا اور وہ اس سے انکار کر دے تو اس پر لازم ہے کہ وہ قسم اٹھائے۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مدعا علیہ پر قسم تب واجب ہوگی جب مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان ایک قسم کا اختلاط ہو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ سفہاء قسم کے لوگ رؤساء سے بھی قسم طلب کرنا شروع کر دیں۔

یاد رہے کہ بعض متقدمین کو اگر گواہوں کے بارے میں کوئی شک ہوتا تو وہ ان سے بھی قسم طلب کرتے تھے۔ ان میں قاضی بصرہ سوار العنبری رحمہ اللہ سرِ فہرست ہیں۔ اور حنابلہ میں سے قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے رضاعت پر گواہی دینے والی عورت سے قسم لینے کا حکم دیا تھا اور اسی پر امام احمد رحمہ اللہ کا عمل بھی ہے۔ جبکہ قرآن مجید بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ سفر میں وصیت کے بارے میں گواہوں کی گواہی میں شک ہو تو ان سے قسم لی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴾ [المائدة: ١٠٦]

''اے ایمان والو! اگر تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو وصیت کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے دو صاحبِ عدل گواہ بنا لے۔ اور اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور تمھیں موت آ لے تو دو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنا سکتے ہو۔ اگر تمھیں کچھ شک پڑ جائے تو ان دونوں کو نماز کے بعد (مسجد میں) روک لو۔ پھر وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم (کسی ذاتی مفاد کی خاطر) شہادت کو بیچنے والے نہیں، خواہ ہمارا کوئی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ نیز یہ کہ ہم اللہ (کی خاطر) گواہی کو نہیں چھپائیں گے اور اگر ایسا کریں تو ہم مجرم ہیں۔''

جمہور سلف کے نزدیک اِس آیت پر عمل منسوخ نہیں ہوا۔ سیدنا ابو موسیٰ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے اِس پر عمل کیا اور سیدنا علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فتویٰ بھی دیا اور یہی شریح، نخعی، ابن ابی لیلیٰ، سفیان، اوزاعی،

احمد اور ابوعبید رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سفر میں مسلمان کی وصیت کے بارے میں کفار کی شہادت بھی قبول کی جائے گی، تاہم گواہی کے ساتھ ان سے قسم بھی لی جائے گی۔

آپ ﷺ کا ارشاد: ''ثبوت مدعی کے ذمے ہے اور قسم مدعا علیہ پر ہے۔'' اِس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی شخص پر اس چیز کا دعویٰ کیا جائے جس کا وہ خود دعوے دار ہو اور وہ انکار کرتا ہو کہ وہ چیز مدعی کی ہے۔ اسی لیے حدیث کی ابتدا میں ہے: ''اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کے خون اور ان کے اموال پر دعویٰ کرنے لگیں گے۔''

رہا وہ شخص جو کسی ایسی چیز کا مدعی ہو جس کا کوئی اور اپنے لیے دعویدار نہ ہو اور اس کے دعوے کا کوئی انکار کرنے والا نہ ہو تو اس کا معاملہ پہلے شخص سے زیادہ آسان ہے، لیکن اس پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرے۔ تاہم اس قسم کے دعوے میں کسی ایسے ثبوت پر اکتفا کیا جا سکتا ہے جس پر پہلے شخص کے معاملے میں اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کے لیے کئی مسائل بطورِ شاہد پیش کیے جا سکتے ہیں، مثلاً:

① گری پڑی چیز، جب کوئی شخص آئے اور اس کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کے اوصاف بیان کر دے تو اسے وہ چیز بالاتفاق بغیر ثبوت کے نہیں دی جائے گی۔ تاہم بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اگر غالب گمان یہ ہو کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے وہ چیز دی جا سکتی ہے، دینا واجب نہیں ہے۔ یہ شافعی اور ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا قول ہے۔ جبکہ مالک اور احمد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اگر وہ صحیح اوصاف بتا دے تو اسے وہ چیز دینا واجب ہے۔

② غنیمت کا مال، اگر کوئی شخص آئے اور اس میں سے کسی چیز کا دعویٰ کرے کہ یہ اس کی تھی اور کفار نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور اس پر وہ ثبوت بھی پیش کرے تو اس پر اکتفا کیا جائے گا۔

خلال رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ رکین بن ربیع رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے بیان کیا: میرے بھائی کا ایک گھوڑا ''عین القمر'' میں تھک گیا تھا، تو اس نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر اس نے اسے سعد کے اصطبل میں دیکھا تو کہا: یہ میرا گھوڑا ہے۔ سعد نے کہا: کیا تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے؟ اس نے کہا: نہیں، لیکن میں اسے بلاتا ہوں، وہ اپنی آواز نکالتے ہوئے مجھے جواب دے گا۔ چنانچہ جب اس نے بلایا تو وہ آواز نکالنے لگا۔ تو سعد نے وہ گھوڑا اسے دے دیا۔ ہوسکتا ہے یہ گھوڑا دشمنوں کے پاس چلا گیا ہو، پھر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعد نے اسے گم شدہ گھوڑا سمجھ کر گم شدہ جانوروں میں شامل کر دیا ہو۔ تو اس کا حکم گری پڑی چیز کا ہے۔

فوائدِ حدیث:

1. ثبوت مدعی کے ذمے اور قسم مدعا علیہ پر ہے۔
2. ہر وہ شخص جس کے خلاف دعویٰ کیا گیا اور اس نے اس کا انکار کر دیا تو اس پر قسم اٹھانا لازم ہے۔
3. اسلام حقوق العباد کی حفاظت کرتا ہے۔
4. شک کی صورت میں گواہوں سے بھی قسم لی جا سکتی ہے۔
5. قسم کے معاملے کو ہلکا سمجھنا خطرناک امر ہے۔

سوالات:

1. کیا کفار کی گواہی قابل قبول ہے؟
2. «اَلْبَیِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِيْ» کا کیا معنی ہے؟
3. کیا گواہوں سے قسم طلب کی جا سکتی ہے؟ دلیل کے ساتھ جواب دیں۔



ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ

33 سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ»[1]

"تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ (کی طاقت) سے روکے۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے منع کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اسے برا جانے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔"

صحیح مسلم میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ فِيْ أُمَّةٍ قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّوْنَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ، وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ»[2]

"مجھ سے پہلے ہر امت میں اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اس کے کچھ نہ کچھ انصار و مددگار اور ساتھی ضرور ہوتے تھے، جو اس کے طرزِ عمل کو اختیار کرتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے۔ (اسی طرح میری امت میں بھی میرے انصار واصحاب موجود ہیں) پھر ان کے بعد ایسے نالائق لوگ آئیں گے جو وہ بات کہیں گے جس پر خود عمل نہیں کریں گے اور وہ کام کریں گے جس کا انھیں حکم نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا جو شخص ان سے اپنے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے گا

---

[1] أخرجه مسلم، كتاب الإيمان، باب كون النهي عن المنكر من الإيمان، رقم الحديث: 78 (49)

[2] أخرجه مسلم، كتاب الإيمان، باب كون النهي عن المنكر من الإيمان، رقم الحديث: 80 (50)

وہ مومن ہوگا۔ اور جو ان سے اپنی زبان کے ساتھ جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہوگا۔ اور جو ان سے اپنے دل کے ساتھ جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہوگا۔ اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں بچتا۔''

یہ دونوں احادیث اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اپنی طاقت کے مطابق انکارِ منکر واجب ہے۔ اور کم ازکم دل سے انکار کرنا ضروری ہے۔ جس شخص کا دل بھی منکر کا انکار نہ کرے تو یہ دلیل ہے اِس بات کی کہ اس کے دل سے ایمان جا چکا۔

ابو جحیفہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: سب سے پہلے تم جس جہاد کو چھوڑو گے وہ ہے: ہاتھوں کے ساتھ جہاد (یعنی ہاتھوں کی طاقت کے ساتھ برائی سے منع کرنا) پھر زبانوں کے ساتھ جہاد (یعنی زبانوں کے ساتھ برائی سے منع کرنا) اِس کے بعد دلوں کے ساتھ جہاد (یعنی دلوں سے برائی کو ناپسند کرنا) چنانچہ جس کا دل معروف کو نہ پہچانے اور منکر کو برا نہ سمجھے تو سمجھ لو کہ اس کا دل الٹا ہوگیا، اس کا اوپر والا حصہ نیچے اور نیچے والا اوپر ہوگیا۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ شخص ہلاک ہوگیا جس نے نیکی کا حکم نہ دیا اور برائی سے منع نہ کیا۔ تو انھوں نے کہا: وہ شخص ہلاک ہوگیا جس کے دل نے نہ معروف کو پہچانا اور نہ ہی برائی کو برا جانا۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مذکورہ قول میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دل سے معروف کو پہچاننا اور منکر کو برا جاننا فرض ہے اور یہ فرض کسی سے ساقط نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس نے ایسا نہیں کیا وہ ہلاک ہوگیا۔ جہاں تک ہاتھ اور زبان کے ساتھ انکارِ منکر کا تعلق ہے تو وہ حسبِ طاقت واجب ہوتا ہے۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اور قول یوں ہے:

''قریب ہے کہ تم میں سے جو شخص (لمبے عرصے تک) زندہ رہے، وہ کسی منکر کو دیکھ کر اس کو روکنے کے لیے کچھ بھی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، سوائے اِس کے کہ اللہ کو یہ پتا چل جائے کہ وہ اپنے دل سے اس منکر کو ناپسند کررہا ہے۔''

اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دل سے انکارِ منکر ہر حال میں ہر مسلمان پر فرض ہے۔

جہاں تک ہاتھ اور زبان کے ساتھ انکارِ منکر کا تعلق ہے تو وہ حسبِ طاقت ضروری ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي، ثُمَّ يَقْدِرُونَ عَلَى أَنْ يُغَيِّرُوا ثُمَّ لَا يُغَيِّرُوا، إِلَّا يُوشِكُ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ»[1]

''جس قوم میں معاصی کا ارتکاب کیا جاتا ہو، پھر وہ ان کو روکنے پر قادر ہوں مگر وہ نہ روکیں تو عین قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا عذاب ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔''

مسند احمد میں سیدنا عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کچھ خاص لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو عذاب نہیں دیتا، یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان برائی کو دیکھیں اور وہ اس سے روکنے پر قادر بھی ہوں پھر وہ اس سے نہ روکیں، چنانچہ جب وہ ایسے کریں گے تو اللہ تعالیٰ عام و خاص سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔''[2]

اسی طرح مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ بندے سے قیامت کے روز پوچھ گچھ کرے گا یہاں تک کہ وہ کہے گا: جب تم نے برائی کو دیکھا تھا تو اس سے منع کرنے سے تمھیں کس چیز نے روکا؟ پھر جب اللہ تعالیٰ اس کے دل میں اس کی حجت کا القا کرے گا تو وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے تجھ سے امید تھی (کہ تو مجھے معاف کر دے گا) اور لوگوں سے خوف تھا (کہ کہیں وہ مجھے سزا نہ دیں)۔''[3]

سنن ترمذی کی ایک روایت میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں یہ بھی ارشاد فرمایا:

«أَلَا لَا يَمْنَعَنَّ رَجُلًا هَيْبَةُ النَّاسِ أَنْ يَقُولَ بِحَقٍّ إِذَا عَلِمَهُ قَالَ: فَبَكَى أَبُو سَعِيدٍ، وَقَالَ: قَدْ وَاللّٰهِ رَأَيْنَا أَشْيَاءَ فَهِبْنَا»[4]

---

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، رقم الحديث (4338)

[2] مسند أحمد (192/4)

[3] مسند أحمد (29/3) سنن ابن ماجه، كتاب القدر، باب قوله تعالىٰ: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ﴾، رقم الحديث (4017)

[4] سنن الترمذي، كتاب الفتن، باب ما جاء ما أخبر النبي ﷺ أصحابه، رقم الحديث (2191)، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، رقم الحديث (4007)

''خبردار! کسی آدمی کو لوگوں کی ہیبت حق کہنے سے روک نہ دے، جب کہ اسے (حق) معلوم ہو۔ یہ کہہ کر حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا: قسم ہے اللہ کی! ہم نے کئی (غلط) چیزیں دیکھیں لیکن (اظہار کرنے سے) ڈر گئے۔''

اسی حدیث کی مسند احمد کی روایت میں درج ذیل الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

«فَإِنَّهُ لَا يُقَرِّبُ مِنْ أَجَلٍ وَلَا يُبَاعِدُ مِنْ رِزْقٍ أَنْ يُقَالَ بِحَقٍّ وَّ يُذَكَّرَ بِعَظِيمٍ»[1]

''حق بات کہنا یا عظیم الشان اللہ کی یاد دلانا نہ تو موت سے قریب کرتا ہے اور نہ ہی رزق سے دور کرتا ہے۔''

اسی طرح مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَحْقِرُ أَحَدُكُمْ نَفْسَهُ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ كَيْفَ يَحْقِرُ أَحَدُنَا نَفْسَهُ؟ قَالَ: «يَرَى أَمْرًا لِلّٰهِ عَلَيْهِ فِيهِ مَقَالٌ، ثُمَّ لَا يَقُولُ فِيهِ، فَيَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: مَا مَنَعَكَ أَنْ تَقُولَ فِي كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُولُ: خَشْيَةَ النَّاسِ، فَيَقُولُ: فَإِيَّايَ كُنْتَ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَى»[2]

''کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔ صحابہ نے کہا: اللہ کے رسول! کوئی شخص اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ایسا کام ہوتا دیکھتا ہے جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے اس پر بولنا ضروری ہوتا ہے، پھر وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرتا (اور غلط کام سے منع نہیں کرتا) اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھے فلاں مسئلے میں بات کرنے سے کیا رکاوٹ تھی؟ وہ کہے گا: لوگوں کا خوف تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیرا زیادہ حق مجھ سے ڈرنے کا تھا۔''

یہ دونوں حدیثیں اس بات پر محمول ہیں کہ انکارِ منکر سے مانع صرف ہیبت ہو، نہ کہ ایسا خوف ہو جو انکارِ منکر کو سرے سے ساقط ہی کر دے۔

---

[1] مسند احمد (50/3) سند میں انقطاع کی وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

[2] مسند أحمد (47/3) سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، رقم الحديث (4008)

بادشاہ پر انکارِ منکر کیسے ہوگا؟:

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا میں بادشاہ کو نیکی کا حکم دوں اور برائی سے منع کروں؟ تو انھوں نے کہا: اگر تمھیں خوف ہو کہ وہ تمھیں قتل کر دے گا تو پھر نہیں۔ میں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو انھوں نے پھر بھی وہی جواب دیا۔ میں نے سہ بارہ یہی سوال کیا تو انھوں نے پھر بھی وہی جواب دیا اور فرمایا: اگر تمھیں ضرور ہی انکارِ منکر کرنا ہو تو بس اپنے اور اس کے درمیان کر۔

ہم اس سے پہلے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کر چکے ہیں، جس میں ہے کہ ''پھر ان کے بعد ایسے نالائق لوگ آئیں گے جو وہ بات کہیں گے جس پر خود عمل نہیں کریں گے اور وہ کام کریں گے جس کا انھیں حکم نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا جو شخص ان سے اپنے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے گا وہ مومن ہوگا ....'' تو یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حکام کے خلاف جہاد بالید کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ ابو داود کی روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ان احادیث کے خلاف ہے جن میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمرانوں کے ظلم پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ تاہم اِس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ تغییر بالید قتال کو مستلزم نہیں ہے۔

چنانچہ صالح کی روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ نے نصاً کہا ہے کہ تغییر بالید تلوار اور اسلحے کے ساتھ نہیں ہوتی۔ لہٰذا حکام کے خلاف جہاد بالید اِس طرح ہوگا کہ انھوں نے جو منکرات کیے ہوں انھیں ہاتھ کے ساتھ ختم کر دیا جائے۔ مثلاً: ان کی شراب کو بہانا، یا ان کے آلاتِ لہو ولعب کو توڑنا وغیرہ۔ یا اگر انھوں نے کسی پر ظلم کرنے کا حکم دیا ہو تو وہ اگر قدرت رکھتا ہو تو ان کے اس حکم پر عمل روک دے۔ یہ سب جائز ہے، کیونکہ یہ نہ تو ان سے قتال ہے اور نہ ہی ان پر خروج ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہی ہو سکتا ہے کہ حاکم اس اکیلے شخص کو قتل کر دے جو اس کے احکامات کے خلاف کام کر رہا ہو۔ رہا حکام پر تلوار کے ساتھ خروج تو اس میں فتنے کا اندیشہ ہوتا ہے جس میں بے گناہ مسلمانوں کا خون بہہ جاتا ہے۔ ہاں اگر بادشاہوں پر انکارِ منکر کی وجہ سے اسے یہ ڈر ہو کہ وہ اس کے اہلِ خانہ یا پڑوسیوں کو ایذا پہنچائیں گے تو پھر اسے اس سے بچنا چاہیے، تاکہ اس کی وجہ سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے۔ یہی بات فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے کہی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب ساقط ہوتا ہے؟:

ہم نے ابھی جو کچھ ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ جب ایک شخص حکمرانوں سے تلوار، یا کوڑے، یا جیل میں قید ہونے، یا جلا وطن ہونے یا مال پر قبضہ ہونے جیسی سزاؤں کا ڈر محسوس کرے تو انھیں نیکی کا حکم دینا یا برائی سے منع کرنا ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ بات کئی ائمہ نے نصاً کہی ہے، ان میں امام مالک، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ وغیرہ سرفہرست ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: بادشاہ سے تعرض نہ کرنا، کیونکہ اس کی تلوار ہر وقت لٹکتی رہتی ہے۔

ابن شبرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جہاد کی مانند ہے، ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ ان دونوں کاموں پر صبر وہمت کا مظاہرہ کرے اور ان سے فرار کرنا اس پر حرام ہے۔ اگر اسے حاکم کی طرف سے گالی گلوچ یا برا بھلا کہنے کا ڈر ہو تو اس سے انکارِ منکر ساقط نہیں ہوتا۔ اگر وہ اس کی طرف سے ایذا کو برداشت کر سکتا ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔''

یہ بات امام احمد رحمہ اللہ نے نصاً کہی ہے۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ''مومن کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔''؟[1] یعنی وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہ ڈالے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو، تو انھوں نے کہا: اِس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی اِس بات کی دلیل سنن ابی داود میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ»[2]

''سب سے بہتر جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔''

جہاں تک اِس حدیث کا تعلق ہے کہ (مومن کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کرے) تو یہ صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مومن کو جب یہ معلوم ہو کہ وہ اذیت برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو تب وہ امر بالمعروف چھوڑ دے اور یہ بات برحق ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ وہ اِس سلسلے

---

[1] الكامل لابن عدي (5171) اس کی سند ضعیف ہے۔

[2] أبو داود، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، رقم الحديث (4344)

میں آنے والی اذیت کو برداشت کر سکتا ہے تو پھر اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہیے۔ یہی بات ائمۂ کرام، مثلاً: سفیان، احمد اور فضیل بن عیاض رحمہم اللہ وغیرہ نے کہی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ اِس قسم کی صورت حال میں منکر کو دل سے برا جاننا ہی کافی ہے۔ جب کہ ابو داود کی روایت میں یہ ہے کہ اگر وہ دل سے برا جانے تو وہ محفوظ ہو گیا اور اگر وہ ہاتھ سے برائی کو روک دے تو یہ افضل ہے۔ قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ سے اس شخص کے بارے میں دو روایتیں نقل کی ہیں جس کو پتا ہو کہ اگر وہ انکارِ منکر کرے گا تو اس کی بات کو قبول نہیں کیا جائے گا، تب بھی اس پر انکارِ منکر واجب ہے۔ قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ نے اِس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور یہی اکثر علماء کا نظریہ بھی ہے۔

بعض سلف سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو جواب ملا: تاکہ آپ کے پاس عذر ہو کہ آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں خبر دی ہے جنھوں نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کرنے والوں کو منع کیا تھا تو کسی نے ان سے کہا:

﴿ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۗ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٦٤]

”تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کر رہے ہو جنھیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا یا انھیں سخت سزا دینے والا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: تمھارے رب کے ہاں عذر پیش کرنے کے لیے اور شاید وہ باز آ جائیں۔“

جب یہ پتا ہو کہ میرے انکارِ منکر پر نہ تو میری بات قبول کی جائے گی اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ ہو گا تب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سقوط پر ایک حدیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے جو سیدنا ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے کہا گیا: آپ اِس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ ﴾ [المائدة: ١٠٥]

”اے ایمان والو! تم بس اپنا خیال رکھو، اگر تم خود ہدایت پا چکے تو جو شخص گمراہ ہو جائے وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

تو انھوں نے جواب دیا: تم نے ایک باخبر شخص سے سوال کیا ہے .... اللہ کی قسم! خود میں نے اسی آیت کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«بَلِ ائْتَمِرُوا بِالْمَعْرُوفِ، وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتَّى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا، وَهَوًى مُتَّبَعًا، وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكَ ـ يَعْنِي: بِنَفْسِكَ، وَدَعْ عَنْكَ الْعَوَامَّ»[1]

''بلکہ تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو حتی کہ جب دیکھو کہ حرص اور بخیلی کی اتباع ہونے لگی ہے، لوگ خواہشاتِ نفسانی کے درپے ہو گئے ہیں اور دنیا ہی کو ترجیح دینے لگے ہیں (آخرت کو بھول گئے ہیں) اور ہر رائے والا اپنی رائے ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ (اس پر خوش اور اصرار کرتا ہے) تو پھر اپنے آپ کو لازم پکڑ لو اور عوام کی فکر چھوڑ دو (دوسروں کی گمراہی تمھیں نقصان نہیں دے گی)۔''

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اِس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ ابھی اس پر عمل کرنے کا وقت نہیں آیا، وہ وقت قیامت کے قریب آئے گا۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''جب دلوں اور چاہتوں میں اختلاف ہو، جب تم ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاؤ اور جب تم ایک دوسرے کو لڑائی کا مزا چکھانے لگو تو اس وقت اِس آیت پر عمل کرنے کا وقت ہوگا۔ لہٰذا تب ہر انسان اپنے آپ کو ہی نیکی کا حکم دے۔''

بہر حال یہ اِس بات پر محمول ہے کہ جب انسان امر بالمعروف سے عاجز آ جائے اور اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس وقت یہ فریضہ اس سے ساقط ہو جائے گا۔

نبی ﷺ کا یہ ارشاد: «وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ» ''اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' اِس بات کی دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایمان کی خصلتوں میں سے ہے۔ نیز اِس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ایمان کی خصلتوں میں سے ایک خصلت پر قادر ہو وہ اس شخص سے بہتر ہے جو اسے اپنی بے بسی کی بنا پر چھوڑ دے۔

---

[1] أبو داود، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، رقم الحديث (4341) والترمذي، كتاب التفسير، باب من سورة المائدة، رقم الحديث (3058) وابن ماجه، كتاب الفتن، باب قوله تعالىٰ: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ﴾، رقم الحديث (4014) ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں دو راوی ضعیف ہیں اور وہ ہیں: عمرو بن جاریہ اور ابو امیہ الشعبانی۔

انکارِ منکر کا تعلق رؤیتِ منکر سے ہے:

نبی ﷺ کا یہ ارشاد: «مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا» ''تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے۔'' اِس بات کی دلیل ہے کہ انکارِ منکر کا تعلق رؤیت سے ہے۔ یعنی جو شخص برائی کو دیکھے وہ اس کا انکار کرے۔ لہٰذا اگر برائی پردے میں ہو اور وہ اسے نہ دیکھے تو اس کا انکار نہیں کرے گا۔ تاہم اگر اسے پتا چل جائے کہ فلاں جگہ پہ برائی ہو رہی ہے تو امام احمد رحمہ اللہ سے مروی اکثر روایات کے مطابق وہ اس سے تعرض نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ ایسی چیز کے بارے میں تفتیش کرے گا جس کے بارے میں اسے محض شک وشبہ ہو۔

اور اگر وہ حرام گانے یا ساز دسوز کے آلات کی آواز کو سنے اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے تو وہ اس کا انکار کرے گا، کیونکہ ایک برا عمل ہو رہا ہے اور اسے پتا چل چکا ہے کہ وہ کہاں ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے اسے دیکھ لیا ہو۔ یہ بات امام احمد رحمہ اللہ نے صراحتاً کہی ہے۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ اگر اسے اس برائی کا پتا نہ چلے کہ کہاں ہو رہی ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ رہا یہ کہ جس شخص کو کچھ لوگوں کے برائی پر جمع ہونے کا پتا چل جائے، پھر وہ دیواروں کو پھلانگ کر انکارِ منکر کے لیے ان کے ہاں پہنچ جائے تو اِسے کئی ائمہ (مثلاً: سفیان رحمہ اللہ وغیرہ) نے برا عمل کہا ہے، کیونکہ یہ ممنوع تجسس میں شامل ہے۔

قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ ''الأحكام السلطانية'' میں کہتے ہیں:

''اگر ایسی برائی ہو جس کو اس کے ظنِ غالب کے مطابق چھپایا جا رہا ہو اور اس کے بارے میں کوئی با اعتماد شخص اسے اطلاع دے کہ وہ برائی ہو رہی ہے اور اس میں عزت کی پامالی ہو، مثلاً: زنا۔ خون کی حرمت کو پامال کیا جا رہا ہو، مثلاً: قتل کی واردات ہو تو اس کے بارے میں تجسس کرنا اور جائے وقوعہ کا پتا چلانا جائز ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن حرمتوں کو پامال کیا جا رہا ہو ان کا بعد میں تدارک ہی نہ ہو سکے۔ اور اگر وہ برائی رتبہ میں اِس سے کم تر ہو تو اس کے بارے میں تجسس کرنا اور جائے واردات کا پتا چلانا جائز نہیں ہے۔''

جس منکر کا انکار کرنا ہو اس کی حدود:

''منکر'' جس کا انکار کرنا واجب ہے وہ منکر ہے جو بالاجماع منکر ہو۔ اور جس میں اختلاف ہو اس کے بارے میں حنابلہ میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ اس کا انکار واجب ہے جب اس منکر کا کرنے والا

اجتہاد کرتے ہوئے یا کسی مجتہد کی جائز تقلید کرتے ہوئے اسے کر رہا ہو۔ جب کہ قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ نے "الأحكام السلطانية" میں اس منکر کو مستثنیٰ کیا ہے جس میں کمزور قسم کا اختلاف ہو اور وہ کسی ایسے حرام کام کا ذریعہ بن سکتا ہو جس کے حرام ہونے پر علماء کا اتفاق ہو، مثلاً: ربا النقد، جس میں کمزور قسم کا اختلاف ہے اور وہ ربا النسیئہ کا ذریعہ بن سکتا ہے جس کے حرام ہونے پر اتفاق ہے۔ اسی طرح نکاحِ متعہ جو کہ زنا کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اسباب:

جان لیجیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر انسان کو کئی چیزیں آمادہ کر سکتی ہیں، مثلاً:

① اس کے ثواب کی امید۔

② اس کو چھوڑنے کی سزا کا خوف۔

③ اللہ کی محرمات کو پامال کرنے پر اللہ کی خاطر غضبناک ہونا۔

④ مومنوں کی خیر خواہی، ان پر ترس کھانا اور انھیں اللہ کے اس غضب اور دنیا و آخرت میں اس عذاب سے بچانے کی خواہش جس میں انھوں نے اپنے آپ کو واقع کر لیا ہو۔

⑤ اللہ تعالیٰ کی بزرگی، عظمت اور محبت، نیز اس بات کا احساس کہ اللہ تعالیٰ اِس بات کے لائق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ اسے یاد رکھا جائے اور بھلایا نہ جائے۔ اس کا شکر ادا کیا جائے اور اس کی ناشکری نہ کی جائے۔ اِس بات پر یقین ہو کہ وہ اپنی محرمات کے ارتکاب کا بدلہ جانوں اور مالوں میں نقصان کے ساتھ لے لیتا ہے۔ سلف صالحین میں سے ایک بزرگ سے منقول ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ پوری مخلوق اللہ کی فرمانبردار بن جائے چاہے میرے گوشت کو قینچیوں سے کاٹ دیا جائے۔

جو شخص خاص طور پر آخری دو باتوں کا لحاظ کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی خاطر جو تکلیف و اذیت پہنچتی ہے اس کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کے لیے دعا گو ہوتا ہے جس کی طرف سے اسے اذیت پہنچتی ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ کو جب ان کی قوم نے مارا تو آپ ﷺ اپنے چہرے سے خون صاف کرتے اور فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ»[1]

''میرے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو معاف فرما دے، کیونکہ وہ نہیں جانتے۔''

انکارِ منکر میں نرم رویہ:

انکارِ منکر میں بہر حال نرم رویہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صرف وہ شخص سرانجام دے سکتا ہے، جس میں تین خصلتیں ہوں:

① ۔امر اور نہی میں نرم رویہ اختیار کرنا۔

② ۔امر اور نہی دونوں میں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا۔

③ ۔امر اور نہی کا علم رکھنا۔

امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: لوگوں کو اِس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں بغیر سختی کے نیکی کی تلقین کی جائے اور ان سے نرمی برتی جائے۔ سوائے اس شخص کے جو اعلانیہ طور پر فاسق وفاجر ہو تو اس کی کوئی عزت نہیں ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد جب ایسے لوگوں سے گزرتے تھے جن سے وہ کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھتے تو ان سے کہتے: اللہ تم پہ رحم کرے ٹھہر جاؤ، اللہ تم پہ رحم کرے رک جاؤ۔

امام احمد رحمہ اللہ کا مزید کہنا ہے کہ لوگوں کو نرمی اور عاجزی کے ساتھ نیکی کا حکم دینا چاہیے، اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں جو ناپسندیدہ ہو تو اس پر غصہ نہیں کرنا چاہیے، اگر وہ غصہ کرے گا تو اپنی ذات کے لیے بدلہ لینے پہ تل جائے گا۔ واللہ اعلم

فوائدِ حدیث:

1. منکر سے روکنا واجب ہے، چاہے کسی بھی طریقے سے ہو۔
2. امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔
3. کوئی شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں تو اِس سے

[1] صحيح ابن حبان (254/3)، رقم الحديث (973) و أصله في الصحيحين ولكن أخبر به عن نبي من الأنبياء۔ البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب (54)، رقم الحديث (3477) ومسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة أحد، رقم الحديث: 105 (1792)

یہ فریضہ ساقط نہیں ہو جاتا، بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ اِس پر عمل کرے، کیونکہ یاد دہانی مومنوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

4. امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تجسس کرے اور گھروں میں زبردستی گھس جائے۔ ہاں جن محرمات کا ارتکاب علی الاعلان کیا جا رہا ہو ان پر امر و نہی ضرور کرے۔

5. امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے شخص پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ نرمی برتے تاکہ اصل ہدف کا حصول قریب سے قریب تر ہو۔

6. برائی کو اگر دل سے بھی برا نہ جانا جائے تو یہ ایمان کے چلے جانے کی دلیل ہے۔

سوالات:

1. امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط کیا ہیں؟
2. اِس حدیث اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟
3. تجسس کب جائز ہوتا ہے؟
4. امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تین اسباب ذکر کریں۔
5. نبی ﷺ کا ارشاد: «وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ» ''اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' کس بات کی دلیل ہے؟
6. حدیث کے فوائد ذکر کریں۔



اسلامی اخوت کے تقاضے

(34) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ، اَلتَّقْوٰى هَاهُنَا» وَيُشِيْرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ «بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ»[1]

”ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے لیے دھوکے سے قیمتیں نہ بڑھاؤ، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، تم میں سے کوئی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے اور اللہ کے بندے بن جاؤ جو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان (دوسرے) مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے یارو مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ کیا، (پھر فرمایا):

”کسی آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، ہر مسلمان پر (دوسرے) مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہیں۔“

حسد کے حوالے سے لوگوں کی قسمیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: «لَا تَحَاسَدُوْا» ”ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔“

”حسد“ لوگوں کی فطرت میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک انسان اِس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس جیسا کوئی اور انسان کسی بھی معاملے میں اس سے فوقیت لے جائے۔

---

[1] أخرجه مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم، رقم الحديث: 32 (2564)

پھر اِس کے بعد لوگوں کی اس میں کئی قسمیں ہیں:

1. حسد کرنے والا جس سے حسد کر رہا ہو اپنے قول وفعل کے ساتھ اس پر ظلم کرتے ہوئے اس کو ملی ہوئی کسی نعمت کو ختم کرنے کے لیے کوشش کرے۔
2. جو اس نعمت کو اپنی طرف منتقل کرنے کے لیے کوشش کرے۔
3. جو اس نعمت کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہو، خواہ وہ نعمت اسے ملے یا نہ ملے۔ یہ سب سے برا اور سب سے گندا انسان ہے۔ اور یہی مذموم حسد ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور یہی ابلیس کا گناہ بھی تھا، کیونکہ وہ آدم علیہ السلام سے تب حسد کرنے لگا جب اس نے دیکھا کہ وہ فرشتوں پر فوقیت لے چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا، انھیں ہر چیز کے ناموں کی تعلیم دی اور انھیں اپنے پڑوس میں رہائش دی۔ چنانچہ وہ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوانے کی کوشش میں لگ گیا یہاں تک کہ انھیں وہاں سے نکال دیا گیا۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''ابلیس نے نوح علیہ السلام سے کہا کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعے میں بنو آدم کو ہلاک کروں گا: ایک تو حسد ہے، جس کی وجہ سے مجھ پر لعنت کی گئی اور مجھے مردود شیطان بنا دیا گیا۔ دوسری چیز لالچ ہے، آدم کے لیے پوری جنت کھول دی گئی، لیکن میں نے اسے لالچ دے کر وہاں سے نکلوا دیا۔''

4. لوگوں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو کسی سے حسد تو کرتے ہیں لیکن اس کے مطابق کچھ عمل نہیں کرتے، اور نہ ہی وہ جس سے حسد کر رہے ہوتے ہیں اس پر اپنے قول وفعل کے ذریعے ظلم کرتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایسا شخص گناہ گار نہیں ہوتا۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی: اس کے لیے حسد سے بچنا ممکن ہی نہیں ہوتا اور وہ خود اس سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص گناہ گار نہیں ہوتا۔

دوسری: جو خود اپنے اختیار سے اپنے دل میں حسد کرتا ہے، پھر بار بار اس کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے بھائی کی نعمت کے ختم ہونے کی تمنا کرتا ہے، تو یہ شخص ویسا ہی ہے جیسے کوئی شخص برائی کا عزم مصمم کر لے۔

5 وہ جس سے حسد کر رہا ہو اس کی نعمت کے ختم ہونے کی تمنا نہ کرے، بلکہ اس جیسی نعمت کے حصول کے لیے خود اپنے لیے کوشش شروع کر دے اور اِس بات کی تمنا کرے کہ وہ بھی اس جیسا ہو جائے۔

چنانچہ اگر وہ دنیاوی چیز ہو تو اس میں کوئی خیر نہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ [القصص: ۷۹]

''وہ لوگ جو دنیا کی زندگی چاہتے تھے، کہنے لگے: کاش کہ ہمارے لیے بھی ویسے ہی خزانے ہوں جیسے قارون کو دیے گئے ہیں، وہ تو یقیناً بڑے نصیبوں والا ہے۔''

اور اگر وہ دینی چیز ہو تو یقیناً اچھی بات ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے اپنے لیے اللہ کے راستے میں شہادت پانے کی تمنا کی۔

اور صحیحین میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ»[1]

''دو چیزوں (خوبیوں) کے سوا کسی اور چیز میں حسد (رشک) کی گنجائش نہیں: ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت عنایت فرمائی، پھر وہ دن اور رات کی گھڑیوں میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے۔ اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا اور وہ دن اور رات کے اوقات میں اسے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتا ہے۔''

اسی کو ''رشک'' کہتے ہیں اور اسے ''حسد'' محض استعارہ کے طور پر کہا گیا ہے۔

6 جب ایک شخص محسوس کرے کہ وہ حسد کر رہا ہے تو اسے ختم کرنے کی کوشش کرے اور جس سے حسد کر رہا ہو اس کے ساتھ احسان والا معاملہ کرے، اس کے لیے دعا کرے، اس کی اچھی باتوں کو نشر کرے اور اپنے دل میں حاسدانہ جذبات کی جگہ پہ اس کے لیے محبت و پیار کے جذبات کو پیدا کرے، یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھ سے بہتر اور افضل ہے۔ یہ ایمان کے اعلیٰ درجات میں سے ہے اور ایمان کا یہ

[1] أخرجه مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فضل من يقوم بالقرآن، رقم الحديث: 266 (815) البخاري، كتاب العلم، باب الاغتباط في العلم، رقم الحديث (73) بمعناه.

درجہ جس شخص کے اندر پایا جاتا ہو وہی کامل ایمان والا شخص ہے کہ جو اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

یہ بات پہلے بھی حدیث نمبر: ۱۳ میں گزر چکی ہے۔

نجش اور اس کے بارے میں علماء کی آراء:

نبی ﷺ کا یہ ارشاد: « وَلَا تَنَاجَشُوا » ''ایک دوسرے کے لیے دھوکے سے قیمتیں نہ بڑھاؤ۔'' اس کی تفسیر زیادہ تر علماء نے خرید وفروخت کے معاملات میں نجش سے کی ہے، یعنی ایک شخص جو خریدار نہ ہو، بلکہ کسی چیز کی قیمت صرف اس لیے بڑھائے کہ یا تو بائع کو زیادہ قیمت مل جائے، یا خریدار کو زیادہ قیمت دے کر نقصان اٹھانا پڑے۔

صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ''نجش'' سے منع فرمایا۔[1]

سیدنا ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: دھوکا دینے کی خاطر کسی چیز کی قیمت کو بڑھانے والا شخص سود خور اور خائن ہے۔

ابن عبد البر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہلِ علم کا اِس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص اِس طرح کرتا ہے وہ اگر اِس کی ممانعت کو جانتا ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ تاہم ایسی بیع کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ وہ بیع فاسد ہے۔ یہ ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا موقف ہے اور ان کے شاگردوں کے ایک گروہ نے اسی رائے کو پسند کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اِس طرح کرنے والا شخص اگر خود بائع ہی ہو یا وہ ہو جس سے بائع نے ساز باز کر لی ہو تو بیع فاسد ہوگی، کیونکہ اِس صورت میں بیع کرنے والا شخص خود ممنوع عمل (نجش) کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو بیع فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ اِس صورت میں نجش کا ارتکاب کرنے والا شخص اجنبی ہے۔ یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے کہ جب بائع اور ہو اور نجش کا ارتکاب کرنے والا کوئی دوسرا ہو تو بیع درست ہوگی۔ جبکہ اکثر فقہاء اِس بات کے قائل ہیں کہ ایسی بیع درست ہے۔

امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ بھی اس بیع کو درست قرار دیتے ہیں۔ تاہم مالک اور احمد رحمہما اللہ خریدار کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر لاعلمی میں اس سے سنگین

[1] البخاري، كتاب الحيل، باب ما يكره من التناجش، رقم الحديث (6963) ومسلم، كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه، رقم الحديث: 13 (1516)

قسم کا دھوکا ہو جائے جو عموماً اس کے ساتھ نہیں ہوتا اور اسے بعد میں پتا چلے کہ دھوکا ہو گیا ہے تو وہ اگر چاہے تو اس بیع کو کینسل بھی کر سکتا ہے۔ اور امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ کے بعض شاگردوں نے نقصان کی تحدید قیمت کے تیسرے حصے کے ساتھ کی ہے، لہٰذا خریدار چاہے تو اس سودے کو کینسل کر سکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو خریدی ہوئی چیز کو اپنے پاس رکھے اور جتنے پیسوں کا نقصان ہو رہا ہو اتنے پیسے بائع کو نہ دے اور اگر پوری قیمت دے چکا ہو تو اتنے پیسے واپس لے لے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اِس حدیث میں جس نجش سے منع کیا گیا ہے اس کی تفسیر عمومی دھوکے کے ساتھ کی جائے، کیونکہ لغتِ عرب میں ''نجش'' بنیادی طور پر مکر وفریب، حیلہ سازی اور دھوکے کو کہتے ہیں۔ اسی سے اس شخص کو ''ناجش'' کہتے ہیں جو خرید وفروخت میں مکروفریب یا دھوکا دہی سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح شکاری کو بھی عربی زبان میں ''ناجش'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنا شکار حیلہ سازی اور دھوکا دہی سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اِس صورت میں حدیث کے الفاظ «وَلَا تَنَاجَشُوا» کا معنیٰ ہوگا: تم ایک دوسرے کو دھوکا نہ دو، مکروفریب اور حیلہ سازی نہ کرو جس کے ذریعے مسلمان کو اذیت پہنچائی جاتی ہے، خواہ براہِ راست ہو یا خرید وفروخت میں اسے نقصان پہنچا کر ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ﴾ [الفاطر: ٤٣]

''اور بری تدبیر اپنے کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں گھیرتی۔''

اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا، وَالْمَكْرُ وَالْخِدَاعُ فِي النَّارِ» [1]

''جس نے ہمیں دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں، مکروفریب اور دھوکا دہی کرنے والا جہنمی ہے۔''

لہٰذا وہ نجش جس سے منع کیا گیا ہے اس کی اِس تفسیر کے مطابق اِس میں وہ تمام معاملات شامل ہیں جن میں دھوکا ہوتا ہے۔ جیسا کہ عیبوں کو چھپانا، ردی قسم کی چیز کو عمدہ ظاہر کر کے بیچنا اور ایک عام سادہ آدمی جو خرید وفروخت کے اینچ پیچ کو نہ جانتا ہو اسے دھوکا دینا وغیرہ۔

ہر وہ قول وفعل جس کا نتیجہ عداوت اور بغض ہو وہ حرام ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: «وَلَا تَبَاغَضُوا» ''اور تم ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو'' اِس میں مسلمانوں

[1] مجمع الزوائد (78,79/4) وقال: رواه الطبراني في الكبير والصغير، ورجاله ثقات.

کو آپس میں ایک دوسرے سے بغض رکھنے سے منع کیا گیا ہے جو کہ اللہ کے دین کے معاملے میں نہیں بلکہ صرف نفسانی خواہشات کی بنا پر ہو، کیونکہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کا بھائی بھائی قرار دیا ہے۔ اور بھائی آپس میں محبت کرتے ہیں نہ کہ بغض رکھتے ہیں۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا، وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَوَ لَا أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ»[1]

''تم جنت میں داخل نہیں ہو گے یہاں تک کہ تم مومن ہو جاؤ، اور تم مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ ایک دوسرے سے محبت کرو، کیا تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اس پر عمل کرو تو ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے لگو؟ آپس میں سلام عام کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر ایسی تمام چیزیں حرام کر دی ہیں جن کی وجہ سے ان کے درمیان عداوت اور بغض پیدا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ ﴾ [المائدۃ: ۹۱]

''شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے۔''

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں الفت پیدا کر کے ان پر اس احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

''اور تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کر دی، اس کی اس نعمت کی بدولت تم بھائی بھائی بن گئے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴾ [الأنفال: ٦٣]

''اور اس نے ان کے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی، اگر آپ زمین میں جو کچھ ہے سب

---

[1] مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أنه لا یدخل الجنة إلا المؤمنون، رقم الحدیث: 93 (54)

خرچ کر دیتے تو ان کے دلوں کے درمیان الفت نہ ڈال سکتے، لیکن اللہ نے ان کے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی۔"

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے چغل خوری کو بھی حرام کر دیا ہے، کیونکہ اس سے بھی دشمنی اور بغض پیدا ہوتا ہے، جب کہ لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی خاطر جھوٹ بولنے کی اجازت دے دی ہے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی ترغیب دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ [النساء: ١١٤]

"ان کی زیادہ تر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس کے جو صدقہ کرنے یا نیک کام کرنے یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات: ٩]

"اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ [الأنفال: ١]

"لہٰذا تم اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔"

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ، وَالصَّلَاةِ، وَالصَّدَقَةِ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ: إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ: اَلْحَالِقَةُ» [1]

"کیا میں تمھیں روزے، نماز اور صدقے سے بڑھ کر افضل درجات کے اعمال نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس کے میل جول اور روابط کو بہتر بنانا۔ (اور اس کے برعکس) آپس کے میل جول اور روابط میں پھوٹ ڈالنا (دین کو) مونڈ دینے والی خصلت ہے۔"

[1] أخرجه أحمد في المسند (444/6)، أبو داود، كتاب الأدب، باب في إصلاح ذات البين، رقم الحديث (4919) والترمذي، كتاب صفة القيامة، باب منه: (56)، رقم الحديث (2508)

اللہ کے لیے بغض رکھنا ممنوع نہیں ہے:

جہاں تک اللہ کی رضا کے لیے کسی سے بغض رکھنے کا تعلق ہے تو یہ ایمان کے مضبوط کڑوں میں سے ایک ہے اور حدیث میں مذکور نہی میں شامل نہیں ہے۔

اگر ایک شخص کے لیے اپنے بھائی کی طرف سے کوئی برائی ظاہر ہو، پھر وہ اس سے بغض رکھے، اور اس کا وہ بھائی اس برائی کے معاملے میں ہو بھی معذور، تو اس سے بغض رکھنے والے شخص کو ثواب ملے گا اگرچہ اس کا بھائی معذور بھی ہو۔ جیسا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے تو ہم تمھیں پہچان لیتے تھے، کیونکہ وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے تمھارے بارے میں ہمیں آگاہ کر دیتے تھے، لیکن اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے اور وحی منقطع ہو چکی تو اب ہم تمھیں اسی چیز کے ساتھ پہچانتے ہیں جس کی ہمیں تمھارے بارے میں خبر ملتی ہے۔ خبردار! تم میں سے جو شخص ہمارے سامنے خیر کو ظاہر کرے گا ہم اس کے بارے میں اچھا گمان کریں گے اور اس پر اس سے محبت بھی کریں گے۔ اور تم میں سے جو شخص برائی کو ظاہر کرے گا ہم اس کے بارے میں برا گمان کریں گے اور اس پر اس سے بغض بھی رکھیں گے۔ تمھارے خفیہ معاملات تمھارے اور اللہ کے درمیان ہیں۔

ربیع بن خثیم کہتے تھے: ''اگر تم کسی بندے کو دیکھو جو خیر کو ظاہر کر رہا ہو اور شر کو چھپا رہا ہو تو تم اس سے محبت کرو، اللہ تعالیٰ خیر کی محبت کی بنا پر تمھیں اجر دے گا اور اگر تم کسی بندے کو دیکھو جو شر کو ظاہر کر رہا ہو اور خیر کو چھپا رہا ہو تو تم اس سے بغض رکھو، اللہ تعالیٰ شر سے بغض رکھنے کی بنا پر تمھیں اجر دے گا۔''

دین میں اختلاف آپس میں بغض پیدا کرنے کا ذریعہ ہے:

جب دین کے مسائل میں لوگوں کا اختلاف زیادہ ہوا اور وہ فرقوں میں بٹ گئے تو اس کی وجہ سے ان کے درمیان بغض بھی بڑھ گیا اور وہ ایک دوسرے کو لعنت بھیجنے لگے اور ان میں سے ہر ایک یہ ظاہر کرنے لگا کہ وہ محض اللہ کی خاطر بغض رکھتا ہے۔ اِس میں ہو سکتا ہے کہ وہ معذور ہو اور ہو سکتا ہے کہ معذور نہ ہو اور وہ اپنی نفسانی خواہش کا پیروکار ہو۔ جس چیز کی وجہ سے شرعاً بغض رکھا جا سکتا ہو؛ ہو سکتا ہے کہ اس کی معرفت حاصل کرنے میں اس سے کوتاہی واقع ہوئی ہو، کیونکہ زیادہ تر بغض تب رکھا جاتا ہے جب اس شخص کی مخالفت کی جائے جس کا وہ پیروکار ہو اور اس کے بارے میں اس کا گمان یہ ہو کہ وہ ہمیشہ حق بات ہی کرتا ہے۔ کسی کے بارے میں یہ گمان رکھنا یقیناً غلط ہے، خواہ اس کا یہ گمان صرف اختلافی مسائل کے

بارے میں ہی ہو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کے اِس گمان کا حامل صرف خواہشِ نفس کی پیروی کرنا یا عقیدت یا عادت ہو اور یہ تمام چیزیں اِس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس کا بغض اللہ کی خاطر نہیں ہے، لہٰذا مومن پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ سے خیر خواہی کرے اور اِس معاملے میں نہایت درجے کی احتیاط برتے اور جس چیز میں اسے اشکال واقع ہو اس میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو داخل نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بغض میں واقع ہو جائے جسے شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

تائید حق کی، نہ کہ مسلک کی:

یہاں ایک پوشیدہ بات ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ائمۂ دین میں سے کئی ائمہ بعض اوقات ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو ''دلیل کے اعتبار سے'' مرجوح ہوتا ہے، وہ چونکہ مجتہد ہوتے ہیں اس لیے انھیں اپنے اجتہاد پر اجر ملتا ہے اور ان کی غلطی کو معاف کر دیا جاتا ہے، لیکن جو شخص ان کے اس غلط موقف کی تائید کرتا ہے وہ ان کے درجے کا مجتہد نہیں ہوتا۔ وہ اس موقف کی تائید صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کا قائل وہ امام ہے جس کی وہ تقلید کرتا ہے۔ اگر کوئی اور امام ہوتا تو وہ اسے قبول کرتا اور نہ ہی اس کی تائید کرتا۔ نہ اس کی تائید کرتا اور نہ اس کی جو اس کی موافقت کرتا۔ اور جو اس کی مخالفت کرتا وہ اس سے دشمنی بھی نہ کرتا۔ اور وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اپنے امام کی قدر و منزلت کی بنا پر صرف حق کی تائید کر رہا ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے امام کا مقصد تو واقعتاً یہی تھا کہ وہ حق کی تائید کرے، اگرچہ اسے اجتہاد میں غلطی لگ گئی، لیکن اِس کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ بس اپنے امام کی برتری اور اس نے جو کچھ کہا اس کی بلندی کو برقرار رکھے اور اسے غلط نہ کہا جائے۔ اِس نے اسی چیز کو سامنے رکھتے ہوئے اسے حق سمجھ لیا جو اس کے امام نے کہی۔ یہ وہ خفیہ چیز ہے جس سے حق کی تائید کرنے کے قصد میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں، یہ بہت ہی اہم بات ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد: «وَلَا تَدَابَرُوا» ''تم ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو۔''

ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''تدابر'' سے مراد ہے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے چھوڑ دینا۔ یہ عربوں کی اِس بات سے ماخوذ ہے کہ فلاں آدمی اپنے ساتھی سے پیٹھ پھیر کر چلا گیا، یا منہ موڑ کر چلا گیا۔ اِس کو ''تقاطع'' بھی کہتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا تَقَاطَعُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَلَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَكُونُوا إِخْوَانًا كَمَا أَمَرَكُمُ اللّٰهُ »[1]

''ایک دوسرے سے قطع رحمی نہ کرو، ایک دوسرے سے روگردانی نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا ہے اللہ کے ایسے بندے بن جاؤ جو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

صحیحین میں حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ »[2]

''کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے (قطع تعلق کر کے رکھے کہ) دونوں ایک دوسرے سے ملیں تو یہ بھی منہ موڑ لے اور وہ بھی منہ موڑ لے۔ اور دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔''

یہ سب حدیثیں دنیاوی امور میں قطع تعلقی کے حوالے سے ہیں، جہاں تک دینی امور کا تعلق ہے تو ان میں تین دن سے زیادہ قطع تعلقی جائز ہے۔ اس پر امام احمد رحمہ اللہ کا موقف بالکل واضح ہے اور ان کی دلیل ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا واقعہ ہے جن کی توبہ کی قبولیت مؤخر کر دی گئی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کے نفاق کا خطرہ محسوس ہوا تو آپ نے ان سے تعلق ختم کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان کا یہ واقعہ صحیحین میں مروی ہے۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے بڑی بدعات اور نفسانی خواہشات کی طرف دعوت دینے والوں سے تعلقات ختم کرنا جائز قرار دیا ہے، جبکہ امام خطابی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ والد کا اولاد سے اور خاوند کا بیوی سے (اور ان جیسے دیگر افراد کا ماتحت لوگوں سے) تعلق ختم کرنا اگر ادب سکھلانے کی خاطر ہو تو تین دن سے زیادہ تک ایسا کرنا جائز ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے ایک ماہ کے لیے قطع تعلقی کر لی تھی۔[4]

---

[1] مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظن، رقم الحديث: 28 (2563)

[2] البخاري، كتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغير المعرفة، رقم الحديث (6237) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الهجر فوق ثلاث، رقم الحديث: 25 (2560)

[3] البخاري، كتاب التفسير، سورة براءة، باب ﴿ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ ... ﴾، رقم الحديث (4677) ومسلم، كتاب التوبة، باب توبة كعب بن مالك، رقم الحديث: 53 (2769)

[4] أخرجه أحمد في المسند (235/1)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد:

«وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ»

''تم میں سے کوئی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔''

اِس کے بارے میں بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں ایک دوسرے کے سودے پر سودا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَلَا يَبِيعُ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ وَلَا يَخْطُبُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ»[1]

''اور کوئی آدمی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ اپنے بھائی کی منگنی کے پیغام پر اپنی منگنی کا پیغام ہی بھیجے۔''

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«لَا يَسُمِ الْمُسْلِمُ عَلَى سَوْمِ أَخِيهِ»[2]

''کوئی مسلمان کسی مسلمان کے سودے پر سودا بازی نہ کرے۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صرف مسلمان کا حق ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کے سودے پر سودا نہ کرے۔ جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو وہ اس کے برابر نہیں، بلکہ مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ کافر کے سودے پر سودا کرسکتا ہے اور اس کی منگنی پر منگنی کرسکتا ہے۔ اسی طرح کافر کو مسلمان پر شفعہ کرنے کا حق بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ اوزاعی اور امام احمد رحمہ اللہ کا موقف ہے۔ جبکہ بہت سارے فقہاء کا موقف یہ ہے کہ نہی عام ہے، چاہے مسلمان ہو یا کافر، دونوں ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہیں کر سکتے۔ تاہم ان کا اِس بارے میں اختلاف ہے کہ نہی تحریمی ہے یا تنزیہی۔ بعض حنابلہ کا کہنا ہے کہ نہی تنزیہ کے لیے ہے نہ کہ تحریم کے لیے۔ لیکن صحیح بات، جسے جمہور علماء نے پسند کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نہی تحریم کے لیے ہے۔ نیز ان کا اِس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ کیا اپنے بھائی کی بیع پر بیع یا اس کی منگنی پر منگنی اگر ہو جائے تو کیا وہ صحیح مانی جائے گی یا فاسد؟ ابوحنیفہ رحمہ اللہ، شافعی رحمہ اللہ اور اکثر حنابلہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہوگی۔

امام مالک رحمہ اللہ نکاح کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر نکاح پر نکاح کرنے والے شخص نے عورت

---

[1] البخاري، كتاب البيوع، باب ولا يبع على بيع أخيه، رقم الحديث (2140) ومسلم، كتاب النكاح، باب تحريم الخطبة على خطبة أخيه، رقم الحديث: 50(1412)

[2] مسلم، كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه، رقم الحديث: 9(1515)

سے صحبت نہ کی ہو تو ان کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی۔ اور اگر وہ صحبت کر چکا ہو تو جدائی نہیں ڈالی جائے گی، جبکہ حنابلہ میں سے ابوبکر رحمہ اللہ بیع اور نکاح دونوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ بیع پر بیع اور نکاح پر نکاح باطل ہے۔ انھوں نے یہ بات امام احمد رحمہ اللہ سے بھی روایت کی ہے۔

اپنے بھائی کی بیع پر بیع کا معنی یہ ہے کہ ایک بندہ کسی سے کوئی چیز خرید چکا ہو، پھر دوسرا بندہ اس کو وہی چیز سستے ریٹ میں پیش کرے تا کہ وہ پہلا سودا کینسل کر کے اس سے خرید لے۔

نبی ﷺ کا ارشاد: «وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا»

''اور تم اللہ کے بندے بن جاؤ جو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

اِس سے پہلے نبی ﷺ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''تم اللہ کے بندے، بھائی بھائی بن کر رہو'' جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر مسلمان آپس میں حسد، نجش، بغض، قطع تعلقی اور ایک دوسرے کی بیع پر بیع کو ترک کر دیں تو وہ بھائی بھائی بن جائیں گے۔ نیز اِس میں ان چیزوں کا حکم بھی ضمناً آ جاتا ہے جن کے کرنے سے مسلمان آپس میں بھائی بھائی بن سکتے ہیں۔ مثلاً: مسلمان کے حقوق کو ادا کرنا، سلام کا جواب دینا جس شخص کو چھینک آئے اور وہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ'' کہے تو اسے ''یَرْحَمُكَ اللّٰہ'' کہنا، مریض کی عیادت کرنا، جنازے میں شریک ہونا، دعوت قبول کرنا، ملاقات کے وقت سلام کہنے میں پہل کرنا اور غائبانہ طور پر نصیحت و خیر خواہی کرنا۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے:

نبی ﷺ کا ارشاد:

«اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ»

''مسلمان (دوسرے) مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان سے ماخوذ ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٠]

''مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہی ہوتے ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔''

لہٰذا مومن جب آپس میں بھائی بھائی ہیں تو:

① وہ آپس میں ایک دوسرے کو ان چیزوں کی تلقین کرتے ہیں جن کے ذریعے ان کے دلوں میں الفت پیدا ہوتی ہے اور وہ اکٹھے رہتے ہیں اور وہ ان چیزوں سے منع کرتے ہیں جن سے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور اختلاف واقع ہوتا ہے۔

② ان میں سے ہر بندہ اپنے بھائی کو فائدہ پہنچاتا ہے اور اسے نقصان سے بچاتا ہے اور بڑے نقصانات میں سے ایک نقصان ظلم کرنا ہے جس سے ہر مسلمان بھائی کو بچانا ضروری ہے، بلکہ یہ مسلمان کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، ہر ایک پر ظلم کرنا حرام ہے اور ظلم کے بارے میں مکمل گفتگو حدیث نمبر:24 میں گزر چکی ہے جو کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ قدسی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں:

''اے میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر بھی حرام کر دیا ہے کہ میں کسی پر ظلم کروں اور تمھارے درمیان بھی اسے حرام قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا تم ایک دوسرے کو ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔''

③ کوئی مسلمان اپنے بھائی کو رسوا نہ کرے، کیونکہ مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائی کی مدد کرے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً » فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُومًا، أَفَرَأَيْتَ إِذَا كَانَ ظَالِماً كَيْفَ أَنْصُرُهُ؟ قَالَ: « تَحْجُزُهُ أَوْ تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَإِنَّ ذَلِكَ نَصْرُهُ »[1]

''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! جب وہ مظلوم ہوگا تو میں اس کی مدد کروں گا آپ کے خیال کے مطابق میں ظالم کی مدد کیسے کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس وقت تیرا اسے ظلم سے باز رکھنا ہی اس کی مدد کرنا ہے۔''

حضرت سہل صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس کے پاس ایک مومن کو ذلیل کیا گیا اور اس نے اس کی مدد نہ کی جبکہ وہ اس کی مدد کرنے پہ قادر تھا، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز تمام مخلوقات کے سامنے ذلیل کرے گا۔''[2]

④ مسلمان اپنے بھائی سے جھوٹ نہ بولے، کیونکہ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس سے جھوٹی بات کرے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے سچی بات کرے۔

---

① البخاري، كتاب الإكراه، باب يمين الرجل لصاحبه ....، رقم الحديث (6952)

② أخرجه أحمد في المسند (487/3)

5 مسلمان تکبر کرتے ہوئے اپنے مسلمان بھائی کو حقیر نہ سمجھے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْكِبْرُ، بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ»[1]

''تکبر، حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔''

اور ایک روایت میں اس کے الفاظ یوں ہیں: «اَلْكِبْرُ سَفَهُ الْحَقِّ وَازْدِرَاءُ النَّاسِ» اور دوسری روایت میں «وَغَمْصُ النَّاسِ» کے الفاظ ہیں، یعنی تکبر حق بات کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔[2]

«وَغَمْصُ النَّاسِ» سے مراد لوگوں پر طعنہ زنی کرنا اور انھیں اپنے سے حقیر جاننا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ﴾

[الحجرات: ١١]

''اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور اپنے لوگوں پر عیب نہ لگاؤ اور نہ ہی ایک دوسرے کو برے القاب کے ساتھ پکارو۔''

متکبر اپنے آپ کی طرف کمال کی آنکھ کے ساتھ دیکھتا ہے، جبکہ دوسروں کی طرف نقص کی آنکھ کے ساتھ دیکھتا ہے، پھر انھیں حقیر اور اپنے سے کم تر سمجھتا ہے۔ نیز انھیں اِس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان کے حقوق ادا کرے اور نہ ہی ان میں سے کسی کی طرف سے حق بات کو قبول کرتا ہے۔

دل کا مقام ومرتبہ:

نبی ﷺ کا ارشاد: «اَلتَّقْوَىٰ هَاهُنَا» وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. ''تقویٰ یہاں ہے۔ اور آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ کیا۔''

اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخلوق کی عزت وتکریم اللہ کے نزدیک تقویٰ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ لوگ جس کو اس کی کمزوری کی وجہ سے یا اس کے پاس دنیاوی مال ومتاع کم ہونے کی وجہ سے

---

1 مسلم، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر، رقم الحدیث: 147 (91)

2 أخرجه أحمد في المسند (399/1, 151/4)

حقیر سمجھتے ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ عزت واکرام کے لائق ہو۔تقویٰ کے اعتبار سے لوگوں میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣]

''اللہ کے نزدیک تم میں سب زیادہ عزت کے لائق وہ ہے جوتم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔''

• سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ أَكْرَمُ النَّاسِ؟ قَالَ: «أَتْقَاهُمْ لِلّٰهِ» ①

رسولِ اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ معزز کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو ان میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔''

تقویٰ کی بنیاد دل میں ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴾ [الحج: ٣٢]

''یہ اور جو اللہ کے نام کی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یقیناً یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

اور تقویٰ کا یہ معنی اِس سے پہلے حدیثِ قدسی نمبر: 24 میں ذکر کیا جا چکا ہے جو سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر تمھارے پہلے اور تمھارے آخری اور تمھارے جن وانس تم میں سے کسی سب سے زیادہ متقی کے دل کے مطابق بن جائیں تو یہ میری مملکت میں کچھ بھی اضافے کا باعث نہ ہوگا۔ جب تقویٰ کی بنیاد دلوں میں ہے تو اس کی حقیقت پر اللہ کے سوا کوئی مطلع نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ » وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ. ②

''اللہ تعالیٰ تمھارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمھاری صورتوں کو، بلکہ وہ تمھارے دلوں کی طرف دیکھتا ہے۔'' اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

① البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قوله تعالى: ﴿ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ ﴾ رقم الحديث (3383) ومسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل يوسف، رقم الحديث: 168 (2378)

② مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم، رقم الحديث: 34 (2564)

لہٰذا بعض اوقات یوں ہو سکتا ہے کہ کئی لوگ بظاہر خوبصورت ہوں، ان کے پاس مال اور منصب ہو، یا دنیاوی اعتبار سے جاہ و جلال ہو، لیکن ان کا دل تقویٰ سے خالی ہو۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے پاس یہ سب کچھ نہ ہو، لیکن اس کا دل تقویٰ سے بھرا ہوا ہو تو وہ یقیناً اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ معزز و مکرم ہوگا، بلکہ زیادہ تر لوگوں کا یہی حال ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں سیدنا حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعَّفٍ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ»[1]

''کیا میں تمھیں اہلِ جنت کی خبر نہ دوں؟ وہ دیکھنے میں کمزور و ناتواں لیکن اگر کسی بات پر قسم اٹھا لے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور پورا کر دیتا ہے اور کیا میں تمھیں اہلِ جہنم کی خبر نہ دوں؟ وہ سخت مزاج، بدخو اور تکبر کرنے والا ہے۔''

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« تَحَاجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ: أُوثِرْتُ بِالْمُتَكَبِّرِينَ وَالْمُتَجَبِّرِينَ، وَقَالَتِ الْجَنَّةُ: مَا لِيَ لَا يَدْخُلُنِي إِلَّا ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَسَقَطُهُمْ، قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لِلْجَنَّةِ: أَنْتِ رَحْمَتِي أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ مِنْ عِبَادِي، وَقَالَ لِلنَّارِ: إِنَّمَا أَنْتِ عَذَابِي أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ مِنْ عِبَادِي، وَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِلْؤُهَا»[2]

''جنت اور دوزخ نے باہمی تکرار کی۔ دوزخ نے کہا: میں تو متکبروں اور ظالموں کے لیے خاص کی گئی ہوں۔ جنت نے کہا: میرے اندر تو صرف کمزور اور ناتواں اور کم مرتبے والے لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے۔ میں تیرے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا رحم کروں گا۔ اور دوزخ سے کہا کہ تو میرا عذاب

---

[1] البخاري، كتاب التفسير، سورة نون، باب ﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ﴾ رقم الحديث (4918) ومسلم، كتاب الجنة، باب النار يدخلها الجبارون، رقم الحديث: 46(2853)

[2] البخاري، كتاب التفسير، سورة ق، باب ﴿وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ﴾ رقم الحديث (4850) ومسلم، كتاب الجنة، باب النار يدخلها الجبارون، رقم الحديث: 35(2846)

ہے، میں تیرے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہوں گا سزا دوں گا۔ بہرحال ان دونوں کو بھرنا ضرور ہے۔"

صحیح بخاری میں سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا تو آپ ﷺ نے اپنے پاس بیٹھنے والے شخص سے فرمایا: "اس آدمی کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟" اس نے جواب دیا: یہ معزز لوگوں میں سے ہے۔ اللہ کی قسم! یہ اس لائق ہے کہ اگر کسی کو پیغامِ نکاح بھیجے تو اس کا نکاح کر دیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر خاموش رہے۔ پھر ایک اور آدمی وہاں سے گزرا تو آپ ﷺ نے اس سے اس کے متعلق پوچھا: "اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا: اللہ کے رسول! یہ تو مسلمانوں کے غریب طبقے سے ہے۔ یہ اس لائق ہے کہ اگر کسی کو پیغامِ نکاح بھیجے تو اس سے نکاح نہ کیا جائے، اگر سفارش کرے تو قبول نہ کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کے ہاں یہ (محتاج) پہلے مال دار سے بہتر ہے، خواہ ایسے (مالدار) لوگوں سے زمین بھری ہوئی ہو۔"[1]

اور محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان: ﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ [الواقعۃ: ۱۔ ۲] کے متعلق کہتے ہیں: قیامت ان لوگوں کو نیچے کرے گی جو دنیا میں اونچے بنتے تھے اور ان لوگوں کو اونچا کرے گی جو دنیا میں نچلے طبقے کے لوگ سمجھے جاتے تھے۔

تکبر اور اس کے خطرناک نتائج:

نبی ﷺ کا ارشاد: «بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ» "کسی آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔" اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمان بھائی پر تکبر کرتے ہوئے اسے حقیر سمجھتا ہے اور تکبر برائی کی بڑی خصلتوں میں سے ایک ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ»[2]

"جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔"

---

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب فضل الفقر، رقم الحديث (6447)

[2] مسلم، كتاب الإيمان، باب تحريم الكبر وبيانه، رقم الحديث: 147، 149 (91)

اسی طرح ارشاد فرمایا:

«اَلْعِزُّ إِزَارُهُ وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَاؤُهُ فَمَنْ يُنَازِعُنِي عَذَّبْتُهُ»[1]

''عزت اللہ عزوجل کا تہبند ہے اور کبریائی اس (کے کندھوں) کی چادر ہے۔ جو شخص ان (صفات) کے معاملے میں میرے مدمقابل میں آئے گا، میں اسے عذاب دوں گا۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو اس کی مخلوق کے لائق ہی نہیں ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے مدمقابل آنا اتنی بڑی برائی ہے کہ اس کا برا ہونا کافی ہے۔

نیز صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا قَالَ الرَّجُلُ: هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ»[2]

''جب ایک شخص (یہ) کہتا ہے: لوگ ہلاک ہو گئے تو وہ ان میں سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہوتا ہے۔''

امام مالک رحمہ اللہ اِس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جب کوئی شخص لوگوں کی دینی پستی کو دیکھ کر اس پہ اپنے غم کے اظہار کے لیے ایسے کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر وہ خود پسندی کا شکار ہو کر لوگوں کو حقیر سمجھتے ہوئے ایسے کہے تو یہ وہ ناپسندیدہ بات ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔''

مسلمان کو کسی بھی صورت میں اذیت پہنچانا حرام ہے:

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ» ''ہر مسلمان پر (دوسرے) مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہیں۔'' آپ ﷺ لوگوں کے بڑے بڑے اجتماعات میں یہ ارشاد فرماتے تھے۔

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے دوران یومِ عرفہ، یوم النحر اور ایامِ تشریق کے دوسرے دن خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الكبر، رقم الحديث: 136 (2620)

[2] مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهي عن قول: هلك الناس، رقم الحديث: 139 (2623)

«فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ ـ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا»[1]

''بلاشبہ تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزت تمھارے لیے اسی طرح حرمت والے ہیں جس طرح اس مہینے میں، اس شہر میں تمھارا یہ دن حرمت والا ہے۔''

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں اس کے الفاظ یوں ہیں:

«فَإِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قَدْ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا»[2]

''بے شک اللہ تعالیٰ نے حقِ شرع کے سوا تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں تم پر حرام کر دی ہیں جیسا کہ اس دن کی حرمت اس شہر اور اس مہینے میں ہے۔''

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَأْخُذَنَّ أَحَدُكُمْ مَتَاعَ أَخِيهِ لَاعِبًا وَلَا جَادًّا، وَمَنْ أَخَذَ عَصَا أَخِيهِ فَلْيَرُدَّهَا»[3]

''تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی کوئی چیز ہرگز نہ لے، نہ ہنسی مذاق میں اور نہ حقیقت میں سچے طور پر اور جس نے اپنے بھائی سے (کوئی) لاٹھی (بھی) لی ہو تو اسے واپس کر دے۔''

ابوعبید رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''حدیث سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کا ساز و سامان چوری کے ارادے سے نہیں، بلکہ اس لیے اٹھائے کہ اسے غصہ دلائے، تو یہ بندہ چوری کے معاملے میں ہنسی مذاق کرنے والا اور اپنے بھائی کو ڈرانے اور اسے اذیت پہنچانے کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔ اِس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے۔''

صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] البخاري، كتاب المغازي، باب حجة الوداع، رقم الحديث (4406) ومسلم، كتاب القسامة، باب تغليظ تحريم الدماء، رقم الحديث: 29 (1679)

[2] البخاري، كتاب الحدود، باب ظهر المؤمن حمى، رقم الحديث (6785)

[3] مسند أحمد (221/4) وأبو داود، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيء على المزاح، رقم الحديث (5003) والترمذي، كتاب الفتن، باب ما جاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلما، رقم الحديث (2160)

«إِذَا كُنتُمْ ثَلَاثَةً، فَلَا يَتَنَاجَى رَجُلَانِ دُونَ الْآخَرِ حَتَّى تَخْتَلِطُوا بِالنَّاسِ، أَجْلَ أَنْ يُحْزِنَهُ»[1]

''جب تم تین آدمی ہو تو تیسرے ساتھی کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کیا کریں، کیونکہ ایسا کرنے سے تیسرے کو رنج ہوگا۔ اگر لوگ آپس میں ملے جلے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔''

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَتَدْرُونَ مَا الْغِيبَةُ؟» قَالُوا: اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ» قِيلَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ؟ قَالَ: «إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيهِ فَقَدْ بَهَتَّهُ»[2]

''کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟'' انھوں (صحابہ) نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول خوب جاننے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کا اس طرح تذکرہ کرنا جو اسے ناپسند ہو۔'' عرض کی گئی: آپ یہ دیکھیے کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات واقعی موجود ہو جو میں کہتا ہوں (تو؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کچھ تم کہتے ہو، اگر اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی، اگر اس میں وہ (عیب) موجود نہیں تو تم نے اس پر بہتان لگایا ہے۔''

یہ ساری نصوص اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسلمان کو کسی بھی طرح سے ناحق طور پر اذیت پہنچانا جائز نہیں ہے، نہ قولی اور نہ ہی فعلی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾

[الأحزاب: ٥٨]

''اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو بغیر کسی گناہ کے اذیت پہنچاتے ہیں تو انھوں نے بہتان اور واضح گناہ کا بوجھ اٹھا لیا۔''

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہی اس لیے ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر شفقت کریں اور ترس کھائیں۔

---

[1] البخاري، كتاب الاستئذان، باب إذا كانوا أكثر من ثلاثة، رقم الحديث (6290) ومسلم، كتاب السلام، باب مناجاة الاثنين دون الثالث، رقم الحديث: 38 (2184)

[2] مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الغيبة، رقم الحديث: 70 (2589)

صحیحین میں سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ، كَمَثَلِ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكَى عُضْوًا تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى»[1]

''تم اہلِ ایمان کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، آپس میں محبت کرنے اور ایک دوسرے سے شفقت کے ساتھ پیش آنے میں ایک جسم کی مانند دیکھو گے جس کے ایک عضو کو اگر تکلیف پہنچے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے، اس کی نیند اڑ جاتی ہے اور سارا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

ایک آدمی نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے کہا:

''آپ مسلمانوں میں سے بڑی عمر والے کو باپ، چھوٹی عمر والے کو بیٹا اور درمیانی عمر والے کو بھائی تصور کریں۔ اِس کے بعد کیا آپ ان میں کسی ایک سے برا سلوک کرنا پسند کریں گے؟''

یحییٰ بن معاذ الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''مومن کو تمھاری طرف سے تین باتیں نصیب ہونی چاہئیں: اگر تم اسے فائدہ نہ پہنچا سکو تو نقصان بھی نہ پہنچاؤ۔ اگر تم اسے خوش نہ کر سکو تو کم از کم پریشان بھی نہ کرو۔ اگر تم اس کی تعریف نہ کر سکو تو مذمت بھی نہ کرو۔''

فوائدِ حدیث:

1. نجش حرام ہے، کیونکہ اس میں دھوکا پایا جاتا ہے۔
2. وہ تمام امور ممنوع ہیں جن کے نتیجے میں مسلمانوں کے مابین فرقہ واریت پیدا ہو اور وہ کمزور ہوں۔
3. تدابر بغیر کسی شرعی عذر کے ممنوع ہے۔
4. اللہ تعالیٰ جسموں کی طرف نہیں بلکہ دلوں کی طرف دیکھتا ہے۔
5. حدیث مبارکہ میں دنیا اور اس کے ساز و سامان کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔
6. حدیث مبارکہ میں مسلمان کی عزت، جان اور اس کے مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔

[1] البخاري، كتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، رقم الحديث (6011) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم، رقم الحديث: 66(2586)

سوالات:

1. حسد کیا ہوتا ہے اور اس کے حوالے سے لوگوں کی کتنی قسمیں ہیں؟
2. نجش کے معنی کے بارے میں علماء کے اقوال ذکر کریں۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ اس بیع کا حکم کیا ہے جس میں نجش واقع ہوا ہو؟
3. ایک بیع پر دوسری بیع کیسے ہوتی ہے؟ اور اس کے حرام ہونے کی علت کیا ہے؟
4. تم اللہ کے بندے، بھائی بھائی بن کر رہو۔ اس کی روشنی میں بتائیں کہ مسلمانوں میں اخوت کے تقاضے کیسے پورے ہو سکتے ہیں؟
5. درج ذیل کلمات کے معانی ذکر کریں: "لَا یَظْلِمُہٗ، لَا یَخْذُلُہٗ، لَا یَکْذِبُہٗ، لَا یَحْقِرُہٗ"
6. تقویٰ یہاں ہے اِس کا حدیث میں ذکر کی گئی سابقہ باتوں سے کیا تعلق ہے؟



باہمی تعاون اور علم وعمل کی فضیلت

(35) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقاً يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيقاً إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللّٰهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ، وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ»[1]

’’جس شخص نے کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی، اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا اور جس شخص نے کسی تنگ دست کے لیے آسانی کی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اور جو شخص اس راستے پر چلتا ہے جس میں وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں لوگوں کا کوئی گروہ اکٹھا ہوتا ہے، وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کا درس و تدریس کرتے ہیں تو ان پر سکینت (اطمینان و سکونِ قلب) کا نزول ہوتا ہے اور (اللہ کی) رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین میں جو اس کے

[1] مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن، رقم الحدیث: 38 (2699)

پاس ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتا ہے اور جس کے عمل نے اسے (خیر کے حصول میں) پیچھے رکھا، اس کا نسب اسے تیز نہیں کر سکتا۔''

صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا نہ وہ اس پر ظلم کرے اور نہ اسے ظالم کے حوالے ہی کرے۔ اور جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری فرمائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبت دور کرے گا، نیز جو شخص کسی مسلمان کا عیب چھپائے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کرے گا۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد:

«مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

''جس شخص نے کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی، اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا۔''

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسا کہ مشہور کہاوت ہے: جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے۔ اور اِس قسم کی نصوص بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ»[2]

''اللہ اپنے بندوں میں سے رحم دل بندوں ہی پر رحم فرماتا ہے۔''

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

[1] البخاري، كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم، رقم الحديث (2442) ومسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم، رقم الحديث: 58 (2580)

[2] البخاري، كتاب الجنائز، باب قول النبي ﷺ: «يُعَذَّبُ الْمَيِّتُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ»، رقم الحديث (1284) ومسلم، كتاب الجنائز، باب البكاء على الميت، رقم الحديث: 11 (923)

«إِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ الَّذِيْنَ يُعَذِّبُوْنَ فِي الدُّنْيَا»[1]

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔''

''اَلْكُرْبَة'' سے مراد انتہائی سنگین بات جو انسان کو کرب میں مبتلا کر دے۔ اور ''نفس'' سے مراد اس کرب کو ہلکا کرنا ہے تاکہ وہ سکھ کا سانس لے سکے۔ جیسے کسی نے اگر کسی کا گلا گھونٹا ہوا ہو تو اسے اس سے چھڑانا اور رہائی دلانا تاکہ وہ سانس لے سکے۔ اس میں اور ''فرج'' میں فرق یہ ہے کہ ''تفریج'' ''تنفیس'' سے بڑی چیز ہے اور اس سے مراد ہے کسی کے کرب کو بالکل ہی ختم کر دینا کہ وہ پریشانی اور غم سے مکمل طور پر نجات پا جائے۔ تو تنفیس کا بدلہ بھی تنفیس ہے اور تفریج کا بدلہ بھی تفریج ہے۔

قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف کو دور کرنے میں حکمت:

نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کی ایک تکلیف دور کرنے کا ذکر فرمایا، دنیا اور آخرت کی تکلیفوں کا ذکر نہیں فرمایا، جیسا کہ اگلی دو باتوں (تیسیر اور ستر) کے بارے میں فرمایا۔ تو اِس کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کرب سے مراد بہت ہی بڑی مصیبتیں ہیں جو دنیا میں ہر ایک پر نہیں آتیں، جبکہ تنگ دستی اور وہ عیوب جن پہ پردہ پوشی کرنا مطلوب ہے دنیا میں کم ہی کوئی ایسا ہوگا جو ان سے بچ جائے، چاہے بعض ضروری کاموں کے مشکل ہونے کی صورت ہی میں کیوں نہ ہوں۔

نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تکلیفیں آخرت کی تکلیفوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ دنیا میں تکلیفوں کو دور کرنے کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ اپنے ہاں ذخیرہ کر لیتا ہے تاکہ اس کے ذریعے آخرت کی تکلیفوں کو دور کر دے۔

تنگ دست کے لیے آسانی کرنے کی فضیلت:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَمَنْ يَّسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ»

''اور جس شخص نے کسی تنگ دست کے لیے آسانی کی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا۔''

اِس میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ آخرت میں بھی تنگ حالی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یومِ قیامت

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوعيد الشديد لمن عذب الناس، رقم الحديث: 118 (2613)

کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ تنگ مشکل دن ہوگا، کافروں پر آسان نہیں ہوگا۔ یعنی کافروں کے علاوہ دیگر لوگوں (مومنوں) کے لیے آسان ہوگا۔ فرمایا:

﴿ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٦] ''اور کافروں پر وہ بہت مشکل دن ہوگا۔''

دنیا میں مال کے حوالے سے کسی تنگدست پر آسانی دو میں سے ایک طریقے سے ہوسکتی ہے: یا تو تنگدست کو اس کی آسانی تک مہلت دے دی جائے اور یہ واجب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ﴾ [البقرۃ: ٢٨٠]

''اور اگر وہ تنگ دست ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی ہوگی۔''

یا اگر اس پر چٹی پڑ جائے تو اسے معاف کر دیا جائے۔ ورنہ اسے اتنا مال دے دیا جائے کہ جس کے ساتھ اس کی تنگدستی ختم ہو جائے۔ اور ان دونوں باتوں کی بڑی فضیلت ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« كَانَ تَاجِرٌ يُدَايِنُ النَّاسَ فَإِذَا رَأَى مُعْسِرًا قَالَ لِفِتْيَانِهِ: تَجَاوَزُوْا عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهُ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا فَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُ »①

''ایک تاجر شخص لوگوں سے قرض کا لین دین کرتا تھا۔ جب وہ دیکھتا کہ کوئی تنگ دست آدمی ہے تو اپنے اہل کاروں سے کہتا کہ قرض معاف کر دو، شاید اللہ ہمیں معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر کا معاملہ فرمایا۔''

صحیح مسلم میں حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« حُوْسِبَ رَجُلٌ مِمَّنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَلَمْ يُوْجَدْ لَهُ مِنَ الْخَيْرِ شَيْءٌ، إِلَّا أَنَّهُ كَانَ يُخَالِطُ النَّاسَ، وَكَانَ مُوْسِرًا، فَكَانَ يَأْمُرُ غِلْمَانَهُ أَنْ يَتَجَاوَزُوْا عَنِ الْمُعْسِرِ، قَالَ: "قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: نَحْنُ أَحَقُّ بِذٰلِكَ مِنْهُ، تَجَاوَزُوْا عَنْهُ »②

''تم میں سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کا حساب لیا گیا تو اس کی کوئی نیکی نہ ملی، سوائے یہ کہ وہ لوگوں سے معاملات کرتا تھا اور وہ مالدار آدمی تھا۔ وہ اپنے خادموں کو حکم دیتا تھا کہ وہ

① البخاري، كتاب البيوع، باب من أنظر معسرا، رقم الحديث (2078) ومسلم، كتاب المساقاة، باب إنظار المعسر، رقم الحديث: 31 (1562)

② مسلم، كتاب المساقاة، باب إنظار المعسر، رقم الحديث: 30 (1561)

تنگ دست سے درگزر کریں۔ کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اس کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں، تم بھی اس سے درگزر کرو۔"

اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُنْجِيَهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَلْيُنَفِّسْ عَنْ مُعْسِرٍ، أَوْ يَضَعْ عَنْهُ»[1]

"جسے یہ بات اچھی لگے کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے نجات دے تو وہ تنگ دست کو سہولت دے یا اسے معاف کر دے۔"

مسلمان کی پردہ پوشی کرنا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ»

"جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔"

اِس جیسی اور بھی کئی نصوص موجود ہیں۔ جیسا کہ مسند احمد میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«وَمَنْ سَتَرَ مؤمِنا فِي الدُّنْيَا عَلَى عَوْرَةٍ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[2]

"جس شخص نے دنیا میں کسی مومن کے کسی عیب پر پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کرے گا۔"

سلف صالحین میں سے کسی سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے ایسے لوگ پائے جن میں کوئی عیب نہیں تھا، لیکن جب انھوں نے دیگر لوگوں کے عیب بیان کرنا شروع کیے تو انھوں نے اِن کے عیب بیان کرنا شروع کر دیے اور اِس کے برعکس میں نے ایسے لوگ بھی پائے جن میں کئی عیب تھے، لیکن انھوں نے دیگر لوگوں کے عیب بیان کرنے سے پرہیز کیا۔ اس کے نتیجے میں ان کے عیب بھی لوگوں کو بھلا دیے گئے۔ اِس کی تائید میں سیدنا ابوبرزہ رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ذکر کی جاسکتی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يَدْخُلِ الْإِيمَانُ قَلْبَهُ! لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِينَ، وَلَا

[1] مسلم، کتاب المساقاة، باب إنظار المعسر، رقم الحدیث: 32 (1563)

[2] مسند أحمد (159/4)

تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ، يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ، يَفْضَحْهُ فِي بَيْتِهِ »[1]

''اے وہ لوگو جو اپنی زبانوں سے ایمان لائے ہو مگر ایمان ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے! مسلمانوں کی بدگوئی نہ کیا کرو اور نہ ان کے عیبوں کے درپے ہوا کرو، بلاشبہہ جو ان کے عیبوں کے درپے ہوگا اللہ بھی اس کے عیبوں کے درپے ہوگا۔ اور اللہ جس کے عیبوں کے درپے ہو گیا تو اسے اس کے گھر کے اندر رسوا کر دے گا۔''

نافرمانیوں میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں:

جان لیجیے کہ لوگ دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم: جو شخص مستور ہو، یعنی اس کے عیبوں پہ پردہ پڑا ہوا ہو اور وہ نافرمانیوں کے ساتھ مشہور نہ ہو تو اِس قسم کے کسی فرد سے اگر کبھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے بیان کرنا اور اسے لوگوں کے سامنے بدنام کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اسی کو غیبت کہتے ہیں جو کہ حرام ہے۔ یہی وہ قسم ہے جس کے بارے میں درج بالا نصوص ذکر کی گئی ہیں اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾

[النور: ١٩]

''وہ لوگ جو یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیل جائے تو ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

اِس آیت میں بے حیائی کو پھیلانے سے مراد یہ ہے کہ جس مومن پر پردہ پڑا ہوا ہو، یا وہ بے گناہ ہو اور اس پر بے حیائی کی تہمت لگا دی گئی ہو تو ایسے شخص کے اوپر بے حیائی کا الزام لگا کے اسے بدنام کرنا، جیسا کہ واقعۂ افک میں ہے۔

کسی نیک وزیر نے امر بالمعروف کی ڈیوٹی سرانجام دینے والے شخص سے کہا تھا: تم کوشش کیا کرو کہ نافرمانوں پر پردہ ڈال دو، کیونکہ ان کی نافرمانیوں کو ظاہر کرنا تمام مسلمانوں کے لیے باعثِ شرم ہے۔ اور ذمہ داروں پر واجب ہے کہ وہ اِس قسم کے عیبوں پہ پردہ ڈالیں۔

---

[1] مسند أحمد (121/4) أبو داود، كتاب الأدب، باب في الغيبة، رقم الحديث (4880)

اِس جیسا انسان اگر توبہ وندامت کرتے ہوئے آئے اور وہ اسلامی سزا کا اقرار کرے، لیکن اس کی تفصیل ذکر نہ کرے تو اس سے اس کی تفصیل نہ پوچھی جائے، بلکہ اسے کہا جائے کہ تم لوٹ جاؤ اور اپنے آپ پر پردہ ڈال دو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ماعز اور غامدیہ کو حکم دیا تھا۔[1]

اور جیسا کہ آپ ﷺ نے اس شخص کو جس نے کہا تھا کہ میں نے ایک اسلامی سزا کا موجب بننے والے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، لہٰذا آپ مجھ پر وہ سزا نافذ کریں، اس سے اس گناہ کی کوئی تفصیل نہیں پوچھی تھی۔[2] اگر اِس جیسا انسان گرفتار کرلیا جائے تو جب تک اس کا معاملہ حکمران قاضی تک نہ پہنچ جائے تب تک اس کے بارے میں سفارش کی جاسکتی ہے تاکہ اس کا کیس حکمران قاضی تک نہ پہنچے۔ اور اسی جیسے شخص کے بارے ہی میں نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

«أَقِيلُوا ذَوِي الْهَيْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ إِلَّا الْحُدُودَ»[3]

''عزت دار لوگوں کی لغزشیں معاف کر دیا کرو سوائے اس کے کہ شرعی حدود ہوں۔''

دوسری قسم: جو شخص نافرمانیوں کے ساتھ مشہور ہو، کھلم کھلا برائیاں کرتا ہو اور کسی قسم کی پروا نہ کرتا ہو، چاہے اسے کچھ بھی کہا جائے تو یہ وہ اعلانیہ فاجر ہے جس کے بارے میں تحقیقات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاکہ اس پر اسلامی سزاؤں کو نافذ کیا جاسکے۔ اِس قسم کے شخص کے بارے میں گفتگو کرنا، یا اس کے معاملے کو ذمہ داران تک پہنچانا غیبت نہیں ہے۔ جیسا کہ حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''جس شخص کے بارے میں یہ بات مشہور ہو کہ وہ لوگوں کو اذیت نہیں پہنچاتا، تاہم کبھی کبھار اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کے حق میں سفارش کرنا درست ہے، جب تک کہ اس کا معاملہ حکمران قاضی تک نہ پہنچے۔ اور جو شخص شر وفساد کے ساتھ مشہور ہو چکا ہو تو اس کے بارے میں سفارش کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ لہٰذا اسے چھوڑ دیا جائے تاآنکہ اس پر سزا نافذ کر دی جائے۔'' اسے امام ابن المنذر رحمہ اللہ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنا، رقم الحدیث: 22 (1695)

[2] البخاري، کتاب الحدود، باب إذا أقر بالحد ولم یبین، رقم الحدیث (6823) ومسلم، کتاب التوبة، باب قول الله تعالی: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾، رقم الحدیث: 44 (2764)

[3] مسند أحمد (181/6) أبوداود، کتاب الحدود، باب في الحد یشفع فیه، رقم الحدیث (4375)

اور امام احمد رحمہ اللہ نے فاسقوں کے ہر معاملے کو بادشاہ تک پہنچانا ناپسند کیا ہے، کیونکہ بادشاہ عموماً سزا ویسے نافذ نہیں کرتے جیسے کرنی چاہیے۔ پھر انھوں نے ایک آدمی کا ذکر کیا جس کو سزا کے طور پر مار مار کر قتل کر دیا گیا تھا، حالانکہ اسے قتل کرنا جائز نہیں تھا۔ تاہم اگر یہ یقینی امر ہو کہ بادشاہ اس مجرم پر سزا کما حقہ نافذ کرے گا تو اس کا معاملہ بادشاہ تک ضرور پہنچانا چاہیے۔

مسلمان ہمیشہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ»

''اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔''

اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے:

«وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ»

''اور جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا کرتا رہتا ہے۔''

اِس سے پہلے حدیث نمبر: 25 اور 26 میں لوگوں کی حاجتوں کو پورا کرنے اور اس کے لیے کوشاں رہنے کی فضیلت کا ذکر ہو چکا ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے اپنے شاگردوں میں سے کچھ لوگوں کو ایک آدمی کی حاجت کو پورا کرنے کے لیے بھیجا اور کہا: تم ثابت البنانی کو بھی ساتھ لیتے جانا۔ چنانچہ وہ جب ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے بتایا کہ میں تو اعتکاف کی حالت میں ہوں۔ وہ واپس حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس آئے اور انھیں آگاہ کیا کہ ثابت البنانی تو اعتکاف کی حالت میں ہیں۔ انھوں نے کہا: اسے جا کر کہو: کیا تم نہیں جانتے کہ تمھارا اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چل کر جانا ایک حج کے بعد دوسرے حج سے بہتر ہے؟ وہ ثابت البنانی کے پاس دوبارہ آئے اور انھیں آگاہ کیا تو وہ اپنا اعتکاف چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دیے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے جو سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی بیٹی نے بیان کیا۔ انھوں نے کہا: خباب رضی اللہ عنہ ایک لشکر کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اِس دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری

دیکھ بھال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ہماری ایک بکری سے ایک برتن میں دودھ نکالتے جو لبالب بھر جاتا تھا۔ پھر جب خباب رضی اللہ عنہ واپس لوٹے تو انھوں نے اسی بکری کا دودھ نکالا تو بس اتنا ہی نکلا جتنا وہ پہلے دیا کرتی تھی۔[1]

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے محلے کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے، پھر جب خلیفہ بن گئے تو ایک لڑکی کہنے لگی: اب ایسا نہیں کریں گے۔ انھوں نے کہا: کیوں نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ جو ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اس کی وجہ سے میں کوئی ایسا نیکی کا کام نہ چھوڑوں جو اِس سے پہلے کیا کرتا تھا۔

یاد رہے کہ وہ بکریوں کا دودھ اس لیے دوہا کرتے تھے کہ عربوں میں ان کی عورتیں ایسا نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ اسے ایک عیب تصور کیا جاتا تھا کہ عورتیں بکریوں کا دودھ دوہیں۔ جب ان کے مرد گھروں سے باہر ہوتے تو وہ اس آدمی کی محتاج ہوتیں جو ان کی بکریوں کو دودھ نکال کر انھیں دے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیوہ عورتوں کا خیال رکھتے تھے اور رات کے وقت انھیں پانی کے مشکیزے بھر بھر کے دیتے تھے۔

ابو وائل رحمہ اللہ اپنے محلے کی بوڑھی خواتین کے پاس جاتے اور ہر دن ان کی ضروریاتِ زندگی ان کے لیے خرید کر لاتے۔

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک سفر میں نکلا، تاکہ میں ان کی خدمت کر سکوں، تو بجائے اس کے کہ میں ان کی خدمت کرتا، وہ میری خدمت کرنے لگے۔

ایک آدمی کچھ لوگوں کے ساتھ جہاد کے لیے نکلا اور اس نے یہ شرط رکھی کہ وہ ان کی خدمت کرے گا۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی شخص جب اپنا سر دھونا چاہتا یا کپڑے دھونا چاہتا تو وہ کہتا: یہ میری شرط ہے، لہٰذا یہ کام میں ہی کروں گا۔ پھر وہ فوت ہوگیا۔ جب اسے غسل دینے کے لیے اس کے کپڑے اتارے گئے تو انھوں نے اس کے ہاتھ پر لکھا ہوا دیکھا: اہلِ جنت میں سے۔ انھوں نے جب غور سے دیکھا تو یہ الفاظ اس کے گوشت اور جلد کے درمیان لکھے ہوئے تھے۔

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں سے زیادہ بہتر سایہ جو کوئی کرتا، اپنا کمبل تان لیتا۔ جو لوگ روزے سے تھے وہ تو کوئی کام نہ کر سکے اور جن

[1] مسند أحمد (111/5)

حضرات نے روزہ نہیں رکھا تھا انھوں نے سواریوں کو اٹھایا اور دوسروں کی خوب خوب خدمت کی اور دوسرے تمام کام کیے۔ تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْأَجْرِ»[1]

''آج تو روزہ نہ رکھنے والوں نے اجر وثواب لوٹ لیا ہے۔''

علم جنت کا راستہ ہے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقاً يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيْقاً إِلَى الْجَنَّةِ»

''اور جو شخص اس راستے پر چلتا ہے جس میں وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔''

علم حاصل کرنے کے لیے راستے پر چلنے سے مراد ایک تو حقیقی راستہ ہے اور وہ ہے علمی مجالس کی طرف چل کر جانا۔ دوسرا اس سے مراد معنوی راستہ بھی ہے جو انسان کو حصولِ علم کی طرف پہنچاتا ہے۔ مثلاً: حفظ، مذاکرہ، مطالعہ، کتابت اور فہم وغیرہ۔ یہ تمام معنوی راستے ہیں جن کے ذریعے علم حاصل کیا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جنت کی طرف جانے والا راستہ آسان کر دیتا ہے۔'' تو ہوسکتا ہے کہ اِس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس علم کو آسان کر دیتا ہے جسے وہ طلب کرتا ہے اور اس کے راستے پر چلتا ہے، کیونکہ علم ایسا راستہ ہے جو جنت کی طرف پہنچاتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ [القمر: ۱۷]

''اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے۔ کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟''

سلف صالحین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اِس آیت کا معنی یہ ہے: کیا کوئی ہے جو علم کا طالب ہو، پھر اس کی اس پر مدد کی جائے؟ یعنی طلبِ علم کے معاملے میں طالب علم کی مدد کی جاتی ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جب طالب علم کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہو، نیز علم سے فائدہ اٹھانا اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اِس کاوش کو اس کی ہدایت کا

[1] البخاري، كتاب الجهاد، باب فضل الخدمة في الغزو، رقم الحديث (2890) ومسلم، كتاب الصيام، باب أجر المفطر في السفر، رقم الحديث: 100 (1119)

اور جنت میں داخلے کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور اس کے لیے دیگر علومِ نافعہ کا حصول بھی آسان کر دیتا ہے جو اسے جنت تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ جو شخص علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ان علوم کا وارث بنا دیتا ہے جو اس نے حاصل نہیں کیے ہوتے۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ نیکی کا ثواب اس کے بعد ایک اور نیکی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے:

﴿ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ﴾ [مريم: ٧٦]

''اور اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے جو ہدایت یافتہ ہوتے ہیں۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ﴾ [محمد: ١٧]

''اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہوجاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے اور انھیں ان کا تقویٰ بھی دے دیتا ہے۔''

نیز اِس حدیث کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طلبِ علم کے راستے پر چلنے سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت کی طرف جانے والا حسی راستہ آسان کر دے گا اور وہ ہے پل صراط اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کی ہولناکیاں۔ اس لیے کہ علم اللہ کے قریب کرنے والا سب سے قریب ترین راستہ ہے۔ لہٰذا جو شخص اس راستے پر چل پڑتا ہے اور اسے نہیں چھوڑتا تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی جنت تک قریب ترین اور آسان ترین راستے کے ذریعے پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا اور آخرت میں وہ تمام راستے اس کے لیے انتہائی آسان ہو جاتے ہیں جو جنت تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کی معرفت، اس کی رضا تک پہنچنے، اس کے قرب کو پا کر کامیاب ہونے اور آخرت میں اس کے پڑوس میں رہنے کا کوئی راستہ نہیں ہے سوائے اِس کے کہ وہ علمِ نافع حاصل کیا جائے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث کیا اور اپنی کتابوں کو نازل فرمایا۔ بس وہی علم اس کی راہنمائی کرنے والا ہے اور اسی کے ذریعے جہالت اور شکوک وشبہات کے اندھیروں میں ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو ''نور'' قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ اندھیروں میں راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴾ [المائدة: ١٥]

''یقیناً تمھارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور انتہائی واضح کتاب آ چکی۔''

علم کی دو قسمیں ہیں:

پہلی: جس کا ثمرہ انسان کے دل میں ہو۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے اسماء وصفات اور اس کے افعال کا وہ علم ہے جو اس کی خشیت، ہیبت، جلال، اس کے لیے عاجزی، محبت، امید، دعا اور اس پر توکل وغیرہ کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ نفع بخش علم ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''علم دو ہیں۔ ایک وہ علم جو صرف زبان پر ہوتا ہے اور وہ بنو آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔ دوسرا وہ ہے جو دل میں ہوتا ہے اور وہی علم نافع ہے۔''

دوسری: وہ علم جو زبان پر ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حجت ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

«وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ أَوْ عَلَيْكَ»[1]

''قرآن آپ کے لیے حجت ہے یا آپ کے خلاف حجت ہے۔''

سب سے پہلے جس علم کو اٹھایا جائے گا وہ ہے علم نافع اور اس سے مراد وہ علم ہے جو دلوں میں گھل مل جاتا اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے بعد صرف زبانی علم بطور حجت رہ جائے گا، جس کے بارے میں لوگ غفلت کریں گے اور اس کے تقاضوں پر عمل نہیں کریں گے، نہ اس علم کو اٹھانے والے (علماء) اور نہ ہی دوسرے لوگ۔ پھر یہ علم بھی علماء کے جانے کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ بعد ازاں قرآن صرف مصاحف کے اندر رہ جائے گا۔ اس کے معانی، اس کی حدود اور اس کے احکام کو جاننے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ پھر آخری زمانے میں اسے بھی اٹھا لیا جائے گا۔ نہ مصاحف میں رہے گا اور نہ ہی دلوں میں رہے گا۔ اس کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ إِلَّا عَلَى شِرَارِ النَّاسِ»[2]

''قیامت صرف بدترین لوگوں ہی پر قائم ہوگی۔''

اسی طرح ارشاد فرمایا:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اَللّٰهُ، اَللّٰهُ»[3]

---

[1] مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، رقم الحديث: 1 (223)

[2] مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعة، رقم الحديث: 131 (2949)

[3] مسلم، کتاب الإيمان، باب ذهاب الإيمان آخر الزمان، رقم الحديث: 234 (148)

’’قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ (وہ وقت آجائے گا جب) زمین میں اللہ اللہ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔‘‘

مساجد میں علم، قرآن اور ذکر کے لیے بیٹھنا:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد:

«وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ»

’’اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں لوگوں کا کوئی گروہ اکٹھا ہوتا ہے، وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کا درس و تدریس کرتے ہیں تو ان پر سکینت (اطمینان وسکونِ قلب) کا نزول ہوتا ہے اور (اللہ کی) رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین میں جو اس کے پاس ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتا ہے۔‘‘

یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ مساجد میں تلاوتِ قرآن اور اس کو پڑھنے پڑھانے کے لیے بیٹھنا مستحب ہے۔ اگر ’’مدارسہ‘‘ کے لفظ کو تعلمِ قرآن اور تعلیمِ قرآن پر محمول کیا جائے تو اس کے استحباب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ»[1]

’’تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے۔‘‘

ابو عبدالرحمٰن السلمی رحمہ اللہ نے کہا: اسی حدیث نے مجھے اِس جگہ پہ مسلسل بیٹھنے پہ مجبور کیا ہے۔ (انھوں نے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن کی تعلیم دینا شروع کی یہاں تک کہ حجاج بن یوسف کا دور آگیا۔)

اور اگر ’’مدارسہ‘‘ کے لفظ کو اِس سے زیادہ عام معنی پر محمول کیا جائے تو اس میں قرآن کو مطلقاً پڑھنے پڑھانے کے لیے مساجد میں جمع ہونا بھی داخل ہوجائے گا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ سب

[1] البخاري، كتاب فضائل القرآن، باب خيركم من تعلم القرآن وعلمه، رقم الحديث (5027)

سے افضل عمل کون سا ہے؟ تو انھوں نے کہا: اللہ کا ذکر۔ پھر فرمایا: جو لوگ بھی اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں بیٹھتے ہیں، پھر آپس میں اللہ کی کتاب پڑھتے پڑھاتے ہیں تو فرشتے اپنے پروں کے ساتھ ان پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔ وہ جب تک اس میں مشغول رہتے ہیں تب تک اللہ کے مہمان ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔

یزید الرقاشی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: جب وہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) صبح کی نماز پڑھ لیتے تھے تو ٹولیوں میں بیٹھ کر قرآن پڑھتے تھے، فرائض و سنن کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (گھر سے) نکل کر مسجد میں ایک حلقے (والوں) کے پاس سے گزرے، انھوں نے کہا: تمھیں کس چیز نے یہاں بٹھا رکھا ہے؟ انھوں نے کہا: ہم اللہ کا ذکر کرنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے کہا: کیا اللہ کو گواہ بنا کر کہتے ہو کہ تمھیں اس کے علاوہ اور کسی غرض نے نہیں بٹھایا؟ انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اس کے علاوہ اور کسی وجہ سے نہیں بیٹھے، انھوں نے کہا: دیکھو، میں نے تم سے کسی تہمت کی وجہ سے قسم نہیں لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میری حیثیت کا کوئی شخص ایسا نہیں جو حدیث بیان کرنے میں مجھ سے کم ہو، (اس کے باوجود اپنے یقینی علم کی بنا پر میں تمھارے سامنے یہ حدیث بیان کر رہا ہوں کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (گھر سے) نکل کر اپنے ساتھیوں کے ایک حلقے کے قریب تشریف لائے اور فرمایا: ”تم کس غرض سے بیٹھے ہو؟“ انھوں نے کہا: ہم بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کی حمد کر رہے ہیں کہ اس نے اسلام کی طرف ہماری راہنمائی کی، اس کے ذریعے سے ہم پر احسان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم اللہ کو گواہ بنا کر کہتے ہو کہ تم صرف اسی غرض سے بیٹھے ہو؟“ انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اس کے سوا اور کسی غرض سے نہیں بیٹھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَمَا إِنِّي لَمْ أَسْتَحْلِفْكُمْ تُهْمَةً لَكُمْ وَلَكِنَّهُ أَتَانِي جِبْرِيلُ فَأَخْبَرَنِي أَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُبَاهِي بِكُمُ الْمَلَائِكَةَ»[1]

”میں نے تم پر کسی تہمت کی وجہ سے تم سے قسم نہیں لی، بلکہ میرے پاس جبریل آئے اور مجھے بتایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ذریعے سے فرشتوں کے سامنے فخر کا اظہار فرما رہا ہے۔“

اِس جیسی اور بھی کئی احادیث مروی ہیں۔

---

[1] مسلم، کتاب الذکر، باب فضائل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن، رقم الحدیث: 40 (2701)

عظیم فضیلت:

نبی کریم ﷺ نے اِس حدیث میں خبر دی ہے کہ جو لوگ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر اس کی کتاب پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ان کا بدلہ چار چیزیں ہیں:

1 ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے سورۂ کہف کی قراءت کی۔ گھر میں (اس وقت) ایک چوپایہ بھی تھا۔ وہ بدکنے لگا۔ اس شخص نے دیکھا کہ جانور کے اوپر دھند یا بدلی تھی جو اس پر چھائی ہوئی ہے۔ اس نے یہ واقعہ نبی اکرم ﷺ کو بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«تِلْكَ السَّكِينَةُ تَنَزَّلَتْ لِلْقُرْآنِ»[1]

''یہ سکینت تھی جو قراءت کے وقت اتری (یا قرآن کی خاطر نازل ہوئی)۔''

اسی طرح حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک رات اپنے باڑے میں قراءت کر رہے تھے کہ اچانک ان کا گھوڑا بدکنے لگا۔ انھوں نے پھر پڑھا، وہ دوبارہ بدکا، پھر پڑھا، وہ پھر بدکا۔ اسید رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے خوف پیدا ہوا کہ وہ (میرے بیٹے) یحییٰ کو روند ڈالے گا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا تو اچانک چھتری جیسی کوئی چیز میرے سر پر تھی، اس میں چراغوں جیسی کچھ چیزیں تھیں۔ وہ فضا میں بلند ہوگئی حتی کہ مجھے نظر آنا بند ہوگئی۔ کہا: میں صبح کو رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں کل آدھی رات کے وقت اپنے باڑے میں قراءت کر رہا تھا کہ اس دوران میں اچانک میرا گھوڑا بدکنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابن حضیر! تم پڑھتے رہتے۔'' میں نے عرض کی: میں پڑھتا رہا، پھر اس نے دوبارہ اچھل کود کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابن حضیر! تم پڑھتے رہتے۔'' میں نے کہا: میں نے قراءت جاری رکھی۔ اس نے کچھ بدک کر چکر لگانے شروع کر دیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابن حضیر! تم پڑھتے رہتے۔'' میں نے کہا: پھر میں نے چھوڑ دیا۔ (میرا بیٹا) یحییٰ اس کے قریب تھا، میں ڈر گیا کہ وہ اسے روند دے گا۔ میں نے چھتری جیسی چیز دیکھی، اس میں چراغوں کی طرح کی چیزیں تھیں، وہ فضا میں بلند ہوئی حتی کہ مجھے نظر آنا بند ہوگئی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب نزول السكينة، رقم الحديث: 240 (795) والبخاري، كتاب فضائل القرآن، باب فضل الكهف، رقم الحديث (5011) نحوه.

« تِلْكَ الْمَلَائِكَةُ كَانَتْ تَسْتَمِعُ لَكَ وَلَوْ قَرَأْتَ لَأَصْبَحَتْ يَرَاهَا النَّاسُ مَا تَسْتَتِرُ مِنْهُمْ »[1]

''وہ فرشتے تھے جو تمھاری قراءت سن رہے تھے۔ اور اگر تم پڑھتے رہتے تو لوگ صبح ان (فرشتوں) کو دیکھ لیتے وہ ان سے اوجھل نہ ہوتے۔''

2 رحمتِ باری تعالیٰ کا ڈھانپنا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ [الاعراف: ٥٦]

''اللہ کی رحمت یقینی طور پر نیکوکار لوگوں کے قریب ہے۔''

مستدرک حاکم میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تھے جو اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے پاس سے گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم کیا کہہ رہے تھے؟ میں نے دیکھا ہے کہ تم پر رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ میں بھی تمھارے ساتھ اس میں شریک ہو جاؤں۔''[2]

3 ملائکہ انھیں گھیر لیتے ہیں۔ یہ بات ان احادیث میں بھی مذکور ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی ہیں۔

4 اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان فرشتوں کے پاس کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالىٰ أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ »[3]

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں جو وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد

---

[1] مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب نزول السكينة، رقم الحديث: 242 (796) البخاري، كتاب فضائل القرآن، باب نزول السكينة، رقم الحديث (5018)

[2] مستدرك الحاكم (122/1)

[3] البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ﴾، رقم الحديث (7405) ومسلم، كتاب التوبة، باب في الحض على التوبة، رقم الحديث: 1 (2675)

کرے تو میں بھی اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے بھری محفل میں یاد کرے تو میں اسے اس سے بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں۔''

مذکورہ بالا چاروں فضائل ان تمام لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں جو اللہ کے ذکر کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے جو اس کا ذکر کرتا ہے اور اس کو مزید نعمتیں عطا کرتا ہے جو اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کو عذاب دیتا ہے جو اس کی ناشکری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ ذِكۡرٗا كَثِيرٗا ۝ وَسَبِّحُوهُ بُكۡرَةٗ وَأَصِيلًا ﴾

[الأحزاب: ٤١۔ ٤٢]

''اے ایمان والو! تم اللہ کا ذکر بہت ہی زیادہ کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کیا کرو۔''

جس کو اس کا عمل مؤخر کر دے:

نبی کریم ﷺ کے ارشاد: « وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ » ''اور جس کے عمل نے اسے (خیر کے حصول میں) پیچھے رکھا، اس کا نسب اسے تیز نہیں کر سکتا۔'' کا مطلب یہ ہے کہ عمل ہی وہ چیز ہے جو انسان کو آخرت کے درجات تک پہنچا سکتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلِكُلّٖ دَرَجَٰتٞ مِّمَّا عَمِلُواْۚ ﴾ [الأنعام: ١٣٢]

''اور ہر ایک کے لیے مختلف درجات ہیں ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے کیے۔''

لہٰذا جس شخص کو اس کا عمل اللہ کے ہاں بلند درجات تک پہنچنے سے پیچھے کر دے تو اس کا خاندانی پس منظر اسے آگے نہیں بڑھا سکتا کہ وہ ان درجات تک پہنچ جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بدلہ اعمال پر مرتب کیا ہے نہ کہ خاندانوں پر۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَإِذَا نُفِخَ فِي ٱلصُّورِ فَلَآ أَنسَابَ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَئِذٖ وَلَا يَتَسَآءَلُونَ ﴾ [المؤمنون: ١٠١]

''پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان نہ کوئی رشتے ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی مغفرت اور رحمت کی طرف اعمال کے ذریعے جلدی کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٣﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٣۔ ١٣٤]

''اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے رب کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴾

[المؤمنون: ٥٧۔ ٦١]

''بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہیں، اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے، اور وہ جنھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں کہ یقیناً وہ اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیاں حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور یہی ان کے لیے آگے نکل جانے والے ہیں۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ پل صراط کے بارے میں حکم دے گا، چنانچہ اسے جہنم کے اوپر گاڑھ دیا جائے گا۔ پھر لوگ گروہ در گروہ اپنے اعمال کے حساب سے اس پر سے گزریں گے۔ سب سے پہلے گزرنے والے پلک جھپکتے ہی گزر جائیں گے۔ پھر تیز ہوا کی طرح، پھر بارش کی سی تیزی کی طرح، پھر چوپائے جانوروں کی طرح .... یہاں تک کہ ایک شخص دوڑتے ہوئے گزر جائے گا اور ایک چلتے ہوئے۔ حتی کہ آخری شخص اپنے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزرے گا۔

وہ کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے کیوں پیچھے کر دیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آئے گا: تجھے میں نے پیچھے نہیں کیا بلکہ تجھے تیرے اعمال نے پیچھے کیا ہے۔“[1]

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِيْنَ أَنْزَلَ اللّٰهُ: ﴿ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ ﴾ قَالَ: «يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا اِشْتَرُوْا أَنْفُسَكُمْ لَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِيْنِي مَا شِئْتِ مِنْ مَالِي لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا»[2]

جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ ﴾ تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر فرمانے لگے:

”اے جماعتِ قریش! یا اس جیسا کوئی اور کلمہ کہا۔ تم اپنی جانوں کو (اللہ کے عذاب سے) خرید لو۔ میں اللہ کی بارگاہ میں تمھارے کسی کام نہیں آؤں گا۔ اے بنوعبدمناف! میں اللہ کے ہاں تمھیں کوئی نفع نہیں دوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ کی بارگاہ میں تمھارے کچھ کام نہیں آسکوں گا۔ اے صفیہ، رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی جان! میں اللہ کے ہاں تمھیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔ اے فاطمہ بنت محمد! میرے مال میں سے جو چاہو مجھ سے طلب کر لو۔ میں اللہ کے ہاں تمھیں کوئی نفع نہیں دوں گا۔“

مسند احمد میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب انھیں یمن کی طرف بھیجا تو آپ انھیں وصیت کرنے کے لیے ان کے ساتھ نکلے، پھر آپ ﷺ نے التفات فرمایا اور اپنا چہرہ مدینہ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] اس حوالے سے صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب أدنی أھل الجنة منزلة، رقم الحدیث: 329 (195) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

[2] البخاري، کتاب التفسیر من سورة الشعراء، باب ﴿ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ ﴾، رقم الحدیث (4771) ومسلم، کتاب الإیمان، باب في قول اللّٰه تعالیٰ: ﴿ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ ﴾، رقم الحدیث: 351 (206)

«إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِي الْمُتَّقُونَ مَنْ كَانُوا وَحَيْثُ كَانُوا»①

''لوگوں میں میرے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں، چاہے وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں۔''

طبرانی کی روایت میں کچھ مزید الفاظ بھی ہیں:

«إِنَّ أَهْلَ بَيْتِي هَؤُلَاءِ يَرَوْنَ أَنَّهُمْ أَوْلَى النَّاسِ بِي، وَلَيْسَ ذَلِكَ، إِنَّ أَوْلِيَائِي مِنْكُمُ الْمُتَّقُونَ مَنْ كَانُوا وَحَيْثُ كَانُوا»②

''میرے گھر والوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ میرے سب سے زیادہ قریب ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تم میں میرے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں، چاہے وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں۔''

اِس حدیث میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قربت اور دوستی خاندانی رشتے کے ذریعے حاصل نہیں کی جا سکتی، خواہ رشتہ کتنا قریبی کیوں نہ ہو، بلکہ ایمان وعمل صالح کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جو شخص جتنا کامل ایمان والا اور جتنا زیادہ اچھے عمل کرنے والا ہوگا وہ اتنا ہی نبی کریم ﷺ کے زیادہ قریب ہوگا، چاہے اس کا آپ ﷺ سے خاندانی رشتہ ہو یا نہ ہو۔

اسی بارے میں ایک شاعر کا کہنا ہے ؎

لَعَمْرُكَ مَا الْإِنْسَانُ إِلَّا بِدِينِهِ ۔۔۔ فَلَا تَتْرُكِ التَّقْوَى اتِّكَالًا عَلَى النَّسَبِ

لَقَدْ رَفَعَ الْإِسْلَامُ سَلْمَانَ فَارِسٍ ۔۔۔ وَقَدْ وَضَعَ الشِّرْكُ الشَّقِيَّ أَبَا لَهَبِ

''انسان کی پہچان اس کے دین کے ساتھ ہی ہے، لہٰذا تم خاندانی رشتوں پر بھروسا کرتے ہوئے تقویٰ کو نہ چھوڑنا۔ اسلام نے یقینی طور پر فارس سے آنے والے سلمان رضی اللہ عنہ کو بلند مقام دیا اور شرک نے بد بخت ابولہب کو نیچے گرا دیا۔''

فوائدِ حدیث:

1. حدیث میں پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے اور تنگدست لوگوں کے لیے آسانیاں کرنے کی ترغیب ہے۔

---

① مسند أحمد (235/5)

② أورده الهيثمي في مجمع الزوائد (231-232/10) وقال: رواه الطبراني وإسناده جيد.

2 اِس میں نیکی کے تمام کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور معاشرے کے تمام افراد کے درمیان بھائی چارے کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

3 بدلہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا عمل ہوتا ہے، لیکن اللہ کی طرف سے ملنے والے بدلے میں اور لوگوں کی طرف سے ملنے والے بدلے میں بہت فرق ہے۔

4 اللہ تعالیٰ بندوں کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک وہ ایک دوسرے کی مدد میں لگے رہتے ہیں۔

5 حدیث میں علماء اور طالب علموں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم جزا اور بہت بڑے ثواب کا ذکر ہے۔

6 حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو ڈرایا ہے جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں اور دنیا میں صرف اپنے حسب ونسب پر بھروسا کر لیتے ہیں۔

سوالات:

1 درج ذیل الفاظ کے معانی ذکر کریں: ''نَفَّسَ، کُرْبَةٌ، اَلسَّکِینَةُ، غَشِیَتْهُمْ، بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ''

2 اس حدیث نے مسلمان کے معاشرے میں بسنے والوں کے ساتھ ایک مضبوط رشتے کی روشن تصویر پیش کی ہے۔ اِس کی وضاحت کریں۔

3 نافرمانیوں کے حوالے سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک مستور، دوسرا کھلم کھلا نافرمانیاں کرنے والا۔ تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اور کیا نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''جس نے مسلمان کی پردہ پوشی کی .... الخ'' دونوں پر منطبق ہوتا ہے؟

4 نبی کریم ﷺ نے علم اور اس کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے۔ طلبِ علم اور اس کا اہتمام کرنے اور اسے حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی اور اس کی ترغیب دلائی ہے۔ یہ مفہوم حدیث کے کن الفاظ سے ملتا ہے؟

5 نبی کریم ﷺ کی حدیث: ''اے قریش کی جماعت! .... الخ'' میں کس بات سے، کس کو ڈرایا گیا ہے؟ اور اِس کا اصل حدیث سے کیا تعلق ہے؟



بہت ہی وسعت والے اور بہت ہی زیادہ علم رکھنے والے اللہ کی سخاوت

36 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ، فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا، كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا، كَتَبَهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ إِلَى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ، وَإِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا، كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا، كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً »[1]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں پھر ان کی تفصیل بتائی ہے کہ جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا، پھر وہ نیکی نہیں کی تو اللہ نے اسے اپنے ہاں ایک پوری نیکی لکھ دی اور اگر نیکی کا ارادہ کیا، پھر وہ نیکی کر ڈالی تو اللہ عزوجل نے اسے اپنے ہاں دس سے سات سو گنا (یا) اس سے زیادہ گنا تک لکھ دیا اور اگر اس نے برائی کا ارادہ کیا، پھر اس کا ارتکاب نہ کیا تو اللہ نے اسے اپنے ہاں ایک پوری نیکی لکھی۔ اور اگر اس نے (برائی کا) ارادہ کیا اور اس کو کر ڈالا تو اللہ نے ایک برائی لکھی۔''

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے:

میرے بھائی! (اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیکی کی توفیق دے!) حدیث کے الفاظ پر غور کرو، اللہ تعالیٰ کس قدر مہربان ہے! ''اپنے ہاں'' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کی بہت قدر کرتا ہے۔ اسی طرح

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب من هم بحسنة، رقم الحديث (6491) ومسلم، كتاب الإيمان، باب إذا هم العبد بحسنة، رقم الحديث: 207 (131)

« كَامِلَةً » ''مکمل پوری نیکی'' کے الفاظ بھی بہت زیادہ قدر کرنے پر دلالت کر رہے ہیں۔ نیز برائی کا ارادہ کر کے اسے ترک کرنے پر بھی اللہ تعالیٰ اسے مکمل نیکی لکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ برائی پر عمل کر لے تو ایک ہی گناہ لکھتا ہے۔ اس میں مکمل کا لفظ نہیں آیا، بلکہ صرف ایک کا لفظ آیا ہے جو اس کے چھوٹا اور کم ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہیں۔ وہ پاک ہے اور ہم اس کی ثنا کما حقہ بیان نہیں کر سکتے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

« وَمَحَاهَا اللّٰهُ وَلَا يَهْلِكُ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا هَالِكٌ »[1]

''اور اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا ہے اور اللہ کے (اتنے بڑے فضل وکرم کے بعد) اس پر ایک ہلاک ہونے والا بندہ ہی ہلاک ہوسکتا ہے۔''

یاد رہے کہ اس طرح کی اور بھی کئی احادیث مروی ہیں۔

چنانچہ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« يَقُولُ اللّٰهُ إِذَا أَرَادَ عَبْدِي أَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوهَا عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا بِمِثْلِهَا، وَإِنْ تَرَكَهَا مِنْ أَجْلِي فَاكْتُبُوهَا لَهُ حَسَنَةً، وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوهَا لَهُ حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِائَةٍ »[2]

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے فرشتو! جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے تو جب تک وہ اس پر عمل نہ کرے تب تک اس پر کچھ بھی نہ لکھو۔ پھر اگر اس پر عمل کر لے تو پھر اس کے برابر گناہ لکھو اور اگر وہ میرے خوف سے اس برائی کو ترک کر دے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھو اور اگر کوئی بندہ نیکی کرنا چاہے، پھر اسے نہ کرے تو اس کے لیے ارادے ہی پر ایک نیکی لکھ دو اور اگر اس پر عمل کر لے تو دس گنا سے سات سو گنا تک نیکیاں لکھو۔''

یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس کے الفاظ یوں ہیں:

« قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِذَا تَحَدَّثَ عَبْدِي بِأَنْ يَعْمَلَ حَسَنَةً فَأَنَا أَكْتُبُهَا لَهُ حَسَنَةً مَا

---

[1] مسلم، كتاب الإيمان، باب إذا هم العبد بحسنة، رقم الحديث: 208 (131)

[2] البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ﴾، رقم الحديث (7501) ومسلم، كتاب الإيمان، باب إذا هم العبد بحسنة، رقم الحديث: 205 (129)

لَمْ یَعْمَلْ، فَإِذَا عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، وَإِذَا تَحَدَّثَ بِأَنْ يَّعْمَلَ سَيِّئَةً فَأَنَا أَغْفِرُهَا لَهُ مَا لَمْ يَعْمَلْهَا، فَإِذَا عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا لَهُ بِمِثْلِهَا»

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب میرا بندہ (دل میں) یہ بات کرتا ہے کہ وہ نیکی کرے گا تو میں اس کے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں، جب تک عمل نہ کرے، پھر اگر اس کو عمل میں لے آئے تو میں اسے دس گنا لکھ لیتا ہوں اور جب (دل میں) برائی کرنے کی بات کرتا ہے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں جب تک اس پر عمل نہ کرے۔ جب وہ اس کو عمل میں لے آئے تو میں اسے اس کے برابر (ایک ہی برائی) لکھتا ہوں۔''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ: رَبِّ، ذَاكَ عَبْدُكَ يُرِيْدُ أَنْ يَّعْمَلَ سَيِّئَةً، وَهُوَ أَبْصَرُ بِهِ، فَقَالَ: اِرْقُبُوْهُ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهُ بِمِثْلِهَا، وَإِنْ تَرَكَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهُ حَسَنَةً، إِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ جَرَّايَ»

فرشتوں نے کہا: اے رب! یہ تیرا بندہ ہے، برائی کرنا چاہتا ہے اور اللہ اس کو خوب دیکھ رہا ہوتا ہے، اللہ فرماتا ہے: اس پر نظر رکھو، پس اگر وہ برائی کرے تو اس کے برابر (ایک برائی) لکھ لو۔ اور اگر اس کو چھوڑ دے تو اس کے لیے اسے ایک نیکی لکھو (کیونکہ) اس نے میری خاطر اسے چھوڑا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ، فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَّعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَّعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتَّى يَلْقَى اللّٰهَ»[1]

''جب تم میں سے ایک انسان اپنے اسلام کو خالص کر لیتا ہے تو ہر نیکی جو وہ کرتا ہے، دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے اور ہر برائی جو وہ کرتا ہے، اسے اس کے لیے ایک ہی لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملتا ہے۔''

نیکیاں اور برائیاں:

مذکورہ بالا احادیث اور ان جیسی دیگر احادیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ نیکیاں اور برائیاں لکھی جاتی ہیں۔ نیکی کا ارادہ ہو تو کیا ملتا ہے اور برائی کا ارادہ ہو تو کیا ملتا ہے۔ یوں یہ چار اقسام بنتی ہیں:

[1] مسلم، کتاب الإیمان، باب إذا هم العبد بحسنة، رقم الحدیث: 205 (129)

پہلی قسم: نیکیاں کرنا۔ ایک نیکی کے بدلے میں دس سے لے کر سات سو گنا تک اور اس سے بھی زیادہ نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ کم از کم دس نیکیوں کا لکھا جانا تو لازمی امر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الأنعام: ١٦٠]

''جو ایک نیکی لائے گا، اسے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔''

اور جہاں تک دس سے زیادہ نیکیوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اسے سات سو گنا تک اور اس سے بھی زیادہ نیکیوں کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ [البقرة: ٢٦١]

''ان کی مثال جو اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں اس دانے کی سی ہے جو سات بالیاں اگائے، ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے کئی گنا تک ثواب بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت وسعتوں والا اور بہت زیادہ علم رکھنے والا ہے۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک شخص ایک اونٹنی لایا جس میں نکیل ڈلی ہوئی تھی، کہنے لگا: اے اللہ کے رسول اللہ! یہ میں اللہ کے راستے میں دیتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُ مِائَةِ نَاقَةٍ كُلُّهَا مَخْطُومَةٌ»[1]

''تمھیں اس کے بدلے میں قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں ملیں گی اور سبھی نکیل سمیت ہوں گی۔''

دوسری قسم: برائیاں کرنا، چنانچہ ایک برائی کے بدلے میں ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔ اس میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٦٠]

''اور جو شخص ایک برائی لائے گا تو اسے اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اس کے لیے ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے تو اس میں اس بات کی طرف

[1] مسلم، كتاب الإمارة، باب فضل الصدقة في سبيل الله، رقم الحديث: 132 (1892)

اشارہ ہے کہ اس میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ دوسری حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ بعض اوقات زمان ومکان کے شرف کی وجہ سے برائی کا گناہ بھی بڑھا دیا جاتا ہے، مثلاً: ایک خاص زمانے کا شرف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ ﴾

[التوبة: ٣٦]

"بے شک مہینوں کی گنتی، اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ سو تم ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔"

اور ایک خاص جگہ کا شرف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الحج: ٢٥]

"اور جو بھی اس میں ظلم کے ساتھ کسی قسم کی کج روی کا ارادہ کرے گا تو ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔"

اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کئی افراد حرم مکی میں رہائش ہی نہیں رکھتے تھے، کہیں ان سے گناہوں کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ ان میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما شامل ہیں، اسی طرح عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی ایسے ہی کرتے تھے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: اگر میں مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ پر ستر غلطیاں کروں تو یہ مجھے اِس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں مکہ میں ایک غلطی کا ارتکاب کروں۔

بعض اوقات کسی شخص کے اعلیٰ مقام ومرتبے اور اللہ کی معرفت اور اس سے اس کے قرب کی وجہ سے بھی برائی کا گناہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ شخص جو بادشاہ کے قریب رہتا ہو اس کا جرم اس شخص کے جرم سے بڑا سمجھا جاتا ہے جو اس سے دور رہتا ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو، اگرچہ اس نے انھیں نافرمانیوں سے بچایا ہوتا ہے، ان کی کسی (ہونے والی) نافرمانی کی بنا پر اس کی سزا کئی گنا زیادہ بڑھانے کی دھمکی دی ہے۔ تاکہ ان کے لیے اپنا فضل واضح کر دے کہ اس نے ہی انھیں گناہوں سے معصوم رکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا﴾ [الإسراء: ۷۴۔ ۷۵]

''اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ آپ ان کی طرف قدرے قلیل مائل ہو ہی جاتے۔ پھر تو ہم بھی آپ کو دوہرا عذاب دنیا کا کرتے اور دوہرا ہی موت کا۔ پھر آپ اپنے لیے ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاتے۔''

اسی طرح نبی ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صٰلِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۳۰۔ ۳۱]

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی، اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت ہی سہل (سی بات) ہے۔ اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر (بھی) دوہرا دیں گے اور اس کے لیے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے۔''

تیسری قسم: نیکیوں کا ارادہ کرنا۔ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے لیے مکمل نیکی لکھ دی جاتی ہے چاہے وہ اس پر عمل نہ کرے، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کی روایت میں ہے اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت جو صحیح مسلم میں ہے اور اس سے پہلے گزر چکی ہے، اس میں جو الفاظ ہیں کہ ''جب میرا بندہ (دل میں) یہ بات کرتا ہے کہ وہ نیکی کرے گا تو میں اس کے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں، جب تک عمل نہ کرے ....'' تو اس میں بات کرنے سے مراد دل کی بات ہے اور وہی ارادہ ہوتا ہے۔ جب دل کے ارادے کے ساتھ زبانی بات یا عملی کوشش بھی شامل ہو جائے تو اس کا بدلہ یقینی ہو جاتا ہے اور وہ عمل کرنے والے شخص کے ساتھ ہی جا ملتا ہے، جیسا کہ ابو کبشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّمَا الدُّنْيَا لِأَرْبَعَةِ نَفَرٍ: عَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَعِلْمًا، فَهُوَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَيَصِلُ فِيهِ رَحِمَهُ، وَيَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ، وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا

وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُولُ: لَوْ أَنَّ لِي مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنِيَّتِهِ فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ، وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا، فَهُوَ يَخْبِطُ فِي مَالِهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَا يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَلَا يَصِلُ فِيهِ رَحِمَهُ، وَلَا يَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَخْبَثِ الْمَنَازِلِ، وَعَبْدٍ لَمْ يَرْزُقْهُ اللّٰهُ مَالًا وَلَا عِلْمًا، فَهُوَ يَقُولُ: لَوْ أَنَّ لِي مَالًا لَعَمِلْتُ فِيهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ بِنِيَّتِهِ، فَوِزْرُهُمَا سَوَاءٌ»[1]

''یہ دنیا چار قسم کے لوگوں کے لیے ہے: ایک بندہ وہ ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مال اور علم کی دولت دی، وہ اپنے رب سے اس مال کے کمانے اور خرچ کرنے میں ڈرتا ہے اور اس مال کے ذریعے صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں سے اللہ کے حقوق کی ادائیگی کا بھی خیال رکھتا ہے۔ ایسے بندے کا درجہ سب سے بہتر ہے۔ ایک وہ بندہ ہے جسے اللہ نے علم دیا، لیکن مال ودولت سے اسے محروم رکھا، پھر بھی اس کی نیت سچی ہے اور وہ کہتا ہے کہ کاش میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں اس شخص کی طرح عمل کرتا۔ لہٰذا اسے اس کی سچی نیت کی وجہ سے پہلے شخص کی طرح اجر برابر ملے گا۔ ایک وہ بندہ ہے جسے اللہ نے مال ودولت سے نوازا، لیکن اسے علم سے محروم رکھا وہ اپنے مال میں غلط روش اختیار کرتا ہے، اس مال کے کمانے اور خرچ کرنے میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا ہے، نہ ہی صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس مال میں اللہ کے حق کا خیال رکھتا ہے تو ایسے شخص کا درجہ سب سے بدتر ہے اور ایک وہ بندہ ہے جسے اللہ نے مال ودولت اور علم دونوں سے محروم رکھا، وہ کہتا ہے: کاش میرے پاس مال ہوتا تو فلاں کی طرح میں بھی عمل کرتا (یعنی: برے کاموں میں مال خرچ کرتا) تو اس کی نیت کا وبال اسے ملے گا اور دونوں کا عذاب اور بارِ گناہ برابر ہوگا۔''

آپ ﷺ کا یہ فرمان: «فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ» ''پہلا اور دوسرا دونوں شخص اجر کے اعتبار سے برابر ہوں گے۔'' اِس بات پر محمول کیا جائے گا کہ نیکی کا جو اصل اجر ہے اس میں وہ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ نہ یہ کہ دونوں کے لیے اجر برابری کی بنیاد پر بڑھایا جائے گا، کیونکہ نیکی کے اجر کا بڑھایا جانا اس کے لیے خاص ہے جو اس پر عمل کرتا ہے، اس کے لیے نہیں ہے جو اس کی نیت کرے اور عمل نہ کرے۔ اگر وہ

---

[1] مسند أحمد (231/4) والترمذي، كتاب الزهد، باب ما جاء في مثل الدنيا، رقم الحديث (2325) وابن ماجه، كتاب الزهد، باب النية، رقم الحديث (4228)

دونوں ہر اعتبار سے برابر ہوتے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے بھی دس نیکیاں لکھتا جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور عمل نہیں کیا۔ اور یہ بات تمام نصوص کے خلاف ہے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ نیز اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۚ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ٩٥۔ ٩٦]

''اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مومن اور بغیر عذر کے بیٹھے رہنے والے مومن برابر نہیں۔ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجوں میں بہت فضیلت دے رکھی ہے۔ اور یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خوبی اور اچھائی کا وعدہ دیا ہے، لیکن مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت دے رکھی ہے۔ اپنی طرف سے مرتبے کی بھی اور بخشش کی بھی اور رحمت کی بھی اور اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا کہنا ہے کہ جن بیٹھ رہنے والوں پر مجاہدین کو ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے ان سے مراد معذور افراد میں سے بیٹھ رہنے والے ہیں اور جن بیٹھ رہنے والوں پر مجاہدین کو کئی درجے فضیلت دی گئی ہے ان سے مراد غیر معذور افراد میں سے بیٹھ رہنے والے ہیں۔

چوتھی قسم: برائی کا ارادہ کرنا لیکن اس پر عمل نہ کرنا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو کہ پہلے گزر چکی ہے، اس میں ہے کہ برائی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل نہ کرنے پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ''اس نے اس برائی کو میرے ڈر کی وجہ سے چھوڑا۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے برائی کا ارادہ کر کے اسے اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے، کیونکہ اس کا اِس نیت سے معصیت کو چھوڑنا خود ایک نیک عمل ہے، لیکن اگر وہ اسے لوگوں سے ڈرتے ہوئے یا ان کا لحاظ کرتے ہوئے چھوڑ دے تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے اس پر سزا دی جائے گی، کیونکہ مخلوق کے ڈر کو اللہ کے ڈر پر

مقدم کرنا حرام ہے۔ نیز مخلوق کی خاطر ریاکاری کی نیت بھی حرام ہے، لہٰذا اگر اس کا معصیت کو چھوڑنا ریاکاری کی نیت کے ساتھ ہو تو اِس پر اسے سزا دی جائے گی۔

ابو نعیم رحمہ اللہ نے ضعیف سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: ''اے گناہ کرنے والے شخص! گناہ کے برے انجام سے ہمیشہ ڈرتے رہنا اور اِس بات سے کہ جب تو گناہ کرتا ہے تو اس کے بعد اس کے نتائج انتہائی بھیانک ہو سکتے ہیں، اور جب تم گناہ کر رہے ہوتے ہو اور اسی دوران ہوا تیرے گھر کے پردے کو حرکت دے تو تو ڈر جاتا ہے، لیکن تیرا دل اس وقت مضطرب نہیں ہوتا جب اللہ تعالیٰ تجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوتا ہے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں: سلف صالحین کہا کرتے تھے کہ لوگوں کی خاطر کسی کام کو چھوڑنا ریا اور ان کی خاطر کسی کام کو کرنا شرک ہے۔

اور اگر کوئی شخص برائی کرنے کی مقدور بھر کوشش کر ڈالے، لیکن اس کے اور برائی کے درمیان اللہ کی تقدیر حائل ہو جائے تو اہلِ علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اسے اس کی سزا دی جائے گی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِي عَمَّا وَسْوَسَتْ وَ حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهِ وَ تَكَلَّمْ» [1]

''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وسوسے اور ان کے دل کی باتوں سے درگزر فرمایا ہے جب تک وہ ان پر عمل پیرا نہ ہوں یا انھیں زبان پر نہ لے آئیں۔''

اور جو شخص نافرمانی کرنے کی بھرپور کوشش کر لے، لیکن اس سے عاجز آ جائے تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے اس پر عمل کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ»، فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُولِ؟ قَالَ: «إِنَّهُ كَانَ حَرِيصاً عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ» [2]

''جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر آپس میں لڑ پڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی

---

[1] البخاري، كتاب الأيمان والنذور، باب إذا حنث ناسيا، رقم الحديث (6664) ومسلم، كتاب الإيمان، باب تجاوز الله عن حديث النفس، رقم الحديث: 201 (127)

[2] البخاري، كتاب الإيمان، باب ﴿وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا﴾، رقم الحديث (31) ومسلم، كتاب الفتن، باب إذا تواجه المسلمان بسيفيهما، رقم الحديث: 14 (2888)

ہیں۔“ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے (اس کا جہنمی ہونا سمجھ میں آتا ہے) لیکن مقتول کا کیا جرم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کی خواہش بھی دوسرے ساتھی کو قتل کرنے کی تھی۔“

تھک ہار کر بیٹھ جانا:

ایک شخص اگر برائی کا ارادہ کرے، پھر اس کا ارادہ ختم ہو جائے اور اپنی طرف سے کسی سبب کے بغیر اس کا پختہ عزم ٹھنڈا پڑ جائے تو کیا وہ سزا کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: دل میں برائی کا خیال پیدا ہوا، پھر اس نے اسے اپنے دل میں جگہ نہیں دی اور اس پر پختہ عزم نہیں کیا، بلکہ اسے ناپسند کیا اور اس سے نفرت شروع کر دی تو یہ معاف ہے، کیونکہ یہ ان گندے وسوسوں میں سے ایک ہے جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ نے اسے صریح ایمان قرار دیا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

جَاءَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، فَسَأَلُوهُ: إِنَّا نَجِدُ فِي أَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَتَكَلَّمَ بِهِ، قَالَ: «وَقَدْ وَجَدْتُمُوهُ؟» قَالُوا: نَعَمْ، قَالَ: «ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ» [1]

نبی ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے پوچھا: ہم اپنے دلوں میں ایسی چیزیں محسوس کرتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ان کو زبان پر لانا بہت سنگین سمجھتا ہے، آپ ﷺ نے پوچھا: ”کیا تم نے واقعی اپنے دلوں میں ایسا محسوس کیا ہے؟“ انھوں نے عرض کی: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہی صریح ایمان ہے۔“

جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [البقرة: ٢٨٤]

”تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا، پھر جسے چاہے بخشے جسے چاہے سزا دے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

---

[1] مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الوسوسة من الإيمان، رقم الحديث: 209 (132)

تو یہ مسلمانوں پر بہت بھاری گزرا اور انھیں گمان ہوا کہ شاید وسوسے بھی اس میں داخل ہیں اور ان پر بھی ان کا محاسبہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی آیت نازل کر دی، جس میں ہے:

﴿ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو۔''

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس چیز کی وہ طاقت نہیں رکھتے اس پر ان کا محاسبہ ومواخذہ نہیں ہوگا۔

دوسری قسم: برائی کا پختہ عزم جو منقطع نہ ہو اور مسلسل جاری رہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

① دل کے اعمال میں سے ایک مستقل عمل ہو، جیسے اللہ کی وحدانیت یا نبوت یا قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے یا کفر ونفاق کے اصول میں شک وشبہہ ہو۔ یا ان چیزوں کو جھوٹا سمجھنے کا پختہ عقیدہ ہو تو ان تمام چیزوں کے ساتھ وہ کافر ومنافق ہو جائے گا اور اسے ان پر سزا دی جائے گی۔ اِس قسم میں دلوں سے متعلقہ تمام معاصی شامل ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ جس چیز کو ناپسند کرتا ہو اسے پسند کرنا اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہو اسے ناپسند کرنا، جیسے: تکبر، من پسندی، حسد اور مسلمان پر بغیر کسی سبب کے بدگمانی کرنا وغیرہ۔

② وہ برائی جس کا تعلق دل کے اعمال سے نہ ہو، بلکہ اعضاء سے ہو۔ مثلاً: زنا، چوری، شراب نوشی، قتل، تہمت لگانا وغیرہ۔ جب بندہ ارادہ کرکے اس پر اصرار کرے اور پختہ عزم کر لے، لیکن اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو کیا اِس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ اس بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ جی ہاں اِس پر بھی مواخذہ ہوگا۔

ابن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے سفیان ثوری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ''کیا صرف ارادہ کرنے پر بندے کا مواخذہ ہوگا؟ تو انھوں نے جواب دیا: ہاں اگر پختہ عزم ہے تو مواخذہ ہوگا۔ اِس قول کو حنابلہ میں سے کئی فقہاء، محدثین اور متکلمین نے راجح قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ﴾ [البقرة: ٢٣٥]

''جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کی باتوں کا بھی علم رکھتا ہے تم اس سے خوف کھاتے رہا کرو۔''

اسی طرح یہ فرمان:

﴿ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٢٥]

''لیکن جو تم سچے دل سے قسم کھاتے ہو اس پر ضرور گرفت کرے گا۔''

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث جس کے راوی سیدنا نواس بن سمعان انصاری رضی اللہ عنہ ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ »[1]

''نیکی اچھا خلق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمھارے دل میں کھٹکے اور تم ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کا پتا چلے۔''

ان اہلِ علم نے نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وسوسے اور ان کے دل کی باتوں سے درگزر فرمایا ہے جب تک وہ ان پر عمل پیرا نہ ہوں یا انھیں زبان پر نہ لے آئیں۔'' اِس بات پر محمول کیا ہے کہ اس سے مراد دل میں پیدا ہونے والے وسوسے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ جو وسوسہ بندے کے دل میں پختہ ہو جائے تو وہ محض وسوسہ ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی کمائی اور اس کا عمل ہے۔ لہٰذا وہ معاف نہیں ہوگا۔

دوسرا قول اس حوالے سے یہ ہے کہ صرف نیت کرنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہی قول حنابلہ میں سے ابن حامد کا بھی ہے۔ اِس قول کے دلائل عمومی نصوص ہیں جو پہلے گزر چکی ہیں۔

اِس کے بارے میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ معصیت ونافرمانی کا ارادہ کرنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، ہاں اگر اس کے ارتکاب کا ارادہ کرنے والا حرمِ مکی میں ہو تو اس کا مؤاخذہ ہوگا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جو بندہ بھی حرم کے اندر برائی کا ارادہ کرے، پھر چاہے اس پر عمل نہ کرے تو وہ برائی اس پر لکھ دی جائے گی۔ اور اگر وہ بیت اللہ کے پاس قتل کرنے کا ارادہ کرے، خواہ وہ یمن کے شہر عدن ابین میں بھی ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب چکھائے گا۔ پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ [الحج: ٢٥]

''اور جو کوئی از راہِ ظلم مسجدِ حرام میں کجروی اختیار کرے گا (ایسے سب لوگوں کو) ہم دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والإثم، رقم الحدیث: 15 (2553)

یہی بات امام احمد رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے، جبکہ کچھ اہلِ علم کے مطابق اِس کی وجہ یہ ہے کہ حرمِ مکی میں معصیت کا ارادہ ان معاصی میں سے ہے جن کا تعلق دلوں کے ساتھ ہے، کیونکہ دل کی گہرائی سے حرمِ مکی کا احترام کرنا، اس کی حرمت کا لحاظ رکھنا اور اس کی تعظیم کرنا واجب ہے۔ لہٰذا سزا اس واجب کو ترک کرنے پر ہوگی، لیکن یہ بات درست نہیں ہے، کیونکہ حرم کی حرمت اسے حرمت والا قرار دینے والے (اللہ تعالیٰ) کی حرمت سے بڑی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت پر عزم کرنا اس کی محرمات کو پامال کرنے کا عزم ہے۔ تاہم اگر وہ حرمتِ حرم کو پامال کرنے کا عزم کرتے ہوئے معصیت پر عزم کرے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کو پامال کرنے کے عزم کے ساتھ اس کی معصیت کا عزم کرے، اور اِس سے وہ یقیناً کافر ہوجائے گا۔ ہاں اگر وہ صرف اپنی شہوت کو پورا کرنے کی خاطر معصیتِ الٰہی کا ارادہ کرے اور اس کا قصد اللہ تعالیٰ کے اوامر کی مخالفت نہ ہو اور اس کی ہیبت اور وہ اس کے دیکھنے کو ہلکا نہ سمجھے تو اِس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا۔

معصیت کو بار بار کرنے کا عزم بھی تکرارِ معصیت ہے:

جب برائی کے ارادے کے ساتھ عمل بھی شامل ہو جائے تو وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے، چاہے عمل ارادے سے کافی متاخر کیوں نہ ہو اور جب ایک شخص حرام پر ایک مرتبہ عمل کر لے، پھر دوبارہ موقع ملنے پر اسے دوبارہ کرنے کا عزم کر لے تو وہ شخص معصیت پر اصرار کرنے والا ہوگا اور اِس نیت پر سزا کا مستحق ہو گا، خواہ وہ کئی سال تک اس پر عمل نہ کر سکے۔ ابن مبارک رحمہ اللہ نے معصیت پر اصرار کی یہی تشریح کی ہے۔

بہرحال معصیت اتنی ہی لکھی جاتی ہے جتنی ہوتی ہے، اسے کئی گنا بڑھایا نہیں جاتا، جیسا کہ نیکی کا ثواب کئی گنا بڑھایا جاتا ہے۔ لہٰذا سزا معصیت پر ہوتی ہے، اس کے ارادے پر نہیں ہوتی، کیونکہ اگر معصیت کے ساتھ اس کے ارادے پر بھی سزا ملتی تو اس کو دو سزائیں ملتیں۔ یہ معاملہ نیکی میں نہیں ہے، کیونکہ جب کوئی شخص ایک نیکی کرتا ہے تو اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اور ہوسکتا ہے اس اضافے میں نیکی کے ارادے کا ثواب بھی شامل ہو۔ واللہ اعلم

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح مسلم کی روایت میں جو الفاظ ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا ہے۔'' تو اس سے مقصود یہ ہے کہ برائی پر عمل کرنے کے بعد عمل کرنے والے شخص پر یا تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے، یا اللہ تعالیٰ اسے دیگر کئی اسباب، مثلاً: توبہ، استغفار اور دیگر نیکیوں کی بنا پر مٹا دیتا ہے۔

اِس کے بعد آپ ﷺ کا یہ فرمان: « وَلَا يَهْلِكُ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا هَالِكٌ » تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے فضل وکرم اور وسیع رحمت کے بعد کہ نیکیوں کا ثواب کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور برائیوں سے درگزر کر دیا جاتا ہے، اگر کوئی شخص نیکیوں سے بے رغبتی اور اعراض کرتا ہے اور برائیاں کرنے کی جرأت کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہلاکت کی وادی میں ڈالتا ہے تو وہ یقیناً ایک ہلاک ہونے والا بدبخت ہی ہوسکتا ہے۔

اسی لیے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے:

''ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جس کی ایک برائی دسیوں نیکیوں پر غالب آ جائے۔''

اور سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« خُلَّتَانِ لَا يُحْصِيهِمَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ، أَلَا وَهُمَا يَسِيرٌ، وَمَنْ يَعْمَلُ بِهِمَا قَلِيلٌ، يُسَبِّحُ اللّٰهَ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا وَيَحْمَدُهُ عَشْرًا وَيُكَبِّرُهُ عَشْرًا »، قَالَ: فَأَنَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَعْقِدُهَا بِيَدِهِ، قَالَ: « فَتِلْكَ خَمْسُونَ وَمِائَةٌ بِاللِّسَانِ وَأَلْفٌ وَخَمْسُ مِائَةٍ فِي الْمِيزَانِ، وَإِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ تُسَبِّحُهُ وَتُكَبِّرُهُ وَتَحْمَدُهُ مِائَةً، فَتِلْكَ مِائَةٌ بِاللِّسَانِ وَأَلْفٌ فِي الْمِيزَانِ، فَأَيُّكُمْ يَعْمَلُ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ أَلْفَيْنِ وَخَمْسَ مِائَةِ سَيِّئَةٍ »[1]

''دو عادتیں ایسی ہیں جنھیں جو بھی مسلمان پابندی اور پختگی سے اپنائے رہے گا وہ جنت میں جائے گا، دھیان سے سن لو، دونوں آسان ہیں مگر ان پر عمل کرنے والے تھوڑے ہیں، ہر نماز کے بعد دس بار اللہ کی تسبیح کرے (''سبحان اللہ'' کہے) دس بار حمد بیان کرے (''الحمد للہ'' کہے) اور دس بار اللہ کی بڑائی بیان کرے (''اللہ اکبر'' کہے)۔'' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو انھیں اپنی انگلیوں پر شمار کرتے ہوئے دیکھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو زبان سے گننے میں ڈیڑھ سو ہوئے، لیکن یہ (دس گنا بڑھ کر) میزان میں ڈیڑھ ہزار ہو جائیں گے۔ (یہ ایک خصلت وعادت ہوئی) اور (دوسری خصلت وعادت یہ ہے

---

[1] مسند أحمد (160/2) وأبو داود، كتاب الأدب، باب في التسبيح عند النوم، رقم الحديث (5065) والترمذي، كتاب الدعوات، باب: حدثنا أحمد بن منيع، رقم الحديث (3410) واللفظ له، والنسائي، كتاب السهو، باب عدد التسبيح، رقم الحديث (1348)

کہ) جب تم بستر پر سونے جاؤ تو سو بار سبحان اللہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ کہو، یہ زبان سے کہنے میں تو سو ہیں، لیکن میزان میں ہزار ہیں، (اب بتاؤ) تم میں سے کون ہے جو دن اور رات میں ڈھائی ہزار گناہ کرتا ہو؟''

فوائدِ حدیث:

1. نیکی کا ثواب دس گنا تک اور بعض اوقات سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔
2. برائی کیفیت کے اعتبار سے تو بڑھ جاتی ہے، مقدار کے اعتبار سے نہیں۔
3. جو شخص برائی کرنے کی پوری کوشش کر ڈالے، پھر اس سے بے بس ہو جائے تو وہ اس پر ایک برائی لکھی جاتی ہے۔
4. اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر بے پناہ لطف وکرم کا ذکر ہے۔

سوالات:

1. سورت الاحزاب کی آیت نمبر: 31 اور اِس حدیث کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟
2. بندہ جب برائی کو چھوڑ دے تو وہ اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے، لیکن اِس کی شرط کیا ہے؟
3. نبی ﷺ کے فرمان: «وَلَا يَهْلِكُ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا هَالِكٌ» کا کیا معنی ہے؟
4. کیا برائیوں کا گناہ بھی بڑھایا جاتا ہے؟
5. اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بہت بڑا فضل وکرم ہے۔ یہ مفہوم حدیث کے کن الفاظ سے لیا گیا ہے؟



ولایت کا راستہ

(37) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ قَالَ: مَنْ عَادَ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِيْ لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيْذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِيْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ »[1]

”بیشک اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اس کے خلاف میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور میرا بندہ جن جن عبادتوں کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں سے کوئی عبادت مجھے اتنی پسند نہیں جس قدر وہ عبادت پسند ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے بھی مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں، لہٰذا میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں۔ اور اگر وہ میری پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ ضرور دے دیتا ہوں۔ میں کسی چیز میں اتنا تردد نہیں کرتا جس کو میں کرنے والا ہوتا ہوں، جتنا تردد مجھے مومن کی جان نکالتے وقت ہوتا ہے، وہ موت کی تکلیف پسند نہیں کرتا اور مجھے بھی اسے تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا ہے۔“

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب التواضع، رقم الحديث (6502)

یہ حدیث کتبِ ستہ میں سے صرف صحیح بخاری میں مروی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ اولیاء کے بارے میں سب سے زیادہ شرف والی حدیث ہے۔

نافرمانیاں اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے کے مترادف ہیں:

بیشک اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اس کے خلاف میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔'' یعنی جس شخص نے میرے اولیاء سے دشمنی کی تو وہ گویا مجھ سے جنگ کر رہا ہے۔ لہٰذا میں بھی اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں، کیونکہ اولیاء اللہ سے محبت کرنا، ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا واجب اور دشمنی کرنا حرام ہے، جیسا کہ اللہ کے دشمنوں سے دشمنی کرنا واجب اور ان سے محبت کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ [الممتحنة:۱]

''اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ''

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾
[المائدة: ۵۵۔ ۵۶]

''(اے ایمان والو!) تمھارے دوست صرف اللہ، اس کا رسول اور ایمان لانے والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکات ادا کرتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ کو، اس کے رسول اور مومنوں کو دوست بنائے (وہ یقین رکھے کہ) اللہ کی جماعت ہی غالب ہو کر رہے گی۔''

یاد رکھو، تمام نافرمانیاں اللہ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سود خوروں، چوروں اور ڈاکوں کو بھی اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کرنے والے قرار دیا ہے، کیونکہ یہ ان کی طرف سے اس کے بندوں پر بہت بڑا ظلم ہے اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش ہے۔ اسی طرح اس کے دوستوں سے دشمنی رکھنا بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی نصرت کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے، ان سے محبت اور ان کی تائید کرتا ہے۔ لہٰذا جو ان سے دشمنی کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی اور اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گا اور ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي أَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِيْ فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِيْ وَمَنْ آذَانِيْ فَقَدْ آذَى اللّٰهَ وَمَنْ آذَى اللّٰهَ يُوْشِكُ أَنْ يَّأْخُذَهُ»①

''اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، میرے صحابہ کے معاملہ میں! اور میرے بعد انھیں ہدفِ ملامت نہ بنانا، جو ان سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت کرنے کی وجہ سے ان سے محبت کرے گا۔ اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھے گا، جس نے انھیں ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا دی، اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہے کہ وہ اسے اپنی گرفت میں لے لے۔''

اللہ کا تقرب پہلے فرائض کے ذریعے پھر نوافل کے ذریعے:

''میرا بندہ جن جن عبادتوں کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں سے کوئی عبادت مجھے اتنی پسند نہیں جس قدر وہ عبادت پسند ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے بھی مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے جب یہ ذکر فرمایا کہ اس کے اولیاء سے دشمنی رکھنا اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور ان سے دشمنی رکھنا حرام اور محبت کرنا واجب ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے اولیاء کی ایک صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا تقرب سب سے زیادہ کس چیز کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ولایت کا معنی قرب اور عداوت کا معنی بعد ہے تو اللہ کے اولیاء وہ ہیں جو ایسے اعمال کرتے ہیں جو انھیں اس کے قریب کرتے ہیں۔ جبکہ اس کے دشمن ایسے اعمال کرتے ہیں جو انھیں اس سے دور کرتے ہیں اور اس کے دھتکارنے کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے والے بندوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جو اس کا تقرب فرائض کی ادائیگی کے ساتھ حاصل کرتے ہیں۔ اس میں واجبات پر عمل کرنا اور محرمات سے پرہیز کرنا شامل ہے، کیونکہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے۔

دوسری قسم: جو فرائض کے بعد نوافل کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔

① أخرجه الترمذي، كتاب المناقب، باب منه (59)، رقم الحديث (3862)

اِس سے ثابت ہوا کہ اللہ کا تقرب، اس کی دوستی اور محبت حاصل کرنے کا واحد راستہ اللہ تعالیٰ کی وہ فرمانبرداری ہے جو اس نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے فرض کی۔ لہٰذا جو شخص اِس راستے کے علاوہ کسی اور راستے کے ذریعے تقربِ الٰہی حاصل کرنے کا دعویٰ کرے گا وہ یقینی طور پر اپنے دعوے میں جھوٹا ہوگا۔ جیسا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کا تقرب غیر اللہ کی پوجا کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ ﴾ [الزمر: ۳]

''اور جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ کارساز بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

اسی طرح یہود ونصاریٰ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ یوں دعویٰ کرتے ہیں:

﴿ نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ [المائدۃ: ۱۸]

''ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے، اس کی محرمات کا ارتکاب کرنے اور فرائض کو چھوڑنے پر اصرار کرتے تھے۔''

اِس حدیث میں اولیاء اللہ کے دو درجے ذکر کیے گئے ہیں:

پہلا درجہ: فرائض کی ادائیگی کے ساتھ اللہ کا تقرب حاصل کرنے والے۔ یہ اصحاب الیمین میں سے ان کا درجہ ہے جو میانہ روی اختیار کرنے والے ہوتے ہیں اور فرائض کے ادائیگی اعمال میں سب سے افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان فرائض کو اس لیے فرض قرار دیا کہ وہ ان کے ذریعے اس کا قرب حاصل کر سکیں اور اس کی رضا اور رحمت سے سرفراز ہو سکیں۔

جسمانی فرائض میں سے جو فریضہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کے قریب کرتا ہے، وہ ہے نمازِ پنجگانہ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ [العلق: ۱۹] ''اور آپ سجدہ کیجیے اور قرب حاصل کیجیے۔''

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ، وَهُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ»[1]

''بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس حالت میں ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے، لہٰذا اس میں کثرت سے دعا کرو۔''

اللہ کے قریب کرنے والے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے حکمران کا اپنی رعایا میں عدل وانصاف کرنا، چاہے وہ رعایا کسی ملک کی ہو یا اپنے اہل وعیال کی ہو۔

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللّٰهِ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، عَنْ يَمِينِ الرَّحْمٰنِ عَزَّوَجَلَّ، وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ، اَلَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَلُوا»[2]

''عدل کرنے والے اللہ کے ہاں رحمان عزوجل کی دائیں جانب نور کے منبروں پر ہوں گے اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں، یہ وہی لوگ ہوں گے جو اپنے فیصلوں، اپنے اہل وعیال اور جن کے یہ ذمہ دار ہیں ان کے معاملے میں عدل کرتے ہیں۔''

دوسرا درجہ: سبقت لے جانے والے مقربین، یہ وہ ہیں جو فرائض کے بعد نفلی عبادات میں اجتہاد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکروہات تک سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اِس سے انھیں اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے بھی مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔''

لہٰذا جس سے اللہ تعالیٰ محبت کر لیتا ہے، اسے وہ اپنی محبت واطاعت اور اپنے ذکر میں ہمہ وقت مصروف رہنے کی توفیق دیتا ہے۔ اِس سے اسے اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اور وہ بڑا ہی خوش نصیب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ

---

[1] مسلم، كتاب الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود، رقم الحديث: 215 (482)

[2] مسلم، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل، رقم الحديث: 18 (1827)

وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [المائدة: ٥٤]

''اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) عنقریب اللہ ایسے لوگ لے آئے گا جن سے اللہ محبت رکھتا ہو اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہوں، مومنوں کے حق میں نرم دل اور کافروں کے حق میں سخت ہوں، اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ وہ بہت فراخی والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

محبت اور اللہ سے محبت کرنے والے:

نبی کریم ﷺ کی مسنون دعاؤں میں سے ایک دعا یوں ہے:

« اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِي يُبَلِّغُنِي حُبَّكَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي وَأَهْلِي وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ »[1]

''اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں، اور میں اس شخص کی بھی تجھ سے محبت مانگتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتا ہے۔ اور ایسا عمل چاہتا ہوں جو مجھے تیری محبت تک پہنچا دے۔ اے اللہ! تو اپنی محبت کو مجھے میری جان اور میرے گھر والوں سے زیادہ محبوب بنا دے۔ اے اللہ! اپنی محبت کو ٹھنڈے پانی کی محبت سے بھی زیادہ کر دے۔''

محبت قربتِ الٰہی کی انتہا ہے اور محبت کرنے والے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اجتہاد سے کبھی اکتاتے نہیں، کیونکہ وہ اس سے اور اس کے ذکر سے محبت کرتے ہیں اور اس کی مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بندوں کو نصیحت کرتے ہیں اور ان پر ان اعمال کا خوف کھاتے ہیں جو قیامت کے دن ان کی رسوائی کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ کے اولیاء، اس کے پیارے اور اس کے چنیدہ ہوتے ہیں۔ انھیں حقیقی راحت اللہ کی ملاقات کے ساتھ ہی نصیب ہوگی۔

فتح الموصلی رحمہ اللہ کہتے ہیں: محبت کرنے والا شخص اللہ کی محبت کے ساتھ دنیا کی لذت محسوس نہیں کرتا اور وہ اللہ کے ذکر سے لمحہ بھر غافل نہیں ہوتا۔

---

[1] الترمذي، كتاب أبواب الدعوات، باب دعا اللهم إني أسألك الهدى....، رقم الحديث (3490)

نوافل میں سے جس عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل کیا جا سکتا ہے وہ ہے: قرآن کی تلاوت اور اس کا سماع کثرت کے ساتھ کرنا، اس کے معانی میں غور وفکر کرتے ہوئے اور اسے سمجھتے ہوئے۔

سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے کہا: جہاں تک ہو سکے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کیا کرو۔ اور اس بات پر یقین کرلو کہ تم اس کے کلام سے زیادہ کسی چیز کے ساتھ اس کا تقرب حاصل نہیں کرسکو گے۔

محبت کرنے والوں کے ہاں اپنے محبوب کے کلام سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ اس سے انھیں لذت ملتی ہے اور وہ ان کی زندگی میں انتہائی مرغوب ومطلوب ہوتا ہے۔

عثمان کہتے ہیں: اگر تمھارے دل پاک ہوں تو تم اپنے رب کے کلام سے کبھی سیر نہ ہو۔

نیز اللہ کی محبت کی ایک بڑی علامت یہ بھی ہے کہ محبت کرنے والا بندہ اس کے ذکر سے کبھی غافل نہیں ہوتا جو اس کی زبان کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ہو۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالَى أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَأٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَأٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ»[1]

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں جو وہ میرے ساتھ رکھتا ہے، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرے تو میں بھی اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے بھری محفل میں یاد کرے تو میں اسے اس سے بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاذْكُرُونِىٓ أَذْكُرْكُمْ ﴾ [البقرة: ١٥٢]

''تم مجھے یاد رکھا کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔''

نیز اس کی ایک اور علامت ہے: اللہ کے دوستوں اور اس کے پیاروں سے اس کی رضا کے لیے محبت کرنا اور اس کے دشمنوں سے اسی کی خاطر دشمنی کرنا۔

---

[1] البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ﴾، رقم الحديث (7405)

سنن ابی داود میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَأُنَاسًا مَا هُمْ بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ، يَغْبِطُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ تَعَالَى » قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ؟ قَالَ: « هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوا بِرُوحِ اللّٰهِ عَلَى غَيْرِ أَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ، وَلَا أَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا، فَوَاللّٰهِ إِنَّ وُجُوهَهُمْ لَنُورٌ، وَإِنَّهُمْ عَلَى نُورٍ، لَا يَخَافُونَ إِذَا خَافَ النَّاسُ، وَلَا يَحْزَنُونَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ ». وَقَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٢]

''اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو نبی ہوں گے نہ شہید، مگر قیامت کے روز اللہ کے ہاں (بلند) مراتب و منازل کی وجہ سے انبیاء و شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں بتائیں، وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہوں گے جو آپس میں اللہ کی کتاب (یا اللہ کے ساتھ محبت) کی بنا پر محبت کرتے تھے۔ حالانکہ ان کا آپس میں کوئی رشتہ ناتا یا مالی لین دین نہ تھا۔ اللہ کی قسم! ان کے چہرے نور ہوں گے اور وہ لوگ نور پر ہوں گے۔ جب لوگ خوف زدہ ہو رہے ہوں گے، تو انھیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ جب لوگ غمگین و پریشان ہو رہے ہوں گے، تو انھیں کوئی غم اور پریشانی نہ ہوگی۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٢]

''آگاہ رہو! اللہ کے دلیوں کو کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غم کھائیں گے۔''

بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کا نتیجہ:

''لہٰذا جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔''

اِس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص فرائض کے ساتھ، پھر نوافل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے میں محنت کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ اپنا قرب نصیب کرتا ہے اور اسے ایمان کے درجے سے احسان کے

درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ جس کے بعد وہ پوری توجہ اور اللہ تعالیٰ کی نگرانی کے تصور کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے، ایسے جیسے وہ اس کو دیکھ رہا ہو۔ چنانچہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معرفت، محبت، عظمت، ہیبت، جلالت اور اس کے خوف، انس اور شوق کے ساتھ بھر جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کے دل میں اللہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا اور اس کے اعضاء بھی اس کے دل کے عین مطابق عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جب دل اللہ کی عظمت کے ساتھ بھر جاتا ہے تو اس سے اس کے علاوہ ہر چیز نکل جاتی ہے۔ بندے کی اپنی نفسانی خواہشات مٹ جاتی ہیں اور اللہ کی چاہت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ تب اس کی زبان سے صرف اللہ کا ذکر ہی ہوتا ہے اور اس کے اعضاء اس حکم کے مطابق ہی حرکت کرتے ہیں۔ جب بولتا ہے تو اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی بولتا ہے، سنتا ہے تو اللہ کی باتوں ہی کو سنتا ہے، دیکھتا ہے تو اللہ کے احکامات کے مطابق دیکھتا ہے اور پکڑتا ہے تو اس کی تعلیمات کے مطابق ہی پکڑتا ہے۔

یہ مراد ہے نبی ﷺ کے اِس فرمان سے کہ ''جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔'' تو جس کا یہ حال ہوتا ہے اس کے تمام اعضاء اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کے ساتھ ہی حرکت کرتے ہیں، کیونکہ گناہ تو تب ہوتے ہیں جب بندہ اس چیز کو پسند کرے جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہو اور اس چیز کو ناپسند کرے جس کو اللہ پسند کرتا ہو۔

نبی ﷺ کا ارشاد: ''اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں۔ اور اگر وہ میری پناہ طلب کرے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ومقرب بندے کے لیے اللہ کے ہاں ایک خاص مرتبہ ہوتا ہے جو اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتا ہے تو وہ اسے دے دیتا ہے۔ اور اگر وہ کسی چیز سے اس کی پناہ طلب کرے تو وہ اسے پناہ دے دیتا ہے۔ اگر وہ دعا کرے تو وہ اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے رب تعالیٰ کے ہاں عزت واکرام کی وجہ سے وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔

کئی سلف صالحین قبولیتِ دعا کے حوالے سے بہت مشہور تھے۔

عَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه، أَنَّ أُخْتَ الرَّبِيعِ، أُمَّ حَارِثَةَ، جَرَحَتْ إِنْسَانًا، فَاخْتَصَمُوا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «اَلْقِصَاصَ، اَلْقِصَاصَ»، فَقَالَتْ أُمُّ الرَّبِيعِ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَيُقْتَصُّ مِنْ فُلَانَةَ؟ وَاللّٰهِ لَا يُقْتَصُّ مِنْهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ يَا أُمَّ الرَّبِيعِ، اَلْقِصَاصُ كِتَابُ اللّٰهِ»، قَالَتْ: لَا، وَاللّٰهِ لَا يُقْتَصُّ مِنْهَا أَبَدًا، قَالَ: فَمَا زَالَتْ حَتّٰى قَبِلُوا الدِّيَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ»[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ربیع رضی اللہ عنہا کی بہن ام حارثہ نے کسی انسان کو زخمی کیا (انھوں نے ایک لڑکی کو تھپڑ مار کر اس کا دانت توڑ دیا جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت میں ہے) تو وہ مقدمہ لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اب تو یقیناً قصاص ہی ہوگا!'' تو ربیع رضی اللہ عنہا کی ماں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا فلاں عورت سے قصاص لیا جائے گا؟ اللہ کی قسم! اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! اے ام ربیع! قصاص اللہ کی کتاب (کا حصہ) ہے۔'' انھوں نے کہا: نہیں، اللہ کی قسم! اس سے کبھی قصاص نہیں لیا جائے گا (اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسا نہیں ہونے دے گا۔) کہا: وہ مسلسل اسی بات پر (ڈٹی) رہیں حتی کہ وہ لوگ دیت پر راضی ہو گئے۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے بندوں میں سے کچھ ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھائیں تو وہ ضرور اسے سچا کر دیتا ہے۔''

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی مستجاب الدعوات تھے۔ ایک شخص نے ان پر جھوٹے الزامات لگائے تو انھوں نے بددعا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! اگر یہ جھوٹا ہے تو اسے اندھا کر دے، اس کی عمر لمبی کر دے اور اسے فتنوں سے دوچار کر دے، چنانچہ وہ ان تمام بددعاؤں سے دوچار ہوا۔ وہ گلیوں میں آنے جانے والی لڑکیوں سے کہا کرتا تھا: میں بوڑھا، فقیر اور فتنوں میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے یقیناً سعد کی بددعائیں لگ گئی ہیں۔

ایک عورت نے سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے ان کی زمین کے بارے میں جھگڑا کیا اور دعویٰ کیا کہ انھوں نے اس کی زمین میں سے کچھ زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ جھوٹی ہے تو اس کو اندھا کر دے اور اسے اس کی زمین میں ہی مارنا تو وہ اندھی ہو گئی اور ایک رات اپنی زمین پر چل رہی تھی کہ ایک کنویں میں گر کر مر گئی۔

---

[1] البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب قوله ﴿وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ﴾ رقم الحديث (4611) ومسلم، كتاب القسامة، باب إثبات القصاص في الأسنان، رقم الحديث: 24(1675)

سلف صالحین میں سے اکثر وہ تھے جو آزمائشوں پر صبر کرتے تھے اور ان کے ثواب کو ترجیح دیتے تھے اور اپنے لیے آزمائشیں ختم ہونے کی دعا نہیں کرتے تھے۔

بعض اوقات ایک مستجاب الدعوات کسی چیز کا سوال کرتا ہے، لیکن اللہ کو علم ہوتا ہے کہ اس کی بہتری اس میں نہیں، بلکہ کسی اور چیز میں ہے تو وہ اسے نہیں دیتا اور اس کی جگہ پہ وہ چیز عطا کرتا ہے جو اس کے لیے اس سے بہتر ہوتی ہے، دنیا میں یا آخرت میں۔

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''میں کسی چیز میں اتنا تردد نہیں کرتا جس کو میں کرنے والا ہوتا ہوں، جتنا تردد مجھے مومن کی جان نکالتے وقت ہوتا ہے، وہ موت کی تکلیف پسند نہیں کرتا اور مجھے بھی اسے تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا ہے۔'' اِس سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی موت کا فیصلہ کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ [آل عمران: ۱۸۵]

''ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

موت روح کے جسم سے نکلنے کا نام ہے اور ایسا بہت بڑی تکلیف سے گزرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں بندے کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ چیز کوئی نہیں۔ جب سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی موت کا وقت قریب تھا تو ان سے ان کے بیٹے نے موت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا پہلو تخت میں جکڑا ہوا ہے اور سانس لینے میں اتنی مشقت ہے جیسے میں سوئی کے سوراخ سے سانس لے رہا ہوں اور ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کانٹوں کی ایک چھڑی میرے پاؤں سے لے کر سر تک مجھے چھوئی جا رہی ہے۔

لہٰذا موت جب اتنی شدید ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حتمی قرار دے دیا ہے اور اس سے کوئی چارائے کار بھی نہیں تو اللہ تعالیٰ مومن کو اذیت پہنچانا ناپسند کرتا ہے۔ اسی کو مومن کے حق میں تردد کہا گیا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہا کرتی تھیں:

«مَا أَغْبِطُ أَحَدًا بِهَوْنِ مَوْتٍ بَعْدَ الَّذِي رَأَيْتُ مِنْ شِدَّةِ مَوْتِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ» [1]

''رسول اللہ ﷺ کی موت کی جو شدت میں نے دیکھی، اس کے بعد میں کسی کی جان آسانی سے نکلنے پر رشک نہیں کرتی۔''

[1] الترمذي، كتاب أبواب الجنائز، باب ما جاء في التشديد عند الموت، رقم الحديث (979)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مزید بیان کرتی ہیں:

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ بَيْنَ يَدَيْهِ رَكْوَةٌ ۔ وَ عُلْبَةٌ فِيهَا مَاءٌ، يَشُكُّ عُمَرَ ۔ فَجَعَلَ يُدْخِلُ يَدَيْهِ فِي الْمَاءِ، فَيَمْسَحُ بِهِمَا وَجْهَهُ، وَيَقُوْلُ: « لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ » ثُمَّ نَصَبَ يَدَهُ فَجَعَلَ يَقُوْلُ: « فِي الرَّفِيْقِ الْأَعْلَى » حَتَّى قُبِضَ وَمَالَتْ يَدُهُ.[1]

''رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت آپ کے سامنے لکڑی یا چمڑے کا ایک بڑا برتن تھا جس میں پانی تھا۔ آپ اپنا ہاتھ اس پانی میں ڈالتے، پھر اس ہاتھ کو اپنے چہرے پر پھیرتے اور فرماتے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، بلاشبہہ موت بہت سی تکلیفوں پر مشتمل ہے۔'' پھر آپ نے اپنا دستِ مبارک اوپر اٹھایا اور فرمایا: ''رفیقِ اعلیٰ کو پسند کرتا ہوں۔'' یہاں تک کہ آپ کی روح قبض کر لی گئی اور آپ کا ہاتھ مبارک نیچے ڈھلک گیا۔''

فوائدِ حدیث:

1. تمام معاصی اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلانِ جنگ ہیں۔
2. اللہ کا اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو اللہ کے اولیاء سے دشمنی کرے۔
3. فرائض کی ادائیگی نوافل پر مقدم ہے۔
4. اللہ کی محبت فرائض کی ادائیگی کے ساتھ حاصل ہوتی اور نوافل کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے۔
5. اللہ تعالیٰ جب کسی کو اپنا دوست بنا لیتا ہے تو اس کے ثمرات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔

سوالات:

1. بندہ اللہ تعالیٰ کی دوستی تک کیسے پہنچتا ہے؟ اعمال کی کچھ مثالیں ذکر کریں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔
2. ولی اللہ کی اللہ کے ہاں ایک منزلت ہے، جس کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ دلیل کے ساتھ اِس منزلت کی مزید وضاحت کریں۔

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب سكرات الموت، رقم الحديث (6510)

3 عبادات کی ادائیگی کے اعتبار سے لوگوں کی کئی قسمیں ہیں۔ کوئی میانہ رو ہوتا ہے اور کوئی نیکیوں میں سبقت لے جانے والا ہوتا ہے۔ عبادات کے ذریعے تقربِ الٰہی حاصل کرنیوالوں کے درجات دلائل کے ساتھ واضح کریں۔

4 تقربِ الٰہی کے حصول کے کئی راستے اور متعدد وسائل و اسباب ہیں تو اس کا سب سے بڑا ذریعہ کون سا ہے؟



نہایت ہی شفیق اور بڑے ہی مہربان اللہ کا درگزر کرنا

(38) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ، وَالنِّسْيَانَ، وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»[1]

''اللہ نے میری امت کو غلطی، بھول اور وہ کام معاف کر دیے ہیں جن پر انھیں مجبور کیا گیا ہو۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦] ''اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہماری پکڑ نہ کرنا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: « قَدْ فَعَلْتُ » میں نے ایسے ہی کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے: (نعم) ہاں، یعنی میں نے غلطی اور بھول چوک کو معاف کر دیا ہے۔[2] یہ دونوں روایتیں صریحاً مرفوع نہیں ہیں۔

غلطی اور بھول چوک کی معافی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''غلطی، بھول اور وہ کام معاف کر دیے ہیں جن پر کسی کو مجبور کیا گیا ہو'' تو جہاں تک غلطی اور بھول کا تعلق ہے تو قرآن مجید نے صراحتاً کہا ہے کہ یہ دونوں چیزیں معاف کر دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہماری پکڑ نہ کرنا۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾ [الأحزاب: ٥]

---

(1) سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب طلاق المكره، رقم الحديث (2045)

(2) مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان أنه سبحانه وتعالى لم يكلف إلا ما يطاق، رقم الحديث: 200,199 (126,125)

''اور کوئی بات تم بھول چوک کی بنا پر کہہ دو تو اس میں تم پر کوئی گرفت نہیں، مگر جو دل کے ارادہ سے کہو (تو اس پر ضرور گرفت ہوگی۔)''

صحیحین میں سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ»

''جب حاکم اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے پھر وہ فیصلہ صحیح ہو تو اسے دوگنا ثواب ملتا ہے اور اگر فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے اور غلط کر جائے تو اسے صرف ایک اجر وثواب ہوتا ہے۔''

امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ایک بات ذکر نہ کی ہوتی تو میں سمجھتا ہوں کہ قاضی ہلاک ہو جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کے علم کی تعریف کی اور دوسرے کو ان کے اجتہاد کی وجہ سے معذور قرار دیا۔ اس کا فرمان ہے:

﴿وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ﴿٧٨﴾ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فَاعِلِينَ﴾ [الأنبياء: ٧٨۔ ٧٩]

''اور داود و سلیمان علیہما السلام جب کھیتی کے معاملے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں گھس گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔ پس ہم نے وہ فیصلہ سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا اور دونوں میں سے ہر ایک کو ہم نے پیغمبری اور علم دیا تھا اور ہم نے پہاڑوں کو داود علیہ السلام کے تابع بنا دیا تھا، وہ تسبیح پڑھتے تھے اور چڑیوں کو بھی تابع بنا دیا تھا اور یہ ہم نے کیا تھا۔''

جہاں تک مجبور کیے جانے کا تعلق ہے تو قرآن مجید میں اس کی بھی تصریح موجود ہے کہ وہ معاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾

[النحل: ١٠٦]

''جس شخص نے ایمان لانے کے بعد اللہ سے کفر کیا، اِلا یہ کہ وہ مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو یہ معاف ہے)۔''

(1) البخاري، كتاب الاعتصام، باب أجر الحاكم إذا اجتهد، رقم الحديث (7352) ومسلم: كتاب الأقضية، باب بيان أجر الحاكم إذا اجتهد، رقم الحديث: 15 (1716)

اب ہم اِس حدیث کے دواہم مسائل پر گفتگو کرتے ہیں:

⊙ پہلا مسئلہ: خطا اور نسیان کا حکم۔

⊙ دوسرا: اکراہ (مجبور کرنے) کا حکم۔

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے تو ''خطا'' سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے کسی فعل سے ایک چیز کا قصد کرے لیکن اس کے فعل سے وہ چیز واقع ہو جائے جس کا اس نے قصد نہ کیا ہو۔ مثلاً: اس نے کسی کافر کو قتل کرنے کا قصد کیا ہو لیکن مسلمان قتل ہو جائے اور ''نسیان'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک چیز کو یاد کیے ہوئے ہو لیکن جب اس کو کرنا ہو تو وہ اسے بھول جائے۔ یہ دونوں معاف ہیں، یعنی ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا لیکن گناہ نہ ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس پر کوئی حکم مرتب نہیں ہوتا۔

⊙ جو شخص وضو کرنا بھول جائے اور اس کو گمان ہو کہ وہ باوضو ہے، پھر وہ نماز پڑھ لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِس کے بعد اسے پتا چلے کہ اس نے بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے تو اس پر نماز دہرانا لازم ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب ہے، اور کوئی شخص اسے پڑھنا بھول جائے تو کیا اس پر وضو دوبارہ کرنا لازم ہے؟ اِس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایتیں ہیں۔

⊙ اگر کوئی شخص جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو اس کے بارے میں بھی دو روایتیں ہیں۔ جبکہ اکثر فقہاء اِس بات کے قائل ہیں کہ وہ جانور حلال ہے اور اسے کھایا جا سکتا ہے۔

⊙ اگر کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے، پھر اسے یاد آ جائے تو اس پر اسے قضا کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ ﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ [طٰهٰ: ١٤]»[1]

''جو شخص نماز بھول جائے تو یاد آتے ہی اسے پڑھ لے، اس کا یہی کفارہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: میری یاد کے لیے نماز قائم کیجیے۔''

⊙ اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لے تو اکثر اہل علم کے نزدیک اس کا روزہ باطل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

[1] البخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب من نسي صلاة، رقم الحديث (597) ومسلم، كتاب المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، رقم الحديث: 314 (684).

«مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ وَ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ» [1]

''جو شخص روزے کی حالت میں بھول گیا اور کھا لیا یا پی لیا تو وہ اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اس کو اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔''

- اگر کوئی شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس پر کفارہ اور دیت لازم ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں صراحتاً موجود ہے۔
- اسی طرح اگر وہ کسی کا مال غلطی سے تلف کر بیٹھے، یہ گمان کرتے ہوئے کہ وہ مال اس کا اپنا ہے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے نقصان کا ازالہ کرے۔

احرام کی حالت میں غلطی سے یا بھول کر شکار کرنے کا حکم:

اگر کوئی شخص احرام کی حالت میں غلطی سے یا بھول کر شکار کر لے تو جمہور اہلِ علم کے نزدیک اس پر فدیہ لازم ہے۔ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اس پر کوئی فدیہ نہیں۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت بھی ہے۔ ہاں اگر وہ جان بوجھ کر ایسے کرے تو اسے یقیناً فدیہ دینا ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان سے بظاہر ایسے ہی لگتا ہے:

﴿ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ﴾ [المائدة: ٩٥]

''اور جس نے دیدہ دانستہ شکار مارا تو اس کا بدلہ مویشیوں میں سے اسی شکار کے ہم پلہ جانور ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں اور یہ جانور کعبہ لے جا کر قربانی کیا جائے۔ یا چند مسکینوں کو کھانا کھلانا یا اس کے برابر روزے رکھنا اس کا کفارہ ہے۔''

اِس آیت سے بظاہر یوں لگتا ہے کہ بھول کر شکار کرنے والے شخص پر کوئی فدیہ نہیں ہے، لیکن جمہور اہلِ علم نے اِس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر شکار کرنے والے شخص پر فدیہ مرتب کیا ہے اور اسے اپنے انتقام کی دھمکی دی ہے۔ یہ دونوں چیزیں متعمد کے ساتھ خاص ہیں۔ لہٰذا جب تعمد نہیں ہوگا تو انتقام نہیں ہوگا، لیکن دوسری دلیل کی بنیاد پر فدیہ باقی رہے گا۔

تاہم جو بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بھول کر یا غلطی سے شکار کرنے والا شخص قابلِ

[1] البخاري، كتاب الصوم، باب الصائم إذا أكل أو شرب ناسيا، رقم الحديث (1933) ومسلم: كتاب الصيام، باب أكل الناسي وشربه، رقم الحديث: 171 (1155)

معافی ہے، یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ گناہ مقصد اور نیت پر مرتب ہوتا ہے، جبکہ بھول کر یا غلطی سے شکار کرنے والے کا اس میں قصد نہیں ہوتا، لہٰذا وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ باقی جہاں تک بھول کر یا غلطی سے شکار کرنے کی صورت میں اس سے فدیہ وغیرہ کے احکام کو ختم کرنے کا معاملہ ہے تو مذکورہ دلائل سے یہ ثابت نہیں ہوتا، اس کے ثبوت ونفی کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

جہاں تک جبر وزبردستی کا تعلق ہے تو اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جس شخص کو کسی کام پر اِس طرح مجبور کر دیا جائے کہ اس کو قطعاً کوئی اختیار حاصل نہ ہو اور اس کام کو چھوڑنے کی طاقت نہ ہو، جیسے:

- ایک شخص کو زبردستی اٹھا کر ایسی جگہ پہ پہنچا دیا جائے جہاں اس نے نہ جانے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔
- کسی کو زبردستی اٹھا کر لے جایا جائے اور اس کے ذریعے کسی کو مروایا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ اسے اس سے بچنے کی طاقت حاصل نہ ہو۔
- کسی عورت کو زبردستی لٹا کر اس سے زنا کیا جائے، اسے اس سے بچنے کی طاقت حاصل نہ ہو۔

تو ان تمام صورتوں میں گناہ نہیں ہوتا، پہلی صورت میں قسم توڑنے کا کفارہ بھی واجب نہیں ہوتا۔

دوسری قسم: کسی شخص کو مارتے ہوئے یا کسی اور طریقے سے دھمکی دیتے ہوئے اسے زبردستی کوئی کام کرنے پر مجبور کر دیا جائے، یہاں تک کہ وہ اس کام کو کر لے۔ اِس صورت میں اگر وہ کوئی ایسا کام کرتا ہے تو وہ صرف اپنے آپ کو بچانے کی خاطر کرتا ہے، نہ کہ اپنی رغبت سے۔

علماء کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ اگر ایک بندے کو کسی بے گناہ شخص کے قتل پر مجبور کر دیا جائے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں، کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو صرف اپنی جان کو بچانے کی خاطر ایک بے گناہ کو قتل کرنے والا ہوگا۔ لہٰذا وہ اپنی جان کو قربان کر دے لیکن کسی بے گناہ کو قتل نہ کرے، اِس پر معتبر علماء کا اجماع ہے۔ اگر وہ قتل کرے گا تو جمہور اہلِ علم کہتے ہیں کہ قصاص میں مجبور کرنے والا اور مجبور کیا جانے والا دونوں مشترک ہوں گے۔ یہ امام مالک، امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ قصاص صرف مجبور کرنے والے شخص سے لیا جائے گا۔ مجبور کیا جانے والا شخص تو صرف آلۂ قتل کے طور پر استعمال ہوا۔

اگر کسی شخص کو شراب نوشی یا اس جیسے کسی اور حرام کام پر زبردستی مجبور کر دیا جائے تو اس کے جواز کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا: یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ یہ جمہور فقہاء مثلاً: امام شافعی، ابو حنیفہ اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَنْ يُكْرِهْهُنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [النور: ۳۳]

''تمھاری جو لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہیں انھیں دنیا کی زندگی کے فائدے کی غرض سے بدکاری پر مجبور نہ کرو اور جو انھیں مجبور کر دے تو اللہ تعالیٰ ان پر جبر کے بعد بخش دینے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔''

یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول کے بارے میں نازل ہوئی جس کی دو لونڈیاں تھیں اور وہ انھیں زنا کاری پر مجبور کرتا تھا جبکہ وہ دونوں اس سے انکار کرتی تھیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر زبردستی اقوال میں ہو تو جائز ہے، افعال میں ہو تو نا جائز ہے۔

جہاں تک اقوال میں زبردستی کا تعلق ہے تو علماء اِس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی شخص کو کوئی ایسی بات کہنے پر مجبور کیا جائے جسے کہنا حرام ہو، اور شرعی لحاظ سے معتبر زبردستی ہو رہی ہو تو وہ اپنی جان بچانے کی خاطر ایسا کر سکتا ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ [النحل: ۱۰۶]

''جس شخص نے ایمان لانے کے بعد اللہ سے کفر کیا، اِلا یہ کہ وہ مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو یہ معاف ہے)۔''

اور نبی کریم ﷺ نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا: «إِنْ عَادُوا فَعُدْ» ''اگر وہ تمھیں دوبارہ سزا دیں تو تم بھی دوبارہ وہ بات کہہ دینا جس کے لیے وہ تمھیں مجبور کر رہے ہوں۔'' مشرک انھیں عذاب دیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ کفریہ کلمات کہہ دیں جو وہ ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے ہی کیا۔[1]

جہاں تک افعال میں زبردستی کا تعلق ہے تو اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ میں نے فلاں کام نہیں کرنا، پھر اسے مجبور ہو کر کر لے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق وہ قسم توڑنے والا ہوگا، جبکہ جمہور کے نزدیک اس کے بارے میں دو قول ہیں: پہلا یہ ہے کہ اگر اس کے لیے اس سے بچنا ممکن نہیں تھا تو وہ قسم

---

(1) أخرجه الحاكم في المستدرك (357/2) والبيهقي في السنن (208/8)

توڑنے والا نہیں ہوگا۔ یہ ان میں سے زیادہ تر علماء کا موقف ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ وہ قسم توڑنے والا ہوگا، کیونکہ اس نے اسے اپنے اختیار سے کیا۔ وہ اگر چاہتا تو اس سے بچ سکتا تھا۔ برخلاف اس کے جسے اٹھایا جائے اور اس سے کوئی کام اِس طرح زبردستی کرایا جائے کہ اس کے لیے بچنا ممکن نہ ہو۔ یہ ایک روایت کے مطابق امام احمد اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

اگر ایک بندے پر زبردستی کے بعد وہ خود بھی اس کام پر راضی ہوجائے جس پر اسے مجبور کیا جا رہا تھا تو وہ اِس حالت میں جتنے معاہدے کرے گا وہ سارے درست مانے جائیں گے۔ یہی بات حنابلہ کے ہاں مشہور ہے۔

لیکن اگر زبردستی برحق ہو تو وہ اس چیز کے لزوم سے مانع نہیں جس پر کسی کو مجبور کیا گیا۔ مثلاً: کسی حربی کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، پھر وہ مسلمان ہوگیا تو اس کا اسلام صحیح ہوگا۔ اسی طرح اگر حاکمِ وقت ایک بندے کو مجبور کرے کہ وہ اپنا مال بیچ دے تاکہ وہ اپنا قرضہ اتار سکے، یا ایلاء کرنے والے کو طلاق پر مجبور کرے جب ایلاء کی مدت ختم ہوچکی ہو اور وہ رجوع نہ کر رہا ہو، تو یہ بھی درست ہے۔ اگر کوئی شخص حلف اٹھائے کہ وہ اپنا قرضہ واپس نہیں لوٹائے گا، پھر حاکم نے اسے واپس لوٹانے پر مجبور کیا تو وہ قسم توڑنے والا ہوگا، کیونکہ اس نے وہ کام کیا جس پر اس نے حقیقت میں بایں طور حلف اٹھایا تھا کہ اس میں وہ معذور نہیں تھا۔ برخلاف اِس کے کہ اگر وہ قرضہ واپس نہ کرتا، پھر حاکم اس کی طرف سے قرضہ ادا کر دیتا تو وہ قسم توڑنے والا نہ ہوتا، کیونکہ جس چیز پر اس نے قسم کھائی تھی وہ ہوا ہی نہیں۔

فوائدِ حدیث:

1. اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت ہے کہ وہ خطا، نسیان اور ان کاموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا جن پر کسی کو زبردستی مجبور کیا جائے۔
2. کسی گناہ پر سزا تب ہوتی ہے جب علم اور قصد دونوں ہوں۔
3. خطا اور نسیان میں گناہ نہ ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ دوسرے احکام بھی مرتب نہیں ہوتے، جیسا کہ ایک بندہ بھول کر بغیر وضو کے نماز پڑھ لے تو گناہ نہیں ہوگا، لیکن نماز درست نہیں ہوگی۔ اسی طرح قتلِ خطا میں گناہ نہیں ہوگا، لیکن دیت دینی پڑے گی۔
4. دوسروں پر قتل کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد اِکراہ کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔

سوالات:

1 اگر کسی بے گناہ کو قتل کرنے پر کسی کو مجبور کیا جائے تو کیا وہ معذور ہوگا؟ اور کیوں؟

2 جو بندہ اپنا مال گمان کرتے ہوئے کسی کے مال کو تلف کر دے تو کیا حکم ہے؟

3 جو شخص طواف افاضہ بھول جائے، کیا وہ گناہ گار ہوگا؟ اس کا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور کیوں؟

4 جو شخص مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ دے تو کیا حکم ہے؟ دلیل کے ساتھ جواب دیں۔

5 درج ذیل صورتوں میں بندہ قسم توڑنے والا ہوگا یا نہیں؟:

- حربی کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔
- ایک شخص نے قرضہ واپس نہ کرنے پر قسم کھالی، پھر حاکم نے اس کی طرف سے قرضہ ادا کر دیا۔
- ایلاء کرنے والے شخص کو طلاق دینے پر مجبور کیا گیا۔
- جس بندے کو مجبور کیا گیا، دورانِ اکراہ اس کی رضامندی بھی شامل ہوگئی۔



دنیا سے بے رغبتی

39 سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا شانہ پکڑ کر فرمایا:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»

وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ، يَقُولُ: "إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ"[1]

"دنیا میں اس طرح رہو گویا تم اجنبی ہو یا مسافر ہو۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: "شام ہو جائے تو صبح کے منتظر نہ رہو اور صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو۔ تندرستی کی حالت میں وہ عمل کرو جو بیماری کے دنوں میں کام آئے اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت خیال کرو۔"

دنیا سے گزر جاؤ، اس کو تعمیر نہ کرو:

یہ حدیث دنیا میں کم امیدی کے بارے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا مومن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ دنیا کو اپنا وطن اور مستقل گھر بنا کر اس میں مطمئن ہو جائے، بلکہ اسے اس میں ایک مسافر کی طرح ہونا چاہیے جو رختِ سفر باندھ رہا ہو۔ اِس بات پر تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کی وصیتیں بالکل ایک جیسی رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مومنِ آلِ فرعون کے بارے میں فرماتا ہے کہ اس نے کہا تھا:

﴿يَٰقَوْمِ إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا مَتَٰعٌ وَإِنَّ الْءَاخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ﴾ [الغافر: ٣٩]

"اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیاوی زندگی چند دن کی لذت ہے اور بے شک آخرت ہی ہمیشہ کا گھر ہے۔"

اور نبی کریم ﷺ فرماتے تھے:

---

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب قول النبي ﷺ: «كن في الدنيا كأنك غريب»، رقم الحديث (6416)

«مَا لِي وَمَا لِلدُّنْيَا؟ مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا»[1]

''مجھے دنیا سے کیا مطلب ہے؟! میری اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سوار ہو جو ایک درخت کے نیچے سایہ حاصل کرنے کے لیے بیٹھے، پھر وہاں سے کوچ کر جائے اور درخت کو اسی جگہ چھوڑ دے۔''

اور المسیح علیہ السلام کی اپنے ساتھیوں کے لیے وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ تھی:

«اُعْبُرُوهَا وَلَا تَعْمُرُوهَا» ''دنیا سے گزر جاؤ، اس کو تعمیر نہ کرو۔''

اسی طرح ان سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: کون ہے جو سمندر کی موجوں پر گھر بنا سکتا ہے؟ یہی دنیا کی مثال ہے۔ لہٰذا تم اسے جائے قرار نہ بناؤ۔

ایک آدمی سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا تو ان کے گھر کو بغور دیکھنے لگا، پھر پوچھا: ابوذر! آپ لوگوں کا سامان کہاں ہے؟ تو انھوں نے کہا: ہمارا ایک گھر ہے جس کے لیے ہم سامان تیار کر رہے ہیں۔ تو اس نے کہا: آپ جب تک یہاں ہیں تب تک تو آپ کے پاس کچھ نہ کچھ سامان ہونا چاہیے؟ تو انھوں نے کہا: گھر والا ہمیں اس میں چھوڑنے والا نہیں۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: دنیا پیٹھ پھیر کر جا رہی ہے اور سامنے سے آخرت آ رہی ہے۔ دنیا و آخرت دونوں کے چاہنے والے ہوتے ہیں، لہٰذا تم سب آخرت کو چاہنے والے بنو اور دنیا کو چاہنے والے نہ بنو، کیونکہ آج کے دن عمل بغیر حساب کے ہے اور کل حساب بغیر عمل کے ہے۔

دنیا میں مومن کا حال:

جب دنیا مومن کے لیے مستقل اقامت گاہ اور وطن نہیں تو اسے اس میں دو میں سے ایک حال پر ہونا چاہیے: یا تو وہ اس میں ایک اجنبی کی طرح رہے جو اجنبی ملک میں ہو جس کو صرف اِس بات کی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد اپنے وطن کو لوٹ جائے، یا پھر ایک مسافر کی طرح ہو جو کہیں بھی مقیم نہ ہو، بلکہ دن رات اپنی اقامت گاہ کی طرف چلتا رہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وصیت کی کہ وہ دنیا میں انھی دو حالتوں میں سے ایک حالت پر رہیں۔ ان میں

[1] الترمذي، كتاب الزهد، باب حدثنا موسى بن عبد الرحمن، رقم الحديث (2377) وابن ماجه، كتاب الزهد، باب مثل الدنيا، رقم الحديث (4109) بمعناه.

سے پہلی حالت یہ ہے کہ مومن اپنے آپ کو دنیا میں اجنبی تصور کرے، وہ اقامت کا تصور تو کرے لیکن ایک اجنبی ملک میں۔ لہٰذا اس کا دل اجنبی ملک کے ساتھ معلق نہیں ہوگا، بلکہ اس وطن کے ساتھ ہوگا جس کی طرف اسے لوٹ کر جانا ہے۔ وہ دنیا میں ایسے ہوگا جیسے ایک بندہ اپنی سواری اور ساز وسامان کی اصلاح کے لیے کہیں پر رکے اور پھر اپنے وطن کی طرف روانہ ہو جائے۔

امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"مومن دنیا میں ایک اجنبی کی طرح ہوتا ہے جو نہ اس کی ذلت سے گھبراتا ہے اور نہ اس کی عزت میں راغب ہوتا ہے۔ اس کا معاملہ الگ اور لوگوں کا معاملہ الگ ہوتا ہے۔"

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو انھیں اور ان کی بیوی کو جنت میں رہائش دی، پھر انھیں زمین پر اتار دیا گیا اور ان سے وعدہ کیا گیا کہ انھیں اور ان کی نیک اولاد کو دوبارہ اسی جنت میں لوٹایا جائے گا۔ سو مومن اپنے پہلے وطن کی طرف لوٹنے کے لیے بیتاب رہتا ہے اور وطن کی محبت ایمان میں سے ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

وَكَمْ مَنْزِلٍ لِلْمَرْءِ يَأْلَفُهُ الْفَتَى ۔۔۔ وَحَنِيْنُهُ أَبَدًا لِأَوَّلِ مَنْزِلِ

"آدمی کی کتنی منزلیں ہیں جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ لیکن اس کا شوق ہمیشہ پہلی منزل کی طرف ہی رہتا ہے۔"

بعض مشائخ کا کہنا ہے:

فَحَيَّ عَلَى جَنَّاتِ عَدْنٍ فَإِنَّهَا ۔۔۔ مَنَازِلُكَ الْأُوْلَى وَفِيْهَا الْمُخَيَّمُ

"لہٰذا تم آؤ ان ہمیشہ رہنے والے باغات کی طرف جو کہ تمھاری پہلی منزلیں ہیں (کیونکہ آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو وہیں سے نکالا گیا تھا) اور انہی باغات میں خیمہ گاہ بھی ہے۔"

وَلَكِنَّنَا سَبِيُّ الْعَدُوِّ فَهَلْ تَرَى ۔۔۔ نَعُوْدُ إِلَى أَوْطَانِنَا وَنُسَلَّمُ؟

"لیکن ہم تو دشمن (شیطان) کے قیدی بن گئے ہیں، سو تمھارا کیا خیال ہے کہ ہم اپنے وطنوں کی طرف صحیح سالم لوٹ جائیں گے؟"

وَقَدْ زَعَمُوْا أَنَّ الْغَرِيْبَ إِذَا نَأَى ۔۔۔ وَشَطَّتْ بِهِ أَوْطَانُهُ لَيْسَ يَنْعَمُ

"لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ایک اجنبی آدمی جب دور چلا جاتا ہے اور مختلف ملکوں میں سرگرداں رہتا ہے تو وہ کبھی خوشحال نہیں رہتا۔"

وَأَيُّ اغْتِرَابٍ فَوْقَ غُرْبَتِنَا الَّتِي لَهَا أَضْحَتِ الْأَعْدَاءُ فِينَا تَحَكَّمُ؟

''اور کون سی جلا وطنی ہماری جلا وطنی سے بڑی ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے دشمن ہمارے فیصلے کرنے لگے ہیں!''

دوسری حالت یہ ہے کہ مومن اپنے آپ کو دنیا میں یوں سمجھے جیسے ایک مسافر ہوتا ہے، جو کبھی کہیں مقیم نہیں ہوتا، بلکہ سفر کی منزلوں کو طے کرنے میں لگا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کا سفر اسے اس کی آخری منزل (موت) تک پہنچا دیتا ہے۔ دنیا میں جس کی یہ حالت ہوتی ہے اسے بس سفر کے لیے ضروری زادِ راہ کی فکر ہوتی ہے، زیادہ ساز و سامان کی نہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وصیت فرمائی کہ دنیا سے ان کا حصہ بس اتنا ہی ہو جتنا ایک مسافر کا زادِ راہ ہوتا ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا:

''تمھاری زندگی بس چند ایام کا نام ہے، جب ایک دن گزر جاتا ہے تو تمھاری زندگی کا ایک حصہ گزر جاتا ہے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے ایک آدمی سے کہا: تمھاری عمر کتنی ہے؟ اس نے کہا: ساٹھ سال۔ انھوں نے کہا: تم ساٹھ سال سے اپنے رب کی طرف جا رہے ہو، بہت قریب ہے کہ پہنچ جاؤ گے۔ تو آدمی نے کہا: إنّا للّٰه وإنّا إليه راجعون۔ انھوں نے کہا: کیا تم اس کی تفسیر جانتے ہو؟ تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کی طرف لوٹنے والا ہوں اور جس بندے کو پتا ہو کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کی طرف لوٹنے والا ہے تو وہ یہ جان لے کہ اسے اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ اور جو یہ جان لے کہ اسے اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا تو وہ اِس بات پر یقین کر لے کہ اس سے پوچھ گچھ بھی ہوگی اور جس کو یہ پتا ہو کہ اس سے پوچھ گچھ ہوگی تو وہ سوالوں کے جوابات بھی تیار کر لے۔ اس آدمی نے پوچھا: لٰہذا اب کیا کیا جائے؟ انھوں نے کہا: آسان ہے۔ اس نے کہا: کیا؟ انھوں نے کہا: اب جو زندگی باقی ہے اس میں اچھے عمل کرتے رہو، تمھارے ماضی کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر تم بقیہ زندگی میں بھی وہی کرتے رہے جو ماضی میں کرتے تھے تو ماضی پر بھی پکڑ ہوگی اور بقیہ زندگی پر بھی اور اسی معنی میں کسی شاعر کا کہنا ہے:

وَإِنَّ امْرَءً قَدْ سَارَ خَمْسِينَ حِجَّةً إِلَى مَنْهَلٍ مِنْ وِرْدِهِ لَقَرِيبُ

''اور ایک آدمی پچاس سال تک اپنے چشمے کی طرف چلتا رہے تو وہ اس کے قریب پہنچ ہی جاتا ہے۔''

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی وصیت:

جہاں تک سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی وصیت کا تعلق ہے تو وہ اسی حدیث سے ماخوذ ہے جس کے راوی وہ خود ہیں اور اس میں دنیا سے کم امیدی کی انتہا شامل ہے اور یہ کہ انسان جب شام کر لے تو صبح کے انتظار میں نہ بیٹھا رہے اور جب صبح کر لے تو شام کے انتظار میں نہ بیٹھا رہے، بلکہ وہ یقین کر لے کہ اس کی موت اس سے پہلے آ سکتی ہے۔

بہت سارے علماء نے زہد فی الدنیا کی یہی تفسیر کی ہے۔ چنانچہ مروزی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ رحمہ اللہ (امام احمد) سے کہا: زہد فی الدنیا کسے کہتے ہیں؟ تو انھوں نے کہا: بندہ جب صبح کر لے تو وہ دنیا سے کم امیدی کا اظہار کرتے ہوئے کہے: میں آج شام نہیں کروں گا۔ مروزی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ امام سفیان رحمہ اللہ نے بھی اسی چیز کو زہد فی الدنیا قرار دیا۔ جبکہ سلف میں سے بعض کا کہنا ہے کہ میں جب بھی سویا تو یہ سوچ کر سویا کہ میں اس نیند سے بیدار نہیں ہوں گا اور بکر المزنی رحمہ اللہ کہتے ہیں: تم میں سے ہر شخص اگر اس بات کی استطاعت رکھتا ہو کہ وہ رات اِس حالت میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے سر کے پاس لکھی ہوئی موجود ہو تو وہ ایسا ضرور کرے، کیونکہ اسے نہیں پتا شاید وہ رات دنیا والوں میں گزارے اور صبح کے وقت آخرت والوں میں ہو۔

ابو العتاہیہ کا کہنا ہے:

وَمَا أَدْرِيْ وَإِنْ أَمَّلْتُ عُمْرًا لَعَلِّيْ حِيْنَ أُصْبِحَ لَسْتُ أُمْسِيْ

''میں اگرچہ لمبی عمر پانے کی امید رکھتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ میں جب صبح کروں گا تو شاید شام تک زندہ نہ رہوں۔''

أَلَمْ تَرَ أَنَّ كُلَّ صَبَاحِ يَوْمٌ وَعُمْرُكَ فِيْهِ أَقْصَرُ مِنْ أَمْسِ

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہر دن صبح کے وقت تمھاری عمر کل کی نسبت کم ہو چکی ہوتی ہے!''

اور سلف میں سے بعض کا کہنا ہے:

إِنَّا لَنَفْرَحُ بِالْأَيَّامِ نَقْطَعُهَا وَكُلُّ يَوْمٍ مَضَى يُدْنِيْ مِنَ الْأَجَلِ

''ہم گزرے دنوں کے ساتھ یقینی طور پر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ ہر گزرا ہوا دن ہمیں موت کے قریب کر رہا ہے۔''

فَاعْمَلْ لِنَفْسِكَ قَبْلَ الْمَوْتِ مُجْتَهِدًا فَإِنَّمَا الرِّبْحُ وَالْخُسْرَانُ فِي الْعَمَلِ

''لٰہذا تم موت سے پہلے خوب عمل کرلو، کیونکہ گھاٹا اور نفع عمل ہی میں ہوتا ہے۔''

عقلمندوں کا کام:

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا کہ ''تندرستی کی حالت میں وہ عمل کرو جو بیماری کے دنوں میں کام آئے اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت خیال کرو۔'' تو اِس کا معنی یہ ہے کہ تم صحت وتندرستی کی حالت میں اعمالِ صالحہ کرلو، اِس سے پہلے کہ تمھارے اور ان کے درمیان بیماری حائل ہو جائے۔ اسی طرح زندگی کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس میں کثرت سے نیک اعمال کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے اور ان کے درمیان موت حائل ہو جائے۔ ان کی اِس وصیت کا یہی معنی ومفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے مروی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ» [1]

''دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اکثر لوگ ان میں گھاٹے میں رہتے ہیں: صحت اور فراغت۔''

اسی طرح مستدرک حاکم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ» [2]

''تم پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو: اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اپنی تونگری کو اپنی غربت سے پہلے، اپنی فراغت کو اپنی مصروفیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا: طُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، أَوِ الدُّخَانَ، أَوِ الدَّجَّالَ، أَوِ الدَّابَّةَ، أَوْ خَاصَّةَ أَحَدِكُمْ، أَوْ أَمْرَ الْعَامَّةِ» [1]

[1] البخاري، كتاب الرقاق، باب ما جاء في الرقاق، رقم الحديث (6412)

[2] المستدرك (306/4) صحيح الترغيب والترهيب (3355)

[3] مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب في بقية من أحاديث الدجال، رقم الحديث: 128 (2947)

''چھ چیزوں کے ظہور سے پہلے نیک عمل کرنے میں جلدی کرو: سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دھواں، دجال، زمین کا چوپایا، خاص طور پر تم میں سے کسی ایک کو پیش آنے والا معاملہ (بیماری، عاجز کر دینے والا بڑھاپا یا کوئی رکاوٹ) اور ہر کسی کو پیش آنے والا معاملہ (مثلاً: اجتماعی گمراہی، فتنے کے زمانے میں قتلِ عام، قیامت سے پہلے)۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں تمھارے اور تمھارے اعمال کے درمیان رکاوٹ بن سکتی ہیں، بعض چیزیں انسان کے لیے خاص ہیں، مثلاً: غربت، مرض، بڑھاپا اور موت۔ اور بعض چیزیں عام ہیں، مثلاً: قیامت کا قائم ہونا، دجال کا نکلنا اور اسی طرح خوفناک فتنے۔ ان عام امور میں سے بعض ایسے ہیں جن کے ظہور کے بعد عمل سرے سے فائدہ مند ہی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ﴾ [الأنعام: ١٥٨]

''جس دن کوئی ایسا معجزہ آ گیا تو اس وقت کسی کا ایمان لانا اسے کچھ فائدہ نہ دے گا جو اس سے پیشتر ابھی تک ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان کی حالت میں نیکی کے کام نہ کیے ہوں۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«ثَلَاثٌ إِذَا خَرَجْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ، أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا: طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَالدَّجَّالُ، وَدَابَّةُ الْأَرْضِ»[1]

''تین چیزیں ہیں، جب ان کا ظہور ہو جائے گا تو اس وقت کسی شخص کو جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا، یا اپنے ایمان کے دوران میں کوئی نیکی نہ کی تھی، اس کا ایمان لانا فائدہ نہ دے گا: سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال اور زمین سے ایک عجیب الخلقت جانور کا نکلنا۔''

لہٰذا مومن پر لازم ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ میں جلدی کرے، اس سے پہلے کہ اسے ان پر قدرت حاصل نہ ہو اور اس کے اور ان اعمال کے درمیان کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ بیماری، یا موت، یا بعض ایسی نشانیاں کہ جن کے ظہور کے بعد عمل قبول ہی نہیں کیا جائے گا اور جب انسان اور عمل کے درمیان رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس کے بعد سوائے حسرت وندامت کے اور کچھ باقی نہیں رہتا اور انسان تمنا کرتا ہے کہ وہ اس حالت میں واپس پلٹ جائے جس میں اس کے لیے عمل کرنا ممکن ہو، لیکن وہ تمنا اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتی۔

[1] مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الزمن الذي لا يقبل فيه الإيمان، رقم الحديث: 249 (158)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [الزمر: ٥٤۔ ٥٨]

''اور اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کا حکم مان لو قبل اس کے کہ تم پر عذاب آئے، پھر تمھیں کہیں سے مدد بھی نہ مل سکے۔ اور جو کچھ تمھاری طرف تمھارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوا ہے اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرو، پیشتر اس کے کہ اچانک تم پر عذاب آجائے اور تمھیں خبر بھی نہ ہو۔ (کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت) کوئی کہنے لگے: افسوس! میری اس کوتاہی پر جو میں اللہ کے حق میں کرتا رہا اور میں تو مذاق اڑانے والوں میں سے تھا۔ یا یوں کہے: اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں پرہیزگاروں سے ہوتا۔ یا جب عذاب دیکھے تو کہنے لگے: مجھے ایک اور موقع مل جائے تو میں نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں۔''

اسی طرح ارشاد فرمایا:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾

[المؤمنون: ٩٩۔ ١٠٠]

''(یہ لوگ اپنی کارستانیوں میں لگے رہیں گے) یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو جب موت آئے گی تو کہے گا: پروردگار! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے، جسے میں چھوڑ آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ بس ایک بات ہوگی جسے اس نے کہہ دیا۔ اور ان (مرنے والوں) کے درمیان دوبارہ جی اٹھنے کے دن تک ایک آڑ حائل ہوگی۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ

اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۱۰]

''اور جو کچھ ہم نے تمھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، اِس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے تو کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی مدت اور کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کر لیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ حالانکہ جب کسی کی موت آ جائے تو پھر اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔''

فوائدِ حدیث:

1. حدیث میں نبی ﷺ کی اپنے صحابہ کے لیے نصیحت کا ذکر ہے۔
2. یہ حدیث دنیا سے کم امیدی کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔
3. زہد فی الدنیا کی طرف انبیائے کرام علیہم السلام دعوت دیتے رہے۔
4. آدم کے بیٹے کی زندگی چند دنوں پر مشتمل ہے۔ جب ایک دن گزر جاتا ہے تو اس کی زندگی کا ایک حصہ چلا جاتا ہے۔
5. عقلمند انسان پر واجب ہے کہ وہ وقت کے فوت ہونے سے پہلے نیک اعمال میں جلدی کر لے۔

سوالات:

1. نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا کیا معنی ہے: « كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ »
2. اس حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ مسلمان کا دنیا سے تعلق کس قسم کا ہونا چاہیے؟
3. اِس حدیث اور ''إنا لله وإنا إليه راجعون'' پڑھنے کے درمیان کیا تعلق ہے؟
4. زہد کی تعریف بیان کریں پھر سلف کے زہد کی ایک مثال ذکر کریں۔
5. نبی کریم ﷺ کے ارشاد: « خُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِسُقْمِكَ » کا کیا مفہوم ہے؟



باری تعالیٰ کی مغفرت کی وسعت

40 سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

« قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَ فِيكَ وَلَا أُبَالِي، يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِي، يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئاً لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً »[1]

''اللہ کہتا ہے: اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا، چاہے تیرے گناہ کسی بھی درجے پر پہنچے ہوئے ہوں، مجھے کسی بات کی پروا و ڈر نہیں ہے۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگیں، پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرنے لگے تو میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے کسی بات کی پروا نہ ہوگی۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین برابر بھی گناہ کر بیٹھے اور پھر مجھ سے (مغفرت طلب کرنے کے لیے) ملے لیکن میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اس کے برابر مغفرت لے کر آؤں گا (اور تجھے بخش دوں گا)۔''

یہ حدیث صحاح ستہ میں سے صرف سنن ترمذی میں ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ اس کے بعض حصے کچھ دیگر طرق سے بھی مروی ہیں۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَأَزِيدُ، وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَجَزَاءُهُ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا أَوْ أَغْفِرُ، وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْراً تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعاً، وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعاً، وَمَنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً، وَمَنْ لَقِيَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيئَةً لَا يُشْرِكُ بِي شَيْئاً لَقِيتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً »[2]

---

[1] الترمذي، كتاب الدعوات، باب فضل التوبة، رقم الحديث (3540)

[2] مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب أفضل الذكر والدعاء، رقم الحديث: 22 (2687)

''اللہ عزوجل فرماتا ہے: جو شخص ایک نیکی لے کر آتا ہے، اسے اس جیسی دس ملتی ہیں اور میں بڑھا (بھی) دیتا ہوں اور جو شخص برائی لے کر آتا ہے تو اس کا بدلہ اس جیسی ایک برائی ہے یا (چاہوں تو) معاف کر دیتا ہوں۔ جو ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں۔ اور جو ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھوں کے پھیلا جتنا اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور جو میرے پاس چلتا ہوا آتا ہے، میں اس کے پاس دوڑتا ہوا جاتا ہوں اور جو مجھ سے پوری زمین کی وسعت بھر گناہوں کے ساتھ ملاقات کرتا ہے (اور) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا، میں اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملاقات کرتا ہوں۔''

مغفرت کے اسباب:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تین اسباب ذکر کیے گئے ہیں جن کے ذریعے مغفرت حاصل ہوتی ہے:

پہلا سبب: امید کے ساتھ دعا کرنا:

دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی قبولیت کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [الغافر: ٦٠]

''اور تمھارے رب نے فرمایا: مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔''

اور سنن اربعہ میں سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ»[1]

''دعا عبادت ہی ہے۔''

حاضر دماغی اور اللہ پر اچھا گمان رکھنا:

دعا کی قبولیت کا وعدہ تو کیا گیا ہے لیکن تب جب اس کی شرطیں مکمل ہوں اور کوئی مانع بھی نہ ہو۔ جب شرائط مکمل نہ ہوں، یا کوئی مانعِ اجابت موجود ہو تو دعا رد کر دی جاتی ہے اور اس کی شرطوں میں سے اہم شرط حاضر دماغی اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی امید ہے۔ جیسا کہ سنن ترمذی میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] أبو داود، كتاب الصلاة، باب الدعاء، رقم الحديث (1479) والترمذي، كتاب التفسير، باب سورة البقرة، رقم الحديث (2969)

«اُدْعُوا اللّٰهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ»[1]

''تم اللہ سے دعا اس یقین کے ساتھ مانگو کہ تمھاری دعا ضرور قبول ہو گی، اور (اچھی طرح) جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے پروائی اور بے توجہی سے مانگی ہوئی، غفلت اور لہو ولعب میں مبتلا دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔''

اسی لیے بندے کو اِس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دعا میں یوں کہے:

«لَا يَقُلْ أَحَدُكُمْ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي إِنْ شِئْتَ، اِرْحَمْنِي إِنْ شِئْتَ، اُرْزُقْنِي إِنْ شِئْتَ، وَلْيَعْزِمْ مَسْأَلَتَهُ إِنَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ لَا مُكْرِهَ لَهُ»[2]

''تم میں سے کوئی ان الفاظ میں دعا نہ کرے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف کر دے، اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر، اگر تو چاہے تو مجھے رزق عطا فرما، بلکہ انسان کو چاہیے کہ وہ عزم اور پختگی کے ساتھ سوال کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے، اسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔''

اسی طرح بندے کو اِس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ وہ جلد بازی کرے اور دعا کی قبولیت میں تاخیر کی وجہ سے دعا کرنا چھوڑ دے۔ اسے نبی کریم ﷺ نے قبولیتِ دعا کے موانع میں شمار فرمایا تاکہ بندہ دعا کی قبولیت سے مایوس نہ ہو، خواہ مدت کتنی لمبی کیوں نہ جائے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دعا میں بار بار گڑگڑانے والوں کو پسند کرتا ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ فَيَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ فَلَا أَوْ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي»[3]

''تم میں سے کسی شخص کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک وہ جلد بازی کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا: میں نے دعا کی، لیکن میرے حق میں قبول نہیں ہوتی .... یا نہیں ہوئی۔''

بندے کو اپنے رب سے سب سے اہم دعا اپنے گناہوں کی معافی کی صورت میں کرنی چاہیے، یا اس کے نتیجے میں جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کی دعا کرنی چاہیے۔

---

[1] الترمذي، كتاب الدعوات، باب حدثنا عبد الله بن معاوية، رقم الحديث (3479)

[2] البخاري، كتاب التوحيد، باب في المشيئة والإرادة، رقم الحديث (7477) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب العزم بالدعاء، حديث: 8 (2679)

[3] مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب بيان أن يستجاب للداعي ما لم يعجل، رقم الحديث: 91 (2735)

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِرَجُلٍ: « كَيْفَ تَقُولُ فِي الصَّلَاةِ »، قَالَ: أَ تَشَهَّدُ وَأَقُولُ: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّارِ، أَمَا إِنِّي لَا أُحْسِنُ دَنْدَنَتَكَ وَلَا دَنْدَنَةَ مُعَاذٍ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: « حَوْلَهَا نُدَنْدِنُ »①

''نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی سے پوچھا: تم نماز میں کیا کہتے ہو؟'' اس نے کہا: میں تشہد پڑھتا ہوں پھر یوں کہتا ہوں: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا اور جہنم سے پناہ مانگتا ہوں۔ اور میں آپ کی اور سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی گنگناہٹ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا (یعنی آپ اور معاذ کیا دعا مانگتے ہیں؟ آواز تو سنتا ہوں، لیکن واضح الفاظ سمجھ میں نہیں آتے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہم بھی انہی دو (جنت اور دوزخ) کے گرد ہی گنگناتے ہیں۔'' (یعنی جنت کا سوال اور دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں)

ابومسلم الخولانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''میں جب بھی دعا کرنے لگتا ہوں اور مجھے جہنم کی آگ یاد آتی ہے تو میں اسی سے اللہ کی پناہ مانگنا شروع کر دیتا ہوں۔''

دعا کی قبولیت کیسے ہوتی ہے؟:

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے پر رحمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ جب دنیا کی کوئی چیز اس سے طلب کرتا ہے، اور اللہ اسے وہ چیز نہیں دیتا تو اسے اس سے بہتر چیز دے دیتا ہے، یا تو اس سے کسی بلا کو ٹال دیتا ہے، یا اس کا ثواب اس کے لیے ذخیرہ کر دیتا ہے، یا اس کے بدلے میں اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَا مِنْ أَحَدٍ يَدْعُو بِدُعَاءٍ إِلَّا آتَاهُ اللّٰهُ مَا سَأَلَ أَوْ كَفَّ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهُ مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ »②

''جو کوئی بندہ اللہ سے دعا کر کے مانگتا ہے، اللہ اسے یا تو اس کی مانگی ہوئی چیز دے دیتا ہے،

---

① أبو داود، كتاب الصلاة، باب في تخفيف الصلاة، رقم الحديث (792) وابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة، باب ما يقال في التشهد، رقم الحديث (910) ومسند أحمد (474/3)

② أخرجه أحمد في مسنده (360/3) والترمذي، كتاب الدعاء، باب ما جاء أن دعوة المسلم مستجابة، رقم الحديث (3381)

یا اس دعا کے نتیجہ میں اس دعا کے مثل اس پر آئی ہوئی مصیبت دور کر دیتا ہے، جب تک اس نے کسی گناہ یا قطع رحمی (رشتہ ناتا توڑنے) کی دعا نہ کی ہو۔"

اسی طرح سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُوْ، لَيْسَ بِإِثْمٍ وَّلَا بِقَطِيْعَةِ رَحِمٍ، إِلَّا أَعْطَاهُ إِحْدٰى ثَلَاثٍ: إِمَّا أَنْ يُعَجِّلَ لَهُ دَعْوَتَهُ، وَإِمَّا أَنْ يَّدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرِ، وَإِمَّا أَنْ يَّدْفَعَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا»، قَالَ: إِذًا نُكْثِرُ، قَالَ: «اَللّٰهُ أَكْثَرُ»[1]

"جو مسلمان دعا کرتا ہے، اس میں گناہ اور قطع رحمی نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے تین میں سے ایک چیز ضرور عطا کرتا ہے: یا اس کی دعا کو جلدی قبول کر لیتا ہے، یا اس کا ثواب اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر دیتا ہے، یا اس جیسی کسی بلا کو اس سے ٹال دیتا ہے۔" صحابی نے کہا: تب تو ہم بہت زیادہ دعا کریں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اور زیادہ عطا کرنے والا ہے۔"

بہرحال اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہوئے مغفرت کی دعا بار بار کرنا مغفرت کا سبب ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ، فَلْيَظُنَّ بِيْ مَا شَاءَ»[2]

"میں بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں، جو وہ مجھ پہ کرتا ہے، لہٰذا وہ جو چاہے مجھ پہ گمان کرے۔"

اِس حدیث کے الفاظ:

"اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا، چاہے تیرے گناہ کسی بھی درجے پر پہنچے ہوئے ہوں، مجھے کسی بات کی پروا و ڈر نہیں ہے۔"

یعنی چاہے تمھارے گناہ کتنے زیادہ کیوں نہ ہوں، میں معاف کر دیتا ہوں اور یہ میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے اور نہ ہی میں اسے زیادہ سمجھتا ہوں۔ صحیح ابن حبان کی ایک روایت میں ہے:

«إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ فَلْيُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ، فَإِنَّهُ لَا يَتَعَاظَمُ عَلَى اللّٰهِ شَيْءٌ»[3]

---

[1] صحيح الأدب المفرد للألباني (710)

[2] أخرجه أحمد في المسند (491/3) والحاكم في المستدرك (240/4)

[3] أخرجه ابن حبان في صحيحه، (177/3)، رقم الحديث (896)

''تم میں سے کوئی شخص جب دعا کرنا چاہے تو بڑی رغبت رکھتے ہوئے کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز بڑی نہیں۔''

لہٰذا بندوں کے گناہ چاہے کتنے بڑے کیوں نہ ہوں، اللہ کا درگزر اور معاف کر دینا ان سے کہیں بڑی چیز ہے۔ گناہ جتنے بڑے ہوں وہ اللہ کی مغفرت کے سامنے چھوٹے ہی ہیں۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

يَا رَبِّ إِنْ عَظُمَتْ ذُنُوبِي كَثْرَةً ۔۔۔ فَلَقَدْ عَلِمْتُ بِأَنَّ عَفْوَكَ أَعْظَمُ

إِنْ كَانَ لَا يَرْجُوكَ إِلَّا مُحْسِنٌ ۔۔۔ فَمَنِ الَّذِي يَدْعُو وَيَرْجُو الْمُجْرِمُ

مَا لِيْ إِلَيْكَ وَسِيلَةٌ إِلَّا الرَّجَاءُ ۔۔۔ وَجَمِيلُ عَفْوِكَ ثُمَّ أَنِّي مُسْلِمُ

''اے میرے رب! میرے گناہ چاہے بہت ہی بڑے ہوں، پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تیرا درگزر کر دینا ان سے کہیں بڑی صفت ہے۔ تیری رحمت کا امیدوار اگر صرف نیک آدمی ہی ہو تو ایک مجرم کس کو پکارے گا اور کس سے امید لگائے گا؟! میرے لیے تیری رحمت کی امید اور درگزر کرنے کی تیری خوبصورت صفت کے سوا کوئی چارہ نہیں، اِس کے علاوہ میں مسلمان بھی ہوں۔''

مغفرت کا دوسرا سبب: استغفار:

گناہ چاہے کتنے بڑے کیوں نہ ہوں، اور کتنے زیادہ کیوں نہ ہوں، حتیٰ کہ آسمان کی بلندی تک یا حدِ نگاہ تک کیوں نہ پہنچ جائیں، استغفار ان تمام گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے۔ ایک روایت میں الفاظ یوں ہیں:

«لَوْ أَخْطَأْتُمْ حَتَّى بَلَغَتْ خَطَايَاكُمْ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، ثُمَّ اسْتَغْفَرْتُمُ اللّٰهَ تَعَالَى .... لَغَفَرَ لَكُمْ»[1]

''اگر تم غلطیاں کرو اور تمھاری غلطیاں اتنی ہوں کہ جن کے ساتھ آسمان اور زمین کے درمیان کا خلا بھر جائے، پھر تم اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو تو اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کر دے گا۔''

''استغفار'' کا معنی ہے: مغفرت طلب کرنا۔ اور ''مغفرت'' کا معنی ہے: گناہوں پر پردہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے شر سے بچنا۔

قرآن مجید میں استغفار کا ذکر بار بار کیا گیا ہے:

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (4248)، مسند أحمد (238/3)، السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (1951)

⊙ کہیں اللہ تعالیٰ اس کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [البقرۃ: ۱۹۹]

''تم اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے اور انتہائی رحم کرنے والا ہے۔''

⊙ اور کہیں اللہ تعالیٰ استغفار کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ ﴾ [آل عمران: ۱۷] ''اور سحری کے وقت استغفار کرنے والے۔''

⊙ اور کہیں اللہ تعالیٰ استغفار کرنے والوں کو خوشخبری دیتا ہے کہ وہ انھیں معاف کر دیتا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

[النساء: ۱۱۰]

''اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر لے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت معاف کرنے والا اور انتہائی رحم کرنے والا پائے گا۔''

مغیث بن سمی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ایک خبیث انسان ایک دن اللہ کو یاد کرتے ہوئے کہنے لگا: اے اللہ! معاف کر دے، اے اللہ! معاف کر دے، اے اللہ! معاف کر دے۔ پھر مر گیا۔ تو اسے معاف کر دیا گیا۔''

اس کی تائید صحیحین کی ایک روایت سے ہوتی ہے جس کے راوی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ عَبْدًا أَصَابَ ذَنْبًا وَرُبَّمَا قَالَ: أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ: رَبِّ أَذْنَبْتُ وَرُبَّمَا قَالَ: أَصَبْتُ فَاغْفِرْ لِي، فَقَالَ رَبُّهُ: أَ عَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللّٰهُ، ثُمَّ أَصَابَ ذَنْبًا أَوْ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ: أَذْنَبْتُ أَوْ أَصَبْتُ آخَرَ فَاغْفِرْهُ، فَقَالَ: أَ عَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللّٰهُ، ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا وَرُبَّمَا قَالَ: أَصَابَ ذَنْبًا قَالَ: رَبِّ أَصَبْتُ أَوْ قَالَ: أَذْنَبْتُ آخَرَ فَاغْفِرْهُ لِي، فَقَالَ: أَ عَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ غَفَرْتُ لِعَبْدِي ثَلَاثًا، فَلْيَعْمَلْ مَا شَاءَ »[1]

[1] البخاري، كتاب التوحيد، باب قوله تعالى: ﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾، رقم الحديث (7507) ومسلم، كتاب التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب، رقم الحديث: 29 (2758)

''ایک بندے نے بہت گناہ کیے اور کہا: اے میرے رب! میں نے گناہ کیا ہے تو مجھے معاف کر دے۔ اس کے رب نے فرمایا: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گناہ کی وجہ سے پکڑتا بھی ہے؟ اب میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا ہے۔ پھر جس قدر اللہ نے چاہا وہ گناہ سے رکا رہا۔ پھر اس نے دوبارہ گناہ کیا تو اللہ کے حضور عرض کرنے لگا: اے میرے رب! میں نے گناہ کیا ہے اسے بھی معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور اس کی وجہ سے سزا بھی دیتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا ہے۔ پھر جس قدر اللہ نے چاہا وہ گناہ سے رکا رہا، پھر اس نے دوبارہ گناہ کیا تو اللہ کے حضور عرض کرنے لگا: اے میرے رب! میں نے پھر گناہ کر لیا ہے تو مجھے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ بخش دیتا ہے اور گناہ کے سبب مؤاخذہ بھی کرتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا ہے۔ تین بار فرمایا۔ اب جو چاہے عمل کرے۔''

اِس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اسی حال میں رہتا ہے کہ جب بھی گناہ کرتا ہے تو اس کے بعد مغفرت طلب کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کرتا رہتا ہے۔ تاہم زبانی استغفار، جس کے ساتھ دل میں گناہ پر اصرار کرنے کا ارادہ بھی ہو تو وہ محض دعا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو نہ کرے۔ یاد رہے کہ بعض اوقات گناہ پر اصرار قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ لہٰذا مکمل استغفار جو مغفرت کا سبب بنتا ہے وہ وہ ہے جس میں گناہ پر اصرار نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کرنے والوں کی تعریف کی ہے اور ان سے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ بعض اہلِ معرفت کا کہنا ہے کہ جس شخص کے استغفار کا ثمرہ اصلاح کی شکل میں ظاہر نہ ہو تو وہ اپنے استغفار میں جھوٹا ہے۔ ان میں سے بعض کہا کرتے تھے کہ ہمارا استغفار بھی بہت زیادہ استغفار کا محتاج ہے۔ بہرحال بہترین استغفار وہ ہے جس کے ساتھ گناہ پر اصرار کو ترک کر دیا جائے۔ اور اسی کو ''توبۂ نصوح'' کہتے ہیں۔

بہترین استغفار:

1. بندہ اپنے رب کی ثنا کے ساتھ ابتدا کرے۔
2. پھر اپنے گناہ کا اعتراف کرے۔
3. پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرے۔

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«سَيِّدُ الِاسْتِغْفَارِ أَنْ تَقُولَ: اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ»، قَالَ: «وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوقِنًا بِهَا، فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُمْسِيَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلَةِ وَهُوَ مُوقِنٌ بِهَا، فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يُصْبِحَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ»[1]

''سید الاستغفار یہ (وظیفہ) ہے کہ تو کہے: اے اللہ! تو میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔ اور میں اپنی استطاعت کے مطابق تجھ سے کیے ہوئے عہد اور وعدے پر قائم ہوں۔ میں ان بری حرکتوں کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو میں نے کی ہیں۔ جو تیری نعمتیں ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں اور میں اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں، لہٰذا میری مغفرت کر دے۔ بلاشبہ تیرے سوا کوئی بھی گناہ معاف کرنے والا نہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: ''جس نے اس استغفار پر یقین رکھتے ہوئے دل کی گہرائی سے اسے دن میں پڑھا، پھر شام ہونے سے پہلے اسی دن اس کا انتقال ہو گیا تو وہ جنتی ہے۔ اور جس نے ان الفاظ پر یقین رکھتے ہوئے رات کے وقت ان کو پڑھ لیا، پھر اس کا صبح ہونے سے پہلے انتقال ہو گیا تو وہ جنتی ہے۔''

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے ایسی دعا سکھلائیں جو میں نماز میں پڑھوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قُلْ: اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا، وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ»[2]

''تم یہ پڑھا کرو: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ .... أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ» ''اے اللہ! میں

[1] البخاري، كتاب الدعوات، باب أفضل الاستغفار، رقم الحديث (6306)

[2] البخاري، كتاب الأذان، باب الدعاء قبل السلام، رقم الحديث (834) ومسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب خفض الصوت بالذكر، رقم الحديث: 48 (2705)

نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا اور گناہوں کو تیرے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں، اس لیے تو مجھے اپنی طرف سے معاف کر دے اور مجھ پر مہربانی کر دے۔ یقیناً تو ہی بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔"

استغفار کے الفاظ کے متعلق ایک اور حدیث یوں ہیں:

«مَنْ قَالَ: أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ، غُفِرَ لَهُ وَإِنْ كَانَ قَدْ فَرَّ مِنَ الزَّحْفِ»[1]

"جو شخص یوں کہے: «أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ» تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی اگرچہ وہ لشکر (فوج) سے بھاگ ہی کیوں نہ آیا ہو۔"

سنن اربعہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَجْلِسِ الْوَاحِدِ مِائَةَ مَرَّةٍ: رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ»[2]

"بلاشبہ ہم شمار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایک مجلس میں سو سو بار یہ کلمہ دہراتے تھے: «رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ» "اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما۔ بلاشبہ تو بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً»[3]

"اللہ کی قسم! میں ایک دن میں اللہ کے حضور ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔"

اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ»[4]

---

[1] الترمذي، كتاب أبواب الدعوات، باب في دعاء الضيف، رقم الحديث (3577)

[2] أبو داود، كتاب الصلاة، باب الاستغفار، رقم الحديث (1516) والترمذي، كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا قام من المجلس، رقم الحديث (3434) والنسائي، كتاب عمل اليوم والليلة، باب كيف الاستغفار، رقم الحديث (1292) وابن ماجه، كتاب الأدب، باب الاستغفار، رقم الحديث (3814)

[3] البخاري، كتاب الدعوات، باب استغفار النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث (3606)

[4] مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار، رقم الحديث: 41 (2702)

"میرے دل پر غبار سا چھا جاتا ہے تو میں (اس کیفیت کے ازالے کے لیے) ایک دن میں سو بار اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔"

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"اس شخص کے لیے خوشخبری ہے جو اپنے نامۂ اعمال میں بہت زیادہ استغفار پائے گا۔"

جبکہ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ قرآن یقینی طور پر تمھیں تمھاری بیماری کا بھی بتاتا ہے اور تمھاری دوائی کے بارے میں بھی آگاہ کرتا ہے۔ بیماری سے مراد گناہ اور دوائی سے مراد استغفار ہے۔

جس شخص کے گناہ بہت زیادہ ہوں حتی کہ شمار بھی نہ ہوسکیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی مانگے جو اللہ کے علم میں ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کے سارے گناہ ہیں اور اس نے انھیں شمار کر رکھا ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ ﴾

[المجادلة: ٦]

"جس دن اللہ ان سب کو زندہ کر کے اٹھائے گا تو انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ اللہ نے اس کا پورا ریکارڈ رکھا ہے جبکہ وہ خود اسے بھول گئے۔"

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا میں یوں ارشاد فرمایا:

« وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ »[1]

"میں تجھ سے ہر اس خیر کا سوال کرتا ہوں جسے تو جانتا ہے۔ اور ہر اس شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں جس کو تو جانتا ہے۔ اور ہر اس گناہ کی معافی چاہتا ہوں جس کا تجھے علم ہے تو یقیناً غیبوں کو بہت زیادہ جاننے والا ہے۔"

مغفرت کے اسباب میں سے تیسرا سبب: توحید:

یہ سب سے بڑا سبب ہے۔ جس شخص کو یہ حاصل نہیں وہ مغفرت سے محروم ہے اور جس کو یہ حاصل ہے اسے مغفرت کا سب سے بڑا ذریعہ مل گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ ﴾ [النساء: ٤٨]

---

[1] أخرجه أحمد في مسنده (123/4) والحاكم في المستدرك (508/1)

''اگر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے تو یہ گناہ وہ کبھی معاف نہ کرے گا اور اس کے علاوہ جو گناہ ہیں، وہ جسے چاہے معاف بھی کر دیتا ہے۔''

لہٰذا جو شخص توحید کے ساتھ زمین بھر یا اس کے قریب گناہ لائے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین بھر مغفرت پائے گا، لیکن یہ اللہ کی مشیت پہ منحصر ہے کہ اگر وہ چاہے گا تو اسے معاف کر دے گا اور اگر چاہے گا تو اس کے گناہوں کی وجہ سے اس کی پکڑ کرے گا، پھر وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا، بلکہ جہنم سے نکال کر اسے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

بعض اہلِ علم کا کہنا ہے: موحد کو جہنم میں اس طرح نہیں پھینکا جائے گا جس طرح کافر کو اس میں پھینکا جائے گا۔ اور نہ ہی وہ اس میں ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا جیسا کہ کافر اس میں ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔ لہٰذا اگر بندے کی توحید مکمل ہو، نیز وہ اس میں اللہ کے لیے مخلص بھی ہو، اسی طرح وہ اپنے دل، زبان اور اعضاء کے ساتھ اس کی شروط پر بھی قائم ہو، یا موت کے وقت دل اور زبان کے ساتھ اس پر ثابت قدم ہو تو اس کی وجہ سے اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور اسے جہنم سے نجات مل جائے گی۔

یاد رہے کہ جس کے دل میں عقیدۂ توحید پختہ ہو، تو اس میں صرف اور صرف اللہ کی محبت، تعظیم، بزرگی، ہیبت، خشیت، امید اور توکل جیسی صفات ہوتی ہیں۔ تب اس کے سارے کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ چاہے وہ سمندر کی جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں، بلکہ بعض اوقات اس کے گناہوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث نمبر: 18 کی شرح میں یہ بات گزر چکی ہے۔

توحید ہی یقینی طور پر اکسیرِ اعظم ہے، اس کا ایک ذرہ بھی اگر گناہوں کے پہاڑوں پر گرا دیا جائے تو ان سب کو نیکیوں میں تبدیل کر دے۔

فوائدِ حدیث:

1. حدیث میں اللہ کی مغفرت کی وسعت اور اس کی اپنے بندوں پر رحمت کا ذکر ہے۔
2. مغفرت کے اسباب تین ہیں: امید کے ساتھ دعا کرنا۔ استغفار کرنا۔ توحید۔
3. دعا عبادت ہے، لہٰذا جب بندہ اس کی شروط کے ساتھ دعا کرے، پھر اس کی دعا قبول نہ ہو تو اسے تین میں سے ایک چیز ضرور ملتی ہے: یا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس سے بہتر چیز عطا کر دیتا ہے، یا اس جیسی بلا کو ٹال دیتا ہے، یا اس کا ثواب قیامت کے لیے ذخیرہ کر دیتا ہے۔

4 استغفار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کی ثناء کے ساتھ ابتدا کرے، پھر گناہ کا اعتراف کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوال کرے۔

سوالات:

1 «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ اِنْ شِئْتَ» کے ساتھ دعا کرنے سے کیوں منع کیا گیا ہے؟

2 استغفار کا کیا معنی ہے؟

3 کیا گناہ پر اصرار کے ساتھ استغفار قابلِ قبول ہے؟

4 اس توحید سے کون سی توحید مراد ہے جس کے بارے میں اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ وہ گناہوں کو جلاتی ہے؟

5 جب بندہ دعا کرتا ہے تو اس کی قبولیت کی چار صورتیں کون سی ہیں؟



وراثت کے بعض احکام

41 سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ» ①

''مقررہ حصے ان کے حقداروں تک پہنچا دو۔ اور جو باقی بچے وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کے لیے ہے۔''

یہ حدیث انتہائی جامع ہے اور وراثت کے احکام پر مشتمل ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد: «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا» کے معنی کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے: «الْفَرَائِض» سے مراد وہ حصے ہیں جو کتاب اللہ میں مقرر کر دیے گئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ کے مذکور ارشاد کے معنی ہیں: تم مقررہ حصے انھیں دے دو جنھیں اللہ تعالیٰ نے نام لے کر ذکر فرمایا ہے۔ پھر جو باقی بچے اس کا مستحق میت کا سب سے قریبی مرد ہے، کیونکہ «أولىٰ» سے مراد اَقرب ہے اور مردوں میں سب سے زیادہ قریبی مرد وہ ہیں جن کے لیے کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا اور انھیں وراثت کی اصطلاح میں ''عصبہ'' کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر وارثوں میں بیٹی، بہن، چچا یا چچازاد یا بھتیجا جمع ہو جائیں تو بیٹی کو آدھا حصہ دینے کے بعد جو بچے گا وہ عصبہ (مرد رشتہ دار) کے لیے ہوگا۔ یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، جو اِس حدیث کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے اقرار کرتے تھے کہ دیگر سارے لوگ اس کے خلاف ہیں، جبکہ جمہور اہلِ علم کا کہنا ہے کہ بیٹی کے ساتھ بہن عصبہ بنتی ہے، لہٰذا جو باقی بچے گا وہ اس کے لیے ہوگا۔ یہ عمر، عائشہ، زید، ابن مسعود اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور تمام علماء انہی کے پیچھے گئے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہذیل بن شرحبیل رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بیٹی، پوتی اور بہن کی وراثت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: بیٹی کے لیے نصف اور بہن کے لیے

---

① البخاري، كتاب الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه، رقم الحديث (6732) ومسلم، كتاب الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأهلها، رقم الحديث: 2(1615) نحوه.

بھی نصف ہے۔ تم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ، وہ بھی اس مسئلے میں میری موافقت کریں گے۔ پھر جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا اور انھیں حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی بات پہنچائی گئی تو انھوں نے فرمایا:

«لَقَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ، أَقْضِي فِيهَا بِمَا قَضَى النَّبِيُّ ﷺ: لِلِابْنَةِ النِّصْفُ، وَلِابْنَةِ ابْنٍ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ وَمَا بَقِيَ فَلِلْأُخْتِ»

''اگر میں ایسا فتویٰ دے دوں تو یقیناً میں گمراہ ہو گیا اور ٹھیک راستے سے بھٹک گیا۔ میں اس کے متعلق وہی فیصلہ کروں گا جو نبی ﷺ نے کیا تھا کہ بیٹی کو نصف ملے گا، پوتی کو چھٹا حصہ دیا جائے گا، اس طرح دو تہائی پورے ہو جائیں گے، اور جو باقی بچے گا وہ بہن کو دیا جائے گا۔''

ہم دوبارہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انھیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتویٰ سے آگاہ کیا تو انھوں نے فرمایا: جب تک علم کا یہ سمندر تم میں موجود ہے مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔[1]

مذکورہ اقوال میں سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور جمہور کا قول زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ بہن ایک ہو اور میت کی کوئی اولاد نہ ہو تو اسے آدھا حصہ ملے گا اور اگر دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں اور میت کی کوئی اولاد نہ ہو تو انھیں دو تہائی حصہ ملے گا۔

- اگر میت کا بیٹا ہو تو وہ اس کے بہن بھائیوں پر مقدم ہے۔
- اگر بیٹا نہ ہو، بیٹی ہو تو اس کے مقررہ حصے کے بعد جو بچے گا وہ میت کے بہن بھائیوں کو ملے گا۔ اِس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔
- اگر بہن کو اس کا بھائی ساقط (وراثت سے محروم) نہیں کر سکتا تو دور کا رشتہ دار (چچا اور چچا زاد) اسے کیسے ساقط کر سکتا ہے؟

تو جس طرح اولاد میں اگر بیٹا ہو تو وہ میت کے بھائی کو وراثت سے محروم کر دیتا ہے اور اگر میت کی صرف بیٹی ہو تو وہ میت کے بھائی کو اس مال سے محروم نہیں کرتی جو اس کا حصہ نکال کر بچتا ہے، اگرچہ اسے پوری جائیداد کا وارث بننے سے محروم کرتی ہے، تو اسی طرح اگر بیٹا ہو تو وہ میت کی بہن کو مکمل طور پر محروم کر دیتا ہے، اور اگر بیٹی ہو تو وہ میت کی بہن کو آدھے حصے کا حقدار بننے سے تو محروم کرتی ہے، لیکن بیٹی کو دینے کے بعد جو بچتا ہے وہ اس سے اسے محروم نہیں کرتی۔ واللہ اعلم

[1] البخاري، كتاب الفرائض، باب ميراث ابنة ابن مع ابنة، رقم الحديث (6736)

مقررہ حصوں کے بعد بچا ہوا مال قریب ترین مرد کے لیے ہے:

یہ جو نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو مقررہ حصوں سے باقی بچے تو وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کے لیے ہے۔'' تو اِس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دور کے رشتہ دار ہیں، خاص طور پر بھائیوں کی اولاد، چچے، چچوں کی اولاد، نہ کہ قریب کے رشتہ دار۔ اس کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ جب قریب کے رشتہ دار، مثلاً: اولاد اور بھائی ہوں تو مقررہ حصوں سے جو بچتا ہے اس میں مرد وعورت سب شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہن بیٹی کے ساتھ، جس کی نص پہلے گزر چکی ہے۔

کچھ دیگر اہلِ علم کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ کے فرمان: ''جو مقررہ حصوں سے باقی بچے تو وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کے لیے ہے۔'' سے مراد یہ ہے کہ مجموعی طور پر جن کے حصے مقرر کیے گئے ہیں انھیں ان کے حصے دے دو، خواہ ان کے حصے فرضاً ہوں یا عصبہ کے اعتبار سے ہوں۔ اور آپ ﷺ کے فرمان: ''پھر جو باقی بچ جائے تو وہ سب سے قریبی مرد کے لیے ہے'' سے مراد وہ عصبہ ہیں جن کا کوئی حصہ مقرر نہ کیا گیا ہو۔

جبکہ علماء کے ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ کے فرمان: ''جو مقررہ حصوں سے باقی بچے تو وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کے لیے ہے۔'' سے مراد مجموعی طور پر وہ ورثاء ہیں جن کے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نام لیے ہیں، خواہ ان کے حصے مقرر ہوں یا وہ عصبہ کے طور پر وراثت کے مستحق قرار پائیں، کیونکہ وارثوں میں سے کسی کو جو بھی ملے گا وہ اس کا حصہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور اولاد کی وراثت ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ﴾ [النساء: ۱۱] ''یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حصے ہیں۔''

اور ان میں وہ بھی ہیں جن کے حصے مقرر شدہ ہیں اور وہ بھی ہیں جو عصبہ بن کر وارث بنتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴾ [النساء: ۷]

''مردوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ (اسی طرح) عورتوں کے لیے بھی اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ خواہ یہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے۔''

اِس میں بھی تمام ورثاء شامل ہیں، اصحاب الفروض بھی اور عصبات بھی، لہٰذا اِس اصول کی بنا پر جب وراثت کی تقسیم ہوگی، پھر کچھ مال باقی بچ جائے گا تو بچے ہوئے مال کا سب سے زیادہ حقدار وارثوں میں سے قریب ترین مرد ہوگا۔

وراثت کی تقسیم:

یہ حدیث ان وارثوں میں وراثت کی تقسیم کی کیفیت کو واضح کر رہی ہے جن کا ذکر کتاب اللہ میں کیا گیا ہے۔ نیز یہ بتا رہی ہے کہ مذکورہ طریقِ تقسیم پر عمل کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچے گا اس کی تقسیم کیسے ہوگی اور جن قریبی رشتہ داروں کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا ان میں وراثت کی تقسیم کی کیفیت کیا ہوگی۔ لہٰذا اگر اِس حدیث کو وراثت سے متعلقہ قرآنی آیات کے ساتھ ملا دیا جائے تو تمام اصحاب الفروض وعصبات میں تقسیمِ وراثت کا مکمل طریقہ بالکل واضح ہوجاتا ہے۔تو آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ سورۃ النساء کے شروع میں ذکر کیے گئے اولاد اور والدین سے متعلق احکامِ وراثت کیا ہیں، نیز اس سورت کے آخر میں ذکر کیے گئے سگے بہن بھائیوں اور باپ شریک بہن بھائیوں کے احکامِ وراثت کیا ہیں۔

اولاد کی وراثت کے احکام:

ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ ﴾ [النساء:۱۱]

''اللہ تعالیٰ تمھیں تمھاری اولاد کے متعلق تاکیداً حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا۔''

یہ حکم تب ہے جب اولاد میں بیٹے، بیٹیاں دونوں جمع ہوں۔ اور ان میں اپنی اولاد اور ان کی عدم موجودگی میں بیٹوں کی اولاد بھی باتفاقِ علماء شامل ہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ ﴾

[النساء:۱۱]

''اگر اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زائد ہوں تو ان کے لیے ترکہ کا دو تہائی حصہ ہے، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا حصہ ہے۔''

یہ حکم تب ہے جب اولاد میں صرف بیٹیاں ہوں، بیٹے نہ ہوں۔ لہٰذا اگر ایک بیٹی ہو تو اسے آدھا حصہ ملے گا اور اگر دو ہوں تو انھیں دو تہائی حصہ ملے گا۔

اِس میں صلبی بیٹیاں اور ان کی عدم موجودگی میں پوتیاں بھی شامل ہیں۔ اگر یہ سب جمع ہو جائیں تو اِس صورت میں دیکھا جائے گا کہ کیا صلبی بیٹیاں دو تہائی حصہ مکمل کر رہی ہیں یا نہیں؟ اگر مکمل کر رہی ہیں تو پوتیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور اگر نہ کر رہی ہوں، بلکہ بیٹی ایک ہی ہو جو کہ آدھے حصے کی وارث بنتی ہے اور اس کے ساتھ پوتیاں بھی ہوں تو بیٹی کو آدھا حصہ اور دو تہائی حصہ مکمل کرنے کے لیے پوتیوں کو چھٹا حصہ ملے گا، تاکہ ان کا حصہ دو تہائی سے زیادہ نہ بنے۔ یہی نبی ﷺ کا فیصلہ تھا جو سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے حوالے سے گزر چکا ہے اور یہی زیادہ تر علماء کا قول بھی ہے۔

ہاں البتہ سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ اور سیدنا سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پوتیوں کو کچھ نہیں ملے گا، تاہم سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ سننے کے بعد اپنے فتوے سے رجوع کر لیا تھا۔

علماء کا اِس بات پر اجماع ہے کہ اگر بیٹیاں دو ہی ہوں تو انھیں بھی دو تہائی حصہ ہی ملے گا۔ یہ اجماع ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور اِس بارے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو بات مروی ہے کہ انھیں آدھا حصہ ملے گا تو اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اور قرآن بھی اس کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَإِنْ كَانَتْ وَٰحِدَةً فَلَهَا ٱلنِّصْفُ﴾ [النساء: ۱۱] ''اگر بیٹی ایک ہی ہو تو اس کے لیے آدھا حصہ ہے۔'' تو ایک سے زیادہ بیٹیوں کے لیے آدھا حصہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اِس کے علاوہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث (جو پہلے گزر چکی ہے) میں ہے کہ بیٹی کو آدھا اور پوتی کو چھٹا حصہ (دو تہائی مکمل کرنے کے لیے) ملے گا۔ جو اِس بات کی دلیل ہے کہ ''اگر بیٹیاں دو ہوں تو انھیں دو تہائی حصہ بطریقِ اولیٰ ملے گا۔''

اسی طرح سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیوں کو دو تہائی حصہ دیا تھا۔[1]

یہاں ایک تیسری قسم باقی ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے صراحتاً نہیں کیا ہے اور وہ ہے: میت کے صرف بیٹے ہوں تو ان میں وراثت کیسے تقسیم ہوگی؟

---

(1) أخرجه أحمد في مسنده (352/3) وأبو داود، كتاب الفرائض، باب ما جاء في ميراث الصلب، رقم الحديث (2891) والترمذي، كتاب الفرائض، باب ما جاء في ميراث البنات، رقم الحديث (2092)

اِس قسم کو ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں داخل کر سکتے ہیں جس کے آخر میں الفاظ یوں ہیں: ''اور جو مقررہ حصوں سے باقی بچے تو وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کے لیے ہے۔'' لہٰذا جو کچھ بچے گا وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کو دیا جائے گا۔ یوں اگر میت کا ایک بیٹا ہو اور ایک پوتا ہو تو مال پورے کا پورا بیٹے کو ملے گا۔ پوتے کو کچھ نہیں ملے گا اور اگر پوتا اور پڑپوتا جمع ہو جائیں تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث کی بنا پر مال پوتے کو ملے گا، پڑپوتا محروم ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

وراثت میں ماں باپ کے حصے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں والدین کے حصوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ﴾ [النساء: ١١]

''اگر میت کی اولاد بھی ہو اور والدین بھی (حیات ہوں) تو والدین میں سے ہر ایک کے لیے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ہے۔''

- لہٰذا جب میت کے والدین زندہ ہوں اور اولاد بھی ہو، اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں برابر ہیں، اور چاہے اولاد صلبی ہو یا پوتے پوتیاں ہوں، تو اِس بات پر علماء کا تقریباً اجماع ہے کہ والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔
- اگر میت کا ایک بیٹا ہو یا پوتا ہو اور والدین بھی زندہ ہوں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو فرضاً چھٹا حصہ ملے گا۔ اور جو باقی بچے گا وہ بیٹے یا پوتے کو ملے گا۔ یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا حدیث کے عین مطابق ہے کہ جو مقررہ حصوں کی ادائیگی کے بعد باقی بچے وہ میت کا سب سے قریبی مرد لے گا۔ تو مذکورہ صورت میں میت کا بیٹا سب سے قریبی عصبہ ہے۔
- اگر اولاد بیٹیوں کی شکل میں ہو تو دیکھا جائے گا کہ بیٹیاں کتنی ہیں؟ اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی حصہ ہوگا۔ یوں والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ دینے اور بیٹیوں کو دو تہائی حصہ دینے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔
- اگر بیٹی ایک ہی ہو تو اسے آدھا حصہ ملے گا۔ اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ پھر مال کا ایک چھٹا حصہ باقی بچ جائے گا جو عصبہ کے طور پر باپ لے لے گا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مقررہ حصے ان کے حقداروں تک پہنچا دو اور جو باقی بچے وہ میت کے سب سے زیادہ

قریبی مرد کے لیے ہے۔'' مذکورہ صورت (بیٹے کی عدم موجودگی) میں باپ ہی میت کا سب سے قریبی مرد ہے، جو اس کے بھائی، بھتیجے، چچے اور چچازاد سے زیادہ قریبی ہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُۥ وَلَدٌ وَوَرِثَهُۥٓ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ ٱلثُّلُثُ ﴾ [النساء:۱۱]

''پھر اگر میت کی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث صرف والدین ہوں تو اس کی ماں کا تہائی حصہ ہے۔''

اِس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ ماں کو تہائی حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ باپ کے لیے ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ذکر کر کے ماں کو تہائی حصے کا مستحق قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ باقی بچنے والا مال باپ کو دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ باپ کے لیے بھی اتنا ہی ہوگا جتنا ماں کے لیے ہے، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ وہ دونوں آپس میں اپنے بیٹے کا ترکہ عصبہ کے طور پر تقسیم کریں گے، جیسا کہ اولاد اور بہن بھائیوں کا معاملہ ہوتا ہے، جب ان میں مرد اور عورتیں دونوں موجود ہوں۔

عمرِیّتان: وراثت میں دو ایسے مسئلے ہیں جن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے منفرد فیصلہ دیا، اس لیے انھیں عمریتان کہا گیا۔ پہلا مسئلہ ہے: خاوند اور میت کے والدین۔ دوسرا ہے: بیوی اور میت کے والدین۔

ان دونوں مسئلوں میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ دیا کہ بیوی کی موت کی صورت میں خاوند اور خاوند کی موت کی صورت میں بیوی دونوں اپنے مقررہ حصے لیں گے اور جو باقی بچے گا اس میں سے تہائی حصہ ماں کا اور باقی باپ کا ہوگا۔

جبکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ماں کو دونوں مسئلوں میں پورے ترکہ کا ثلث (تہائی) حصہ دیا جائے گا، نہ کہ بقیہ ترکے کا تہائی حصہ۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا وہی فرمان ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے لیے تہائی حصہ دو شرائط کے ساتھ ذکر فرمایا ہے: پہلی شرط یہ ہے کہ میت کی اولاد نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ صرف والدین ہی وارث ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر والدین ہی میت کے وارث نہ ہوں، بلکہ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو تو ماں تہائی حصے کی حقدار نہیں ہوگی چاہے اس کی اولاد نہ بھی ہو۔

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کا موقف:

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ اِن دونوں مسئلوں میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تائید کرتے ہیں اور اس کی توجیہ

یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا: ﴿وَوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ﴾ تو اس سے مراد یہ ہے کہ بیٹے کے ترکہ سے اس کے والدین جتنے مال کے وارث بنیں، اس میں سے تہائی حصہ ماں کا اور جو باقی بچے گا وہ باپ کا ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا: "فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ مِمَّا تَرَكَ" یعنی "اس کی ماں کے لیے تہائی حصہ ہے اس مال میں سے جو اس نے چھوڑا۔" لہٰذا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب میت کی اولاد نہ ہو، اور اس کے والدین کے لیے اس کے مال میں وراثت کا حق ہو تو ماں کے لیے اس حق کا تہائی حصہ ہوگا جس کے وہ دونوں حقدار ہوں گے۔ اور جو بچے گا وہ باپ کو دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں مقررہ حصے ذکر کیے ہیں وہاں ﴿مِمَّا تَرَكَ﴾ یا اس کے معنی پر دلالت کرنے والے الفاظ ذکر کیے ہیں، جیسے ﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ﴾ ایسا صرف اس لیے ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مقررہ حصے کا حقدار وصیت اور قرض کے بعد پورے ترکہ میں سے اس حصے کا حقدار ہے۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ نے عصبات کی وراثت کا ذکر کیا ہے، یا جس ترکہ کی تقسیم مردوں اور عورتوں کے درمیان بطور عصبات کے ہوتی ہو، جیسے: اولاد اور بہن بھائی، تو وہاں اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی قید یا شرط ذکر نہیں کی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو مال بطور عصبہ کے تقسیم ہونا ہو وہ پورا مال نہیں ہوتا، بلکہ کبھی پورا مال ہوتا ہے اور کبھی مقررہ حصوں سے بچا ہوا مال ہوتا ہے۔

اور یہاں جب اللہ تعالیٰ نے والدین کی اپنے بیٹے سے وراثت کا ذکر فرمایا جس کی اپنی اولاد نہ ہو تو ان دونوں کو نہ اِس طرح ذکر فرمایا کہ ان دونوں کے مقررہ حصے ہیں اور نہ ہی دونوں کو اِس طرح ذکر فرمایا کہ یہ عصبات ہیں اور ان میں مال کی تقسیم ویسے ہی ہوگی جیسا کہ بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان یا میت کے بہن بھائیوں کے درمیان ہوتی ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ملتا ہے، بلکہ انھیں اِس طرح ذکر فرمایا کہ ماں کے لیے مقررہ حصہ (تہائی حصہ) ہے اور باپ کے لیے بطور عصبہ بچا ہوا مال ہے۔

ماں اور بہن بھائیوں میں وراثت کی تقسیم:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ﴾

[النساء: ۱۱]

"اور اگر اس کے بہن بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔ اور یہ تقسیم میت کا قرضہ اور اس کی وصیت ادا کرنے کے بعد ہوگی۔"

یعنی میت کے ورثاء میں ماں ہو، بہن بھائی بھی ہوں تو ماں کو پورے متروکہ مال (جس کی تقسیم وارثوں کے درمیان ہونی ہے) میں سے چھٹا حصہ ملے گا، لیکن یہاں باپ کا ذکر نہیں کیا گیا کہ ماں باپ دونوں موجود ہوں اور بہن بھائی بھی ہوں تو ماں کے لیے تو چھٹا حصہ ہے، لیکن باپ کو کتنا ملے گا! اِس کا ذکر نہیں ہے۔ اگر ماں اور بہن بھائی ہوں اور باپ موجود نہ ہو تو اِس صورت میں تو واضح ہے کہ ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور بہن بھائیوں کو بچا ہوا مال ملے گا۔ اگر دو یا دو سے زیادہ بھائی ہوں تو وہ جمہور کے نزدیک ماں کے لیے حاجب بن جائیں گے اور اسے بس چھٹا حصہ ہی ملے گا، لیکن اگر ان کے ساتھ باپ بھی ہو تو اکثر اہلِ علم کے نزدیک باپ بھائیوں کے لیے حاجب بن جائے گا اور انھیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ جبکہ بعض متاخرین علماء کا کہنا ہے کہ جب بھائیوں کو باپ کی وجہ سے کچھ نہیں ملے گا تو وہ ماں کے لیے حاجب بھی نہیں بن سکتے، بلکہ اسے تب تہائی حصہ ملے گا۔ اسی بات کو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے راجح قرار دیا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور بعض سلف کے قول کے عموم سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ "مَنْ لَّا يَرِثُ لَا يَحْجِبُ" "جو وارث نہیں ہوتا وہ حاجب بھی نہیں بن سکتا۔"

دادا اور دادی و نانی کی وراثت:

اللہ تعالیٰ نے والدین کی وراثت کے احکام تو ذکر کیے ہیں، لیکن دادا اور دادی و نانی کی وراثت کے احکام ذکر نہیں فرمائے۔ جہاں تک دادی و نانی کا تعلق ہے تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ کتاب اللہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی و نانی کو چھٹے حصے کا حقدار قرار دیا تھا۔

سیدنا قبیصہ بن ذؤیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک (میت کی) نانی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئی، وہ اپنا حقِ وراثت طلب کر رہی تھی۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی کتاب میں تیرا کوئی حصہ (مذکور) نہیں ہے اور نہ ہی مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کچھ معلوم ہے۔ تم لوٹ جاؤ حتی کہ میں لوگوں سے پوچھ لوں۔

چنانچہ انھوں نے لوگوں (صحابہ) سے پوچھا تو سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (نانی کو) چھٹا حصہ دیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا اس خبر کے سلسلے میں تمھارے ساتھ کوئی گواہ بھی ہے؟ تو سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور انھوں نے اسی طرح کہا جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نانی کو یہ حصہ دیا۔

پھر ایک اور دادی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی، وہ اپنا حقِ وراثت طلب کر رہی تھی۔ انھوں نے کہا: اللہ کی کتاب میں تمھارا کوئی حق (مذکور) نہیں۔ جو فیصلہ اس سے پہلے ہوا ہے وہ دوسری (نانی) کے لیے تھا اور میں حقوقِ وراثت میں کچھ نہیں بڑھا سکتا۔ لہٰذا وہ چھٹا حصہ ہی ہے۔ اگر تم دونوں (نانی اور دادی) جمع ہو جاؤ تو یہ حصہ تم دونوں کے مابین ہو گا۔ اور جو کوئی تم میں سے اکیلی ہو (دادی ہو، نانی نہ ہو، یا نانی ہو، دادی نہ ہو) تو یہ چھٹا حصہ پورے کا پورا لے گی۔[1]

یاد رہے کہ ماں کی موجودگی میں دادی یا نانی کو وراثت میں سے کچھ نہیں ملتا۔ اسی طرح باپ کی موجودگی میں دادی محروم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک دادا کا تعلق ہے تو علماء کا اتفاق ہے کہ باپ کی موجودگی میں دادا کو وراثت میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ ہاں اگر باپ موجود نہ ہو اور دادا موجود ہو تو وہ باپ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر میت کی اولاد ہو تو اسے چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر اولاد نہ ہو تو اسے عصبہ کے طور پر باقی بچا ہوا مال ملے گا۔ اسی طرح اگر اولاد میں بیٹے نہ ہوں اور صرف بیٹیاں ہوں تو ان سے بچنے والا مال بھی دادا کو بطور عصبہ ملے گا۔ البتہ اِس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ اگر ماں اور دادا زوجین میں سے کسی ایک کے ساتھ جمع ہو جائیں تو دادا کو کیا ملے گا؟

جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ ماں کو دادا کے ساتھ تہائی حصہ ملے گا۔ یہی علی، زید اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اور اگر دادا میت کے بھائیوں کے ساتھ جمع ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ بھائی کون سے ہیں۔ اگر وہ مادری بھائی ہوں تو انھیں دادا کی وجہ سے کچھ نہیں ملے گا۔ اور اگر وہ پدری بھائی ہوں یا سگے بھائی ہوں تو اس کے بارے میں قدیم اور جدید زمانے کے اہلِ علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ دادا کی وجہ سے بھائیوں کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ جیسا کہ باپ کی وجہ سے انھیں کچھ نہیں ملتا۔ یہ ابوبکر صدیق، معاذ اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

ان کا استدلال اِس طرح ہے کہ دادا کو کتاب اللہ میں باپ کہا گیا ہے اور باپ بھائیوں سے زیادہ طاقتور ہے، کیونکہ اس کے لیے مقررہ حصہ بھی ہے اور بطورِ عصبہ بھی وارث بنتا ہے، لہٰذا وہ باپ ہی کی مانند ہے۔ یوں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد میں داخل ہو جاتا ہے کہ ”جو کچھ باقی بچ جائے وہ قریب ترین مرد کے

[1] أبو داود، كتاب الفرائض، باب في ميراث الجدة، رقم الحديث (2894) سنن الترمذي، كتاب الفرائض، باب ما جاء في ميراث الجدة، رقم الحديث (2101)

لیے ہے۔'' جبکہ بعض اہلِ علم کا موقف یہ ہے کہ بھائی اور دادا مشترکہ طور پر حصہ دار ہوں گے۔ یہ بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اکثر فقہاء کا موقف ہے۔ تاہم ان میں اشتراک کی کیفیت کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

بھائیوں اور کلالہ کی وراثت:

سورۃ النساء کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ﴾

[النساء: ۱۷۶]

''لوگ آپ سے کلالہ کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہیے: ''اللہ تمھیں اس بارے میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص لا ولد مرجائے اور اس کی ایک بہن ہی ہو تو اسے ترکہ کا نصف ملے گا۔ اور اگر کلالہ عورت ہو (یعنی لا ولد ہو) تو اس کا بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔ اور کئی بہن بھائی یعنی مرد اور عورتیں (ملے جلے ہوں) تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔''

''کلالہ'' ''کلل'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تھک جانا۔ گویا اس شخص تک پہنچتے پہنچتے سلسلۂ نسل ونسب تھک گیا اور آگے نہ چل سکا۔

''کلالہ'' سے مراد وہ شخص ہے جس کی موت کے وقت اس کا بیٹا نہ ہو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے نصاً فرمایا ہے: ﴿ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ ﴾ ''جو لا ولد ہو۔'' یاد رہے کہ ولد کی نفی میں والد کی نفی بطریقِ اولیٰ ہو جاتی ہے، کیونکہ بچے کی والد کی طرف نسبت ولد کی طرف نسبت سے زیادہ ظاہر ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ''کلالہ'' کے بارے میں کہتے ہیں: ''مَنْ لَّا وَلَدَ لَهُ وَلَا وَالِدَ'' ''جس کا نہ بیٹا ہو اور نہ باپ ہو۔'' جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے علماء کا بھی یہی موقف ہے۔

درج بالا آیت سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں:

- میت کی کوئی اولاد نہ ہو، نہ بیٹے اور نہ بیٹیاں اور اس کی ایک ہی بہن ہو تو اسے آدھا حصہ ملے گا۔ اور اگر دو بہنیں ہوں تو انھیں ترکہ کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

- اگر اس کی اولاد ہو تو بہن کو آدھا حصہ نہیں ملے گا۔ اولاد میں اگر بیٹا ہو تو وہ میت کے پورے مال کا وارث ہوگا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ جب بیٹے ہی ہوں تو وہ پورے مال کے وارث بن جاتے ہیں، کیونکہ وہ عصبات میں سب سے زیادہ قریبی ہیں۔ لہٰذا وہ میت کے بھائیوں کو محروم کر دیتے ہیں، تو اس کی بہنوں کو کیوں کر محروم نہیں کریں گے! اور اگر اولاد میں بیٹی ہو تو بہن کو آدھا حصہ بطور مقررہ حصہ کے نہیں ملے گا، بلکہ جو باقی بچے وہ اسے بطور عصبہ ملے گا۔
- اگر مرنے والی عورت ہو اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو، نہ بیٹے اور نہ بیٹیاں، اور اس کا ایک بھائی ہو تو وہ اس کا مکمل وارث ہوگا اور اگر اس کا بیٹا ہو تو وہ بھائی کی نسبت زیادہ حقدار ہے اس کی وراثت کا، کیونکہ وہی مردوں میں سے اس کا قریب ترین رشتہ دار ہے اور اگر بیٹی ہو تو اس کو آدھا حصہ ملنے کے بعد جو بچے گا وہ بھائی کو ملے گا، کیونکہ وہ مردوں میں سے اس کا قریب ترین رشتہ دار ہے، لیکن اِس حالت میں وہ اس کا مکمل وراث نہیں بنے گا، جیسا کہ اولاد نہ ہونے کی شکل میں وہ اس کا مکمل وارث بنتا ہے۔
- اگر میت کے بہن بھائی دونوں ہوں اور اس کی اولاد بھی نہ ہو اور والد بھی نہ ہو تو ان بہن بھائیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم اِس طریقے سے ہوگی کہ بھائی کا حصہ دو بہنوں کے حصے کے برابر ہوگا۔

خاوند بیوی کی وراثت کے احکام:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَٰجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ ٱلرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ ٱلرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ ٱلثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ﴾ [النساء: ١٢]

’’اور تمھاری بیویوں کی اگر اولاد نہ ہو تو ان کے ترکہ سے تمھارا نصف حصہ ہے۔ اور اگر اولاد ہو تو پھر چوتھا حصہ ہے۔ اور یہ تقسیم ترکہ ان کی وصیت کی تعمیل اور ان کا قرضہ ادا کرنے کے بعد ہوگی۔ اور اگر تمھاری اولاد نہ ہو تو بیویوں کا چوتھا حصہ ہے۔ اور اگر اولاد ہو تو پھر آٹھواں حصہ ہے۔ اور یہ تقسیم تمھاری وصیت کی تعمیل اور تمھارے قرضے کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔‘‘

اِس آیت میں خاوند بیوی کی دو دو حالتیں ذکر کی گئی ہیں: بیوی کی اولاد نہ ہو تو اس کے خاوند کو اس

کے ترکہ سے آدھا حصہ ملے گا۔ اگر اولاد ہو تو اس کے خاوند کو اس کے ترکہ سے چوتھا حصہ ملے گا۔ جہاں تک بیوی کا تعلق ہے تو خاوند کی اگر اولاد نہ ہو تو اس کی بیوی کو اس کے ترکہ سے چوتھا حصہ ملے گا اور اگر اولاد ہو تو اس کی بیوی کو اس کے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا۔ یہ پوری تقسیم قرضے کی ادائیگی اور وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہوگی۔

اخیافی (مادری) بہن بھائی:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ ۚ﴾ [النساء: ۱۲]

''اگر میت کلالہ ہو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو اور اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔ اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی حصہ میں شریک ہوں گے۔''

اس سے مراد اخیافی بہن بھائی ہیں جن کی ماں ایک اور باپ الگ الگ ہو، کیونکہ عینی بہن بھائی یا علاتی بہن بھائی کا حصہ میراث میں اس طرح نہیں ہے اور اس کا بیان اس سورت کے آخر میں آ رہا ہے۔ بہرحال ایک بھائی یا ایک بہن کی صورت میں ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں یہ سب ایک تہائی حصے میں شریک ہوں گے، نیز ان میں مذکر اور مؤنث کے اعتبار سے بھی فرق نہیں کیا جائے گا۔ بلا تفریق سب کو مساوی حصہ ملے گا، مرد ہو یا عورت۔

رشتہ داروں کی وراثت:

بعض اہلِ علم نے نبی کریم ﷺ کے فرمان: ''جو کچھ باقی بچے وہ سب سے زیادہ قریبی مرد کے لیے ہے۔'' سے استدلال کیا ہے کہ اصحاب الفروض (جن کے حصے مقرر کیے گئے ہیں) اور عصبات (جو باقی بچا ہوا مال لیتے ہیں) کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کے لیے وراثت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ وہ رشتہ دار جن کا ذکر قرآن مجید میں بطورِ ورثاء نہیں ہے، اِس حدیث میں ان میں سے صرف میت کے قریب ترین مرد کا ذکر ہے، لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے مذکورہ الفاظ کا تعلق عصبات کے ساتھ ہے، نہ کہ باقی رشتہ داروں کے ساتھ۔

فوائدِ حدیث:

1. اللہ تعالیٰ نے وراثت کے بیشتر مسائل قرآن مجید میں ذکر کر دیے ہیں۔
2. جب بیٹیاں دو تہائی کی حقدار ہوں تو پوتیوں کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔
3. جب میت کی اولاد موجود ہو تو اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو اس کے ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا۔
4. ''کلالہ'' اسے کہتے ہیں جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا۔
5. شریعت نے وراثت کے مختلف مسائل ذکر کر دیے ہیں اور انھیں انسانوں پر نہیں چھوڑا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت مکمل ہے۔
6. نبی کریم ﷺ کے فرمان: «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ» میں امر وجوب کے لیے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جن کے حصے مقرر شدہ ہیں انھیں ان کے حصے دینا واجب ہے۔ اس میں انسانوں کے لیے کوئی دوسرا اختیار نہیں ہے۔
7. مرد کا عورت کے مقابلے میں دوگنا حصہ اِس لیے ہے کہ مرد کی ذمہ داریاں عورت سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں اور اسے جو کچھ ملتا ہے وہ آخر کار عورت کی مصلحتوں ہی میں خرچ کرتا ہے۔

سوالات:

1. شریعت نے وراثت کی تقسیم خود کر دی ہے اور اسے لوگوں پر نہیں چھوڑا، اس میں کیا حکمت ہے؟
2. فرائض اور عصبات میں کیا فرق ہے؟
3. درج ذیل مسئلہ میں وراثت کی تقسیم کیسے ہوگی؟

   بیٹا۔ دو بیٹیاں۔ پوتی۔ بھائی۔ ماں باپ۔
4. کلالہ کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی وجہِ تسمیہ کیا ہے؟
5. صحیح اور غلط کی نشاندہی کریں:

- بیٹے کی عدم موجودگی میں بیٹیاں آدھا حصہ لیتی ہیں۔ (......)
- اگر میت کی اولاد ہو تو ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ (......)
- وراثت میں دادا باپ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ (......)



رضاعت کے بعض احکام

(42) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہاں تشریف فرما تھے۔ میں نے سنا کہ کوئی صاحب سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کی: اللہ کے رسول! یہ شخص آپ کے گھر میں آنے کی اجازت چاہتا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا:

«أُرَاهُ فُلَاناً لِعَمِّ حَفْصَةَ مِنَ الرِّضَاعَةِ» قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْ كَانَ فُلَانٌ حَيًّا لِعَمِّهَا مِنَ الرِّضَاعَةِ دَخَلَ عَلَيَّ فَقَالَ: «نَعَمْ، اَلرِّضَاعَةُ تُحَرِّمُ مَا تُحَرِّمُ الْوِلَادَةُ»[1]

"میرا خیال ہے یہ فلاں شخص ہے۔" آپ ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا کا نام لیا۔ اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ فلاں، جو ان کے رضاعی چچا تھے، اگر زندہ ہوتے تو میرے پاس آ سکتے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں دودھ بھی ان رشتوں کو محرم بنا دیتا ہے جنھیں خون بناتا ہے، یعنی دودھ پینے سے وہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو خون سے قائم ہوتا ہے۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهَا أَخْبَرَتْهُ: أَنَّ عَمَّهَا مِنَ الرِّضَاعَةِ يُسَمَّى أَفْلَحَ، إِسْتَأْذَنَ عَلَيْهَا فَحَجَبَتْهُ، فَأَخْبَرَتْ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهَا: «لَا تَحْتَجِبِي مِنْهُ، فَإِنَّهُ يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے رضاعی چچا نے، جن کا نام افلح تھا، ان کے ہاں آنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے ان سے پردہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(1) أخرجه البخاري، كتاب النكاح، باب ﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ﴾، رقم الحديث (5099) ومسلم، كتاب الرضاع، باب ما يحرم من الرضاعة، رقم الحديث: 1 (1444)

(2) أخرجه مسلم، كتاب الرضاع، باب تحريم الرضاعة من ماء الفحل، رقم الحديث: 9 (1445)

''تم ان سے پردہ نہ کرو، کیونکہ رضاعت سے بھی وہ سب رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔''

علماء کا اِس قسم کی احادیث پر عمل کرنے پہ اجماع ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رضاعت بھی ان رشتوں کو محرم بنا دیتی ہے جو خاندانی اعتبار سے محرم ہوتے ہیں۔

خاندانی اعتبار سے محرم رشتے:

خاندانی اعتبار سے جو رشتے نکاح کے لیے حرام ہو جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں:

انفرادی طور پر ہمیشہ کے لیے حرمت، اِس کی بھی دو قسمیں ہیں:

⊙ پہلی قسم:

وہ رشتے جو صرف خاندانی اعتبار سے محرم ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدمی کے اصول خواہ کتنے اوپر چلے جائیں اور فروع خواہ کتنی نیچے چلی جائیں، اس پر دونوں سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اسی طرح اس کی قریب ترین اصل کی فروع خواہ کتنی نیچے چلی جائیں اور اس کے دور والے اصول کی فروع بھی۔ اِس طرح اس کی اصول میں اس کی مائیں، خواہ وہ باپ کی جانب سے ہوں یا ماں کی جانب سے۔ اور اس کی فروع میں بیٹیاں اور بیٹیوں کی اولاد خواہ کتنی نیچے تک ہو۔ قریب ترین اصل کی فروع میں اس کی سگی بہنیں، مادری بہنیں، پدری بہنیں اور ان کی بیٹیاں، نیز بھائیوں کی بیٹیاں اور ان کی اولاد خواہ کتنی نیچے تک چلی جائے۔ اور دور والے اصول کی فروع میں پھوپھیاں، خالائیں، ماں باپ کی پھوپھیاں اور ان کی خالائیں، خواہ کتنی اوپر تک چلی جائیں۔ یوں قریبی رشتہ داروں میں سے اس کے لیے کوئی نہیں بچتا سوائے اس کے دور والے اصول کی فروع کے، جن میں چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد لڑکیاں شامل ہیں۔

⊙ دوسری قسم:

وہ رشتے جو خاندانی اعتبار کے ساتھ ساتھ کسی اور سبب کی بنا پر بھی حرام ہوتے ہیں اور وہ سبب ہے:

سسرالی رشتہ، چنانچہ آدمی پر اس کے باپ کی بیویاں، اس کے بیٹوں کی بیویاں، اس کی بیویوں کی مائیں، نیز اس کی ان بیویوں کی (پہلے خاوند سے) بیٹیاں جن کے ساتھ وہ صحبت کر چکا ہو۔ اسی طرح آدمی پر اس کی بیوی کی ماں، یا ماں کی طرف سے مائیں یا باپ کی طرف سے مائیں خواہ وہ کتنی اوپر تک چلی جائیں۔ نیز اس کی بیوی کی وہ بیٹیاں (جو اس کی گود میں پرورش پا رہی ہوں)، پھر ان کی بیٹیاں خواہ وہ کتنی نیچے تک

چلی جائیں۔ اسی طرح اس کی بیوی کے بیٹوں کی بیٹیاں بھی اس پر حرام ہیں۔ اور اس پر یہ بھی حرام ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیوی سے یا بیٹے کی بیوی سے نکاح کرے۔

اجتماع کی صورت میں ابدی حرمت:

یہ تحریم مردوں کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک عورت دو خاوندوں کو جمع کرے۔

اجتماع کی صورت میں ابدی حرمت یوں ہے کہ ہر وہ دو عورتیں جن کے درمیان خونی رشتہ اِس قسم کا ہو کہ اگر فرضاً ان میں سے ایک مرد ہوتا تو دونوں کا آپس میں نکاح جائز نہ ہوتا، تو اِس قسم کی دو عورتوں کا ایک آدمی کے نکاح میں جمع ہونا ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً: پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی دونوں ایک ہی آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

رضاعت کی وجہ سے محرمات:

جب خاندانی محرم رشتوں کا علم ہوگیا تو بالکل اسی طرح رضاعت کی وجہ سے بھی رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آدمی پر اپنی رضاعی ماں سے نکاح کرنا حرام ہے، خواہ وہ کتنی اوپر تک چلی جائیں۔ اسی طرح رضاعی بیٹیوں سے نکاح کرنا بھی حرام ہے، خواہ وہ کتنی نیچے تک چلی جائیں۔ نیز اس کی رضاعی بہنیں، رضاعی بہنوں کی بیٹیاں، اس کی رضاعی پھوپھیاں اور خالائیں بھی حرام ہیں، خواہ وہ کتنی اوپر تک چلی جائیں۔ مثال کے طور پر ایک عورت نے ایک بچے کو مدتِ رضاعت کے اندر کم از کم پانچ مرتبہ پیٹ بھر کے دودھ پلایا، تو وہ نصِ قرآنی کے مطابق اس کی ماں بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس کے لیے محرم اور اس کی مائیں بھی اور اس کی ساری بیٹیاں اس کی رضاعی بہنیں بن جاتی ہیں، اس لیے وہ بھی نصِ قرآنی کے مطابق اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔

سنت قرآن مجید کو مکمل کرتی ہے:

رضاعت کی وجہ سے باقی تمام حرمتیں سنت سے لی گئی ہیں جیسا کہ سنت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صرف دو بہنوں ہی کو ایک آدمی کے نکاح میں بیک وقت جمع کرنا حرام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عورت اور اس کی پھوپھی اور عورت اور اس کی خالہ کو بھی ایک آدمی کے نکاح میں بیک وقت جمع کرنا حرام ہے۔ چونکہ دودھ پلانے والی عورت کی اولاد رضاعت کے اعتبار سے یا خاندانی اعتبار سے دودھ پینے والے بچے کے بہن بھائی بن جاتے ہیں اس لیے اس پر ان بہن بھائیوں کی بیٹیاں بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ

نے اپنے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور ابوسلمہ کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے۔[1]

اسی طرح اس پر دودھ پلانے والی عورت کی بہنیں بھی حرام ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ اس کی خالائیں بن جاتی ہیں۔

یاد رہے کہ یہ حرمت دودھ پلانے والی خاتون کے خاوند تک چلی جاتی ہے، چنانچہ وہ دودھ پینے والے بچے کا باپ بن جاتا ہے اور اس کی پوری اولاد چاہے دودھ پلانے والی عورت سے ہو یا دوسری عورتوں سے اور چاہے وہ اولاد خاندانی اعتبار سے ہو یا رضاعی اعتبار سے، وہ سب دودھ پینے والے بچے کے بہن بھائی بن جاتے ہیں۔ اور دودھ پلانے والی خاتون کے خاوند کے بھائی دودھ پینے والے بچے کے چچے بن جاتے ہیں۔ یہ سلف میں سے جمہور اہلِ علم کا موقف ہے اور ائمہ اربعہ اور ان کے بعد والے ائمہ کا اِس پر اتفاق ہے۔ اِس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ ''میرے رضاعی چچا (افلح، جو کہ ابوالقعیس کے بھائی تھے) آئے، وہ مجھ سے (گھر کے) اندر آنے کی اجازت چاہتے تھے، میں نے انھیں اجازت دینے سے انکار کر دیا حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے عرض کی: میرے رضاعی چچا نے میرے پاس (گھر کے اندر) آنے کی اجازت مانگی تو میں نے انھیں اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارے چچا تمھارے پاس (گھر میں) آ جائیں۔'' میں نے کہا: مجھے عورت نے دودھ پلایا تھا، مرد نے نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ تمھارے چچا ہیں، وہ تمھارے گھر میں آ سکتے ہیں۔'' ایک روایت میں ہے: «اِئْذَنِي لَهُ، فَإِنَّهُ عَمُّكِ تَرِبَتْ يَمِينُكِ» ''تمھارے ہاتھ خاک آلود ہوں! انھیں اندر آنے کی اجازت دے دو کیونکہ وہ تمھارے چچا ہیں۔'' یاد رہے کہ ابوالقعیس اس عورت کے خاوند کا نام تھا جس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دودھ پلایا تھا۔[2]

رضاعی حرمت کہاں تک؟:

رضاعی حرمت وہاں تک جاتی ہے جہاں تک خونی اور خاندانی حرمت جاتی ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسلم، رقم الحدیث (1449)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الأدب، باب قول النبي ﷺ: «تَرِبَتْ يَمِينُكَ»، رقم الحديث (6156) ومسلم، كتاب الرضاع، باب تحريم الرضاعة من ماء الفحل، رقم الحديث: 5 (1445)

کا ارشاد ہے کہ ''رضاعت سے ہر وہ رشتہ حرام ہو جاتا ہے جو خاندانی اعتبار سے حرام ہوتا ہے۔'' لہٰذا رضاعی حرمت ان رشتوں کی حرمت تک پھیل جاتی ہے جو خاندانی اور سسرالی اعتبار سے حرام ہوتے ہیں۔ مثلاً: آدمی کی جانب سے اس کے باپ کی بیوی اور اس کا بیٹا اور بیوی کی جانب سے اس کی ماں اور اس کی بیٹی۔ اسی طرح دو بہنوں کو جمع کرنا، عورت اور اس کی پھوپھی یا عورت اور اس کی خالہ کو جمع کرنا۔ یہ سارے رشتے رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہوتے ہیں۔

رہا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَحَلَٰٓئِلُ أَبْنَآئِكُمُ ٱلَّذِينَ مِنْ أَصْلَٰبِكُمْ ﴾ ''اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں جو تمھاری صلب سے ہوں۔'' تو اِس کا یہ معنی نہیں ہے کہ رضاعی بیٹوں کی بیویاں حرام نہیں ہوتیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں حرام نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے منہ بولے بیٹے سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا۔

یاد رہے کہ حرمتِ رضاعت صرف دودھ پینے والے بچے کے ساتھ خاص ہے، باقی جہاں تک اس کے بہن بھائیوں یا اس کے آباء واجداد، اس کی ماں، اس کے چچوں، اس کی پھوپھیوں، اس کے ماموں اور اس کی خالاؤں کا تعلق ہے تو یہ حرمت ان تک نہیں پہنچتی، لہٰذا خود دودھ پلانے والی خاتون دودھ پینے والے بچے کے باپ اور اس کے بھائی کے لیے حلال ہے، اسی طرح اس کی ماں اور اس کی بہن دودھ پینے والے بچے کے باپ اور اس کے بھائی کے لیے حلال ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے، ان کا کہنا ہے کہ دودھ پینے والے بچے کے لیے اپنے رضاعی بھائی کی بہن سے اور رضاعی بیٹی کی بہن سے شادی کرنا جائز ہے۔ واللہ اعلم

فوائدِ حدیث:

1. دودھ پینے والے بچے پر دودھ پلانے والی عورت کے اصول وفروع حرام ہو جاتے ہیں۔
2. رضاعت ہر اس رشتے کو حرام کر دیتی ہے جسے خونی تعلق حرام کرتا ہے۔
3. محرمات دو قسم کی ہیں: نسبی اور سببی۔
4. آدمی پر اس کی رشتہ دار عورتوں میں سے کوئی حلال نہیں سوائے اس کے دور والے اصول کی فروع کے اور وہ ہیں: چچوں کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں۔
5. سسرالی رشتہ داروں میں سے جو عورتیں حرام ہوتی ہیں وہ چار ہیں: باپ کی بیوی، بیٹے کی بیوی، بیوی کی ماں اور اس عورت کی بیٹی جس سے اس نے نکاح کر کے صحبت کر لی۔

6 ہر وہ دو عورتیں جن کے درمیان محرم کا رشتہ ہو، یعنی اگر ان میں سے ایک مرد ہوتا تو ان کا آپس میں نکاح کرنا حرام ہوتا، انھیں ایک آدمی کے نکاح میں بیک وقت جمع کرنا حرام ہے۔

7 دودھ پلانے والی عورت کا خاوند جس کی وجہ سے اس کا دودھ پیدا ہوا، وہ دودھ پینے والے بچے کا باپ بن جاتا ہے اور اس کی پوری اولاد، چاہے دودھ پلانے والی بیوی سے ہو یا دوسری بیویوں سے ہو، سب کے سب اس بچے کے بہن بھائی بن جاتے ہیں۔

8 دودھ پینے والے بچے کے خاندانی بہن بھائیوں کا رضاعت سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا حرمتِ رضاعت ان تک نہیں پہنچتی۔

سوالات:

1 نسبی محرمات میں سے پانچ ذکر کریں۔

2 درج ذیل عورتوں سے شادی کا حکم بیان کریں: بہو، ساس، بیوی کی (پہلے خاوند سے) بیٹی، دودھ پلانے والی عورت کی بہن، دودھ پلانے والی عورت کے خاوند کی دوسری بیوی سے بیٹی، آپ کے والد کی خالہ، آپ کے بھائی کو دودھ پلانے والی عورت کی بیٹی، آپ کے منہ بولے بیٹے کی بیوی۔

3 آدمی کے لیے بعیدی اصول کی فروع میں سے کون سی عورتیں حلال ہیں؟

4 بعض محرمات وقتی ہوتی ہیں۔ اس کی مثالیں ذکر کریں، نیز ابدی اور عارضی محرمات کے درمیان فرق ذکر کریں۔

5 ابدی حرمت سے تب کیا مراد ہے جب یہ کہا جائے کہ یہ اجتماع کی شکل میں ہے نہ کہ انفرادی طور پر؟ اس کی مثالیں ذکر کریں۔



مقاصد معتبر ہیں

(43) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے مکہ مکرمہ میں عام الفتح کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

« إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ »، فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ شُحُومَ الْمَيْتَةِ، فَإِنَّهَا يُطْلَى بِهَا السُّفُنُ وَيُدْهَنُ بِهَا الْجُلُودُ وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ؟ فَقَالَ: « لَا، هُوَ حَرَامٌ »، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عِنْدَ ذٰلِكَ: « قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ، إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُومَهَا، جَمَلُوهُ، ثُمَّ بَاعُوهُ، فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ »[1]

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، خنزیر، اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کر دیا ہے۔'' عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! مردار کی چربی کا کیا حکم ہے؟ لوگ اسے کشتیوں پر ملتے ہیں، کھالوں پر لگاتے ہیں اور اپنے گھروں میں اس سے چراغ بھی جلا لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، یہ بھی حرام ہے۔'' تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہود کو تباہ و برباد کرے! جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کو حرام کیا تو انھوں نے اسے پگھلا کر فروخت کیا اور قیمت کھائی۔''

ابن ابی شیبہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: « إِنَّ اللّٰهَ إِذَا حَرَّمَ شَيْئًا حَرَّمَ ثَمَنَهُ »[2]

''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام کر دیتا ہے۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى حَرَّمَ الْخَمْرَ، فَمَنْ أَدْرَكَتْهُ هٰذِهِ الْآيَةُ وَعِنْدَهُ مِنْهَا شَيْءٌ فَلَا

---

(1) أخرجه البخاري، كتاب البيوع، باب بيع الميتة والأصنام، رقم الحديث (2236) ومسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والمينة، رقم الحديث: 71 (1581)

(2) مصنف ابن أبي شيبة (100/6)

يَشْرَبْ، وَلَا يَبِعْ »، قَالَ: فَاسْتَقْبَلَ النَّاسُ بِمَا كَانَ عِنْدَهُ مِنْهَا فِي طَرِيقِ الْمَدِينَةِ فَسَفَكُوهُ»[1]

''اللہ تعالیٰ نے یقیناً شراب کو حرام کر دیا ہے، لہٰذا جس شخص تک یہ آیت پہنچے اور اس کے پاس اس (شراب) میں سے کچھ (حصہ باقی) ہے تو نہ وہ اسے پیے اور نہ فروخت کرے۔''

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''لوگوں کے پاس جو بھی شراب تھی وہ اسے لے کر مدینہ کے راستے میں نکل آئے اور اسے بہا دیا۔''

حرام چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

مذکورہ تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام کر دیا ہے ان سے کسی بھی طرح سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ نہ ان چیزوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور نہ ان کی قیمت لینا یا ان سے فائدہ اٹھانا درست ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ والی روایت کے الفاظ اِس سلسلے میں بالکل واضح ہیں اور ایسی چیزوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جو چیزیں خود باقی رہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مثلاً:

- بت، جن کو اللہ کا شریک بنا کر فائدہ حاصل کرنے کی امید رکھی جاتی ہے اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔
- وہ کتب جو شرک، جادو، بدعات اور گمراہی پر مشتمل ہوں۔ ان سے فائدہ اٹھانا بھی حرام ہے۔
- حرام تصویریں اور آلاتِ موسیقی وغیرہ۔
- گانا گانے والی نوجوان لڑکیوں کو گانے کی خاطر خریدنا۔

اگر بیچنے والے شخص کو پتا ہو کہ خریدار حرام مقاصد کی خاطر خرید رہا ہے تو امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر کئی علماء کے نزدیک اسے فروخت کرنا ناجائز ہے۔

- اس شخص کو جوس بیچنا جو اسے شراب بنا لے۔
- فتنہ کے ایام میں اسلحہ بیچنا۔
- برتن اور پیالے اس شخص کو بیچنا جو انھیں شراب نوشی کے لیے استعمال کرے۔
- غلام ایسے شخص کو بیچنا جس کے بارے میں پتا ہو کہ یہ اس سے بے حیائی کروائے گا۔

دوسری قسم: حرام چیزوں کو ختم کر کے ان سے فائدہ اٹھانا۔

---

[1] مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والميتة، رقم الحديث: 67(1578)

کوئی چیز جب خود حرام ہوتی ہے تو اس کی بیع کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ مثلاً: خنزیر، نشہ آور چیزیں اور مردار وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو حرام ہیں، تو ان چیزوں کی بیع بھی حرام ہے اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی۔ اگرچہ مجبوری کی حالت میں ان سے فائدہ اٹھانا حرام نہیں ہوتا، مثلاً: مجبور آدمی کا مردار کے گوشت کو کھانا، گلے میں کانٹا اٹکا ہوا ہو اور دیگر حلال مشروبات نہ ہوں تو اسے نگلنے کے لیے شراب پینا وغیرہ۔ یہ منافع چونکہ بذات خود مقصود نہیں ہوتے اس لیے مجبوری کی حالت میں ان کی رخصت دی گئی ہے اور ان کی بیع اس لیے حرام ہے کہ خنزیر اور مردار کا کھانا اور شراب کا پینا حرام ہے۔

مردار کی چربی کے بارے میں جب نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ لوگ اسے کشتیوں پر ملتے ہیں، کھالوں پر لگاتے ہیں اور اپنے گھروں میں اس سے چراغ بھی جلا لیتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، یہ بھی حرام ہے۔'' اِس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے جو ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے۔

آپ ﷺ کے اس فرمان: ''نہیں، یہ بھی حرام ہے۔'' کے معنی میں اہلِ علم کے مابین اختلاف واقع ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ مردار کی چربی سے فائدہ اٹھانا بھی حرام ہے۔ تب اِس میں مردار کی بیع کے حرام ہونے کی تاکید ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے کسی بھی طرح کے فائدہ اٹھانے کو حرام قرار دیا۔ جبکہ ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا کہ مردار کی بیع حرام ہے، اگرچہ اس کی چربی سے مذکورہ مختلف طریقوں کے ساتھ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن چربی سے مقصود کھانا ہو تو اس مقصد کی خاطر اس کی بیع حرام ہوگی۔

مردار جانور کے بقیہ اجزاء:

جانور کا جو حصہ پاک ہو اس کی بیع جائز ہے، کیونکہ اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، جیسے: بال اور سینگ (ان علماء کے نزدیک جو انھیں پاک کہتے ہیں) اسی طرح بعض علماء کے نزدیک جانور کی جلد کا معاملہ ہے جو اسے بغیر رنگے بھی پاک کہتے ہیں، جیسا کہ امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کا صحیح بخاری میں ایک باب بھی اسی پر دلالت کرتا ہے جس میں انھوں نے درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ بِشَاةٍ مَيِّتَةٍ، فَقَالَ: « هَلَّا اسْتَمْتَعْتُمْ بِإِهَابِهَا؟ » قَالُوا: إِنَّهَا مَيِّتَةٌ، قَالَ: « إِنَّمَا حَرُمَ أَكْلُهَا »[1]

[1] أخرجه البخاري، كتاب الذبائح، باب جلود الميتة، رقم الحديث (5531) ومسلم، كتاب الحيض، باب طهارة جلود الميتة بالدباغ، رقم الحديث: 101 (363)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مری ہوئی بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''تم نے اس کے چمڑے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟'' لوگوں نے کہا کہ یہ تو مردار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صرف اس کا (گوشت) کھانا حرام ہے۔''

جہاں تک جمہور اہلِ علم کا تعلق ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ جلد رنگنے سے پہلے ناپاک ہوتی ہے، لہٰذا اس کی بیع بھی حرام ہے، کیونکہ وہ مردار کا ایک حصہ ہے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مردار کی جلد کی بیع مردار کو کھانے کی طرح ہی ہے، یعنی دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ طاؤس اور عکرمہ رحمہما اللہ نے اسے مکروہ کہا ہے۔

اور امام نخعی رحمہ اللہ کہتے تھے: سلف صالحین مردار کی جلد کو بیچ کر اس کی قیمت کو کھانا مکروہ سمجھتے تھے۔ ہاں جب مردار کی جلد کو رنگ دیا جائے تو جو اہلِ علم اس کی طہارت کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس کی بیع جائز ہے۔ اور جو اہلِ علم اس کی طہارت کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک اس کی بیع ناجائز ہے۔

کتے کی خرید وفروخت:

کتے کی خرید وفروخت کے بارے میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ»[1]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت، فاحشہ عورت کی کمائی اور کاہن کی نذر ونیاز سے منع فرمایا ہے۔''

صحیح مسلم میں سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«شَرُّ الْكَسْبِ مَهْرُ الْبَغِيِّ، وَثَمَنُ الْكَلْبِ، وَكَسْبُ الْحَجَّامِ»[2]

''بدترین کمائی زانیہ کی اجرت، کتے کی قیمت اور پچھنے لگانے والے کی کمائی ہے۔''

یاد رہے کہ علماء کے مابین کتے کی بیع کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ان میں اوزاعی رحمہ اللہ، مشہور قول کے مطابق امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے حرام کہا ہے۔ اور ابن سیرین رحمہ اللہ نے اسے ناپاک ترین کمائی قرار دیا ہے۔

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب البيوع، باب ثمن الكلب، رقم الحديث (2237) ومسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم ثمن الكاهن، رقم الحديث: 39 (1567)

[2] مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم ثمن الكلب، رقم الحديث: 40 (1568)

مذکورہ دلائل کے علاوہ ان کے کچھ مزید دلائل یوں ہیں:

① کتے کی بیع سے اس کی نجاست کی وجہ سے منع کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ہر ایسے جانور کی بیع حرام ہے جو نجس العین ہو۔ یہ امام شافعی اور ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا موقف ہے اور حنابلہ میں ایک جماعت نے بھی اس کی موافقت کی ہے جن میں ابن عقیل رحمہ اللہ شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خچر اور گدھے کو ہم نجس نہ کہیں تو ان کی بیع کو ہم جائز کہتے ہیں، لیکن ان کی یہ بات اجماع امت کے خلاف ہے۔

② کتے سے فائدہ اٹھانا اور اسے اپنے ہاں پالنا ناجائز ہے۔ اس کا معاملہ خچر اور گدھے کی طرح نہیں، کیونکہ ان کو پالنا جائز ہے۔ ہاں کتے کو بعض ضرورتوں کی بنا پر پالنا جائز ہے، لیکن اس سے اس کی بیع جائز نہیں ہوتی۔ جیسا کہ مردار و خنزیر کو کھانے کی مجبوری ان کی بیع کو جائز نہیں کرتی۔

③ کتے کی بیع سے اس کے گھٹیا پن اور ذلالت کی وجہ سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی قیمت صرف گھٹیا اور ذلیل لوگوں کے ہاں ہی ہو سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کتا آسانی سے مل بھی جاتا ہے۔ لہٰذا شارع نے اس کی بیع سے اس لیے منع کیا ہے کہ جو قیمت اس کی بیع پر خرچ کی جائے اس کے ساتھ کسی غریب کی ہمدردی اور مدد کر دی جائے تو وہ بہتر ہے۔

شکاری کتے کو پالنے کا حکم:

بعض اہلِ علم نے ایسے کتے کی بیع کو جائز قرار دیا ہے جس کو پالنا شرعاً درست ہے، مثلاً: شکاری کتا۔ یہ عطاء، نخعی اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں کا موقف ہے اور ایک روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ کا بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف ان کتوں کی بیع حرام ہے جنھیں پالنا حرام ہے۔ جنھیں پالنا جائز ہے ان کی بیع بھی جائز ہے۔ ان کی دلیل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے اور بلی کی قیمت سے منع کیا، سوائے شکاری کتے کے۔[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شکاری کتے کی بیع کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم

① أخرجه النسائي في الكبرىٰ، كتاب الصيد والذبائح، باب النهي عن ثمن الكلب، رقم الحديث (4806) وفي كتاب البيوع، باب بيع الكلب، رقم الحديث (6264) وأخرجه الدارقطني (73/3)

فوائدِ حدیث:

1. اللہ تعالیٰ جب ایک چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی بیع کو بھی حرام کر دیتا ہے۔
2. بیع تب جائز نہیں ہوتی جب بائع کو پتا ہو کہ خریدار اس چیز کو حرام منفعت کے لیے استعمال کرے گا۔
3. شکاری کتا رکھنا جائز ہے۔
4. وہ حیوانات جن کا گوشت حلال نہیں اور ان میں کوئی منفعت بھی نہیں، ان کی بیع ناجائز ہے۔

سوالات:

1. جب اللہ تعالیٰ نے یہود پر چربی کو حرام کیا تو انھوں نے اس کو استعمال کرنے کا کونسا حیلہ اختیار کیا؟
2. صرف علم و معرفت کی خاطر جادو کے بارے میں کتب خریدنے کا کیا حکم ہے؟
3. شکاری کتے کی بیع کا کیا حکم ہے؟ اِس بارے میں علماء کے دلائل کون سے ہیں؟
4. تین ایسی چیزیں ذکر کریں جو باقی رہیں اور ان سے فائدہ اٹھانا حرام کر دیا گیا ہے۔



ہر نشہ آور چیز حرام ہے

(44) سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو انھوں نے آپ ﷺ سے ان مشروبات کے متعلق سوال کیا جو وہاں تیار کیے جاتے تھے:

فَقَالَ: « وَمَا هِيَ؟ » قَالَ: اَلْبِتْعُ وَالْمِزْرُ، فَقُلْتُ لِأَبِي بُرْدَةَ: مَا الْبِتْعُ؟ قَالَ: نَبِيْذُ الْعَسَلِ، وَالْمِزْرُ نَبِيْذُ الشَّعِيْرِ، فَقَالَ: « كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ »[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ کیا ہیں؟'' حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے بتایا: بتع اور مزر ہیں۔ (راوی کہتا ہے کہ) میں نے ابو بردہ سے پوچھا: (بتع اور مزر) کیا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ ''بتع'' شہد کا شیرہ اور ''مزر'' جو کا شیرہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نشے والی چیز حرام ہے۔''

یہ حدیث ان تمام نشہ آور چیزوں کی حرمت کی بنیادی دلیل ہے جو عقل پہ پردہ ڈال دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نشہ آور چیزوں کی حرمت کی علت بیان کر دی ہے۔

شروع شروع میں ''خمر'' کی حرمت صرف نماز کے وقت تھی، جب مہاجرین میں سے کچھ لوگوں نے نشے کی حالت میں نماز پڑھی تو انھیں قراءت میں اختلاط ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾

[النساء: ۴۳]

''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب تک نہ جاؤ تا آنکہ تمھیں یہ معلوم ہو سکے کہ تم نماز میں کہہ کیا رہے ہو۔''

پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک اعلان کرنے والا اعلان کرتا کہ کوئی شخص نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ آئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے مطلقاً حرام کر دیا اور یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

[1] أخرجه البخاري، كتاب المغازي، باب بعث أبي موسى و معاذ إلى اليمن، رقم الحديث (4343)

الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾

[المائدة: ۹۰۔۹۱]

''اے اہلِ ایمان! بے شک شراب، جوا اور وہ پتھر جن پر بتوں کے نام سے جانور ذبح کیے جاتے ہیں، اور فال نکالنے کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں۔ پس تم ان سے بچو شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ بے شک شیطان شراب اور جوا کی راہ سے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کرنا چاہتا ہے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دینا چاہتا ہے۔تو کیا تم لوگ (اب) باز آ جاؤ گے۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ''خمر'' (ہر نشہ آور چیز) اور ''میسر'' (جوا) کی حرمت کی علت ذکر کر دی کہ شیطان ان کے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص نشہ کرتا ہے اس کی عقل میں خلل آ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بعض اوقات لوگوں کی جانوں اور ان کے مالوں میں انھیں اذیت پہنچانے پر تل جاتا ہے اور بعض اوقات قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

''خمر'' ام الخبائث (ناپاک چیزوں کی ماں) ہے۔ جو اسے پی لیتا ہے وہ قتل بھی کر سکتا ہے، زنا بھی کر سکتا ہے اور حتیٰ کہ کفر بھی کر سکتا ہے۔ اور جو شخص جوے میں ملوث ہوتا ہے، ہو سکتا ہے وہ مجبور ہو اور اس کا مال اس سے زبردستی چھین لیا جائے اور اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔ چنانچہ مال چھیننے والے شخص کے خلاف اس کے دل میں دشمنی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر وہ چیز جس کی وجہ سے دشمنی اور بغض پیدا ہو، وہ حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا فرمان میں خبردار کیا ہے کہ شیطان ''خمر'' اور ''میسر'' کے ذریعے ذکر اللہ اور نماز سے منع کرتا ہے، کیونکہ نشے والا شخص اپنی عقل میں خلل کی وجہ سے نہ اللہ کا ذکر کر سکتا ہے اور نہ ہی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اسی لیے سلف صالحین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ نشیء آدمی پر ایک وقت ایسا آتا ہے جس میں وہ اپنے رب کو بھی نہیں پہچانتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اسے پہچانیں، اس کا ذکر کریں اور اس کی عبادت کریں، لہٰذا جو چیز اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ بن رہی ہو وہ یقینی طور پر حرام ہے۔ تاہم نیند کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسی طرح پیدا کیا ہے کہ اسے نیند آتی ہے اور وہ اس پر مجبور ہوتا ہے۔

انسانوں کے جسم اسی نیند کے ساتھ ہی راحت پاتے ہیں۔ انھیں نیند کے ساتھ تھکاوٹ اور بھاگ دوڑ سے آرام ملتا ہے۔ تو یہ نیند اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ مومن جب ضرورت کے بقدر سو لے، پھر اٹھ کر اللہ کے ذکر اور مناجات میں مشغول ہو جائے تو اس کی نیند نماز اور ذکر کے لیے کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے تھے: ''میں نیند پر بھی اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کا طلب گار ہوتا ہوں جیسا کہ اپنے قیام پر اجر وثواب کا طلب گار ہوتا ہوں۔''

ہر نشہ آور چیز حرام ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«كُلُّ مَا أَسْكَرَ عَنِ الصَّلَاةِ فَهُوَ حَرَامٌ»[1]

''ہر وہ چیز جو نماز سے مدہوش کر دے وہ حرام ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

«كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ»[2]

''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔''

اِس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تواتر کی حد تک ثابت ہیں۔

ہر نشہ آور چیز کے حرام ہونے پر صحابہ، تابعین اور جمہور اہلِ علم کا اتفاق ہے، لیکن اہلِ کوفہ کے کچھ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ ''خمر'' سے مراد صرف وہ نشہ آور مشروب ہے جسے انگوروں سے کشید کیا جائے۔ جہاں تک باقی چیزوں کا تعلق ہے تو ان میں سے صرف اتنی مقدار حرام ہے جو نشہ آور ہو۔ اور جو مقدار نشہ آور نہ ہو وہ حرام نہیں ہے۔

ہر نشہ آور چیز کے حرام ہونے کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ''خمر'' کی حرمت مدینہ منورہ میں اس وقت نازل ہوئی جب اہلِ مدینہ نے اپنے ہاں پائے جانے والے مشروبات کے بارے میں سوال کیا اور ان میں انگور سے کشید کیا ہوا مشروب شامل ہی نہیں تھا۔ اگر آیت الخمر ان کے ہاں پائے جانے والے تمام مشروبات کو شامل نہیں تھی تو اس میں ان کے سوال کا جواب نہ ہوتا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ انھیں ان کے سوال

---

[1] أخرجه مسلم، كتاب الأشربة، باب بيان أن كل مسكر خمر وأن كل خمر حرام، رقم الحديث (2002)

[2] أخرجه مسلم، كتاب الأشربة، باب بيان أن كل مسكر خمر وأن كل خمر حرام، رقم الحديث (2003)

کا جواب نہ ملتا۔ پھر جب "خمر" کی تحریم نازل ہوئی تو انھوں نے تمام مشروبات بہا ڈالے، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے "خمر" سے یہی سمجھا تھا کہ سب کی سب نشہ آور چیزیں حرام ہیں۔

صحیح بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب خمر کی حرمت نازل ہوئی تو اس وقت مدینہ منورہ میں پانچ قسم کے نشہ آور مشروبات پائے جاتے تھے جن میں انگور سے بنی ہوئی شراب نہیں تھی۔[1]

جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ آور ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے:

مختار بن فلفل رحمہ اللہ کہتے ہیں:

میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے برتنوں میں مشروب پینے کے متعلق سوال کیا، انھوں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے تارکول والے برتن سے منع کیا اور فرمایا: "ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔"

میں نے کہا: کچ اور شیشے کے برتن کے متعلق کیا خیال ہے؟ تو انھوں نے کہا: ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، میں نے کہا: کچھ لوگ انھیں ناپسند کرتے ہیں، انھوں نے کہا: جو چیز تجھے شک میں ڈالتی ہے، اسے اس وقت تک چھوڑ دو، جب تک کہ شک ختم نہ ہو جائے اور بے شک ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ میں نے کہا: آپ سچ کہتے ہیں کہ نشہ آور چیز حرام ہے، لیکن کھانے کے بعد اگر ایک دو گھونٹ پی لیں تو؟ انھوں نے کہا: جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ پیدا کر دے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے، شراب انگور سے ہوتی ہے، کھجور سے ہوتی ہے، شہد سے ہوتی ہے، گندم سے ہوتی ہے، جو سے ہوتی ہے، مکئی سے ہوتی ہے، ان میں سے جو بھی تم شراب بناؤ گے، یہ وہی شراب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔[2]

جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے، اس حدیث میں انتہائی واضح انداز سے ثابت ہے۔ جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ»[3]

"جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔"

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب التفسير، باب ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ ....﴾، رقم الحديث (4616)

[2] مسند أحمد (112/3) رقم الحديث (7549) وهذا إسناد على شرط مسلم.

[3] أخرجه أبو داود، كتاب الأشربة، باب النهي عن المسكر، رقم الحديث (3681) والترمذي، كتاب الأشربة، باب ما أسكر كثيره فقليله حرام، رقم الحديث (1865) وابن ماجه، كتاب الأشربة، باب ما أسكر كثيره فقليله حرام، رقم الحديث (3393)

«كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَمَا أَسْكَرَ مِنْهُ الْفَرَقُ فَمِلْأُ الْكَفِّ مِنْهُ حَرَامٌ» [1]

''ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس چیز کا بڑا پیالہ نشہ آور ہو تو اس کا ایک چلو بھی حرام ہے۔''

نشہ آور چیز بیماری ہے نہ کہ علاج:

جان لیجیے کہ عقل پہ پردہ ڈالنے والی نشہ آور چیزوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جس میں لذت وسرور ہو۔ یہ وہ ''خمر'' ہے جس کا پینا حرام ہے۔

مسند احمد میں سیدنا طلق الحنفی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! آپ اس مشروب کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کو ہم اپنے علاقے میں پھلوں سے تیار کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نشہ آور چیز کے بارے میں سائل کون ہے؟ اس کو نہ تم نے خود پینا ہے اور نہ ہی اپنے مسلمان بھائی کو پلانا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو شخص بھی اس نشہ آور کو لذت کی خاطر پیتا ہے اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت کی شراب نہیں پلائے گا۔'' [2]

علماء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ نشہ آور چیز خواہ جامد ہو یا مائع ہو، کھانے والی چیز ہو یا پینے والی ہو، چاہے گیہوں سے ہو یا کھجور سے ہو، یا دودھ سے ہو یا کسی اور چیز سے ہو، ہر صورت میں حرام ہے۔ نیز اس میں انھوں نے حشیش کو بھی داخل کیا ہے جسے ایک نشہ آور درخت کے پتوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کو لذت وسرور اور نشے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو حرام ہے۔

سنن ابی داود میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَمُفَتِّرٍ» [3]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشہ آور اور سستی لانے (سن کر دینے) والی اشیاء سے منع فرمایا ہے۔''

دوسری قسم: جو نشے کے ساتھ عقل پہ پردہ ڈال دے، لیکن اس میں لذت وسرور نہ ہو۔ تو اس کے بارے

---

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الأشربة، باب النهي عن المسكر، رقم الحديث (3687) والترمذي، كتاب الأشربة، باب ما أسكر كثيره فقليله حرام، رقم الحديث (1866)

[2] أخرجه أحمد في كتاب الأشربة (11/1) وذكره الهيثمي في مجمع الزوائد (70/5) وعزاه لأحمد والطبراني وقال: ورجاله ثقات.

[3] أخرجه أبو داود، كتاب الأشربة، باب النهي عن المسكر، رقم الحديث (3686)

میں حنابلہ کا کہنا ہے کہ اگر ایسی چیز کوئی شخص علاج کے لیے استعمال کرے اور غالباً اس سے فائدہ بھی ہوتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ ان کے پاؤں میں ایسی بیماری پیدا ہوگئی تھی جو اسے کھائے جا رہی تھی۔ اطباء نے ان کے پاؤں کو کاٹنے کا مشورہ دیا اور کہا: ہم آپ کو ایسی دوائی پلا دیتے ہیں جس سے آپ مکمل طور پر بے ہوش ہو جائیں گے اور پاؤں کو کاٹنے کی تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا: میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص ایسا مشروب پیے جس سے اس کی عقل جاتی رہے یہاں تک کہ وہ اپنے رب کو بھی نہ پہچانے۔ نیز کہا: میں ایسی چیز نہیں پینا چاہتا جو میرے اور میرے رب کے ذکر کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔

نشہ کرنے والے شخص کو سزا کب دی جائے گی؟:

اسلام میں شراب نوشی کی جو سزا (حد) ہے وہ نشہ کرنے والے شخص پر تب نافذ کی جائے گی جب وہ ایسی نشہ آور چیز کا استعمال کرے جس میں نشے کے ساتھ لذت وسرور بھی ہو، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو لوگوں کو اس کی طرف کھینچتی ہے تو سزا اس کے لیے یقیناً ڈراوے کا کام دے گی۔ رہی وہ چیز جس میں نشہ تو ہو لیکن لذت وسرور نہ ہو تو اس میں ''حد'' نہیں، بلکہ تعزیز ہوگی، کیونکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو لوگوں کو اس کی طرف کھینچے اور انھیں ڈراوے کے لیے ان پر ''حد'' کا نفاذ ہو۔ وہ تو مردار اور خنزیر کا گوشت کھانے اور خون پینے کی طرح ہے۔

اکثر علماء جو یہ سمجھتے ہیں کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو تو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اس کی زیادہ مقدار استعمال کرے گا تو اس پر ''حد'' نافذ کی جائے گی، خواہ وہ تاویل کرتے ہوئے اس کے حلال ہونے کا عقیدہ کیوں نہ رکھتا ہو۔ یہ شافعی اور احمد رحمہ اللہ کا موقف ہے، جبکہ ابوثور رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تاویل کرنے والے شخص پر حد نہیں نافذ کی جائے گی۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے بغیر ولی کے نکاح کرنے والی عورت ہو۔

فوائدِ حدیث:

1. ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔
2. یہ حدیث تمام نشہ آور چیزوں کی حرمت کی بنیادی دلیل ہے۔

3. ہر وہ چیز جس سے دشمنی اور بغض پیدا ہو، حرام ہے۔
4. جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔
5. ہر وہ نشہ آور چیز جس میں نشہ ہو، لیکن لذت وسرور نہ ہو اس میں ''حد'' نہیں، بلکہ تعزیر ہے۔

سوالات:

1. جو شخص اِس بنا پر نیند کو خمر پر قیاس کرے کہ دونوں میں عقل غائب ہو جاتی ہے، تو آپ اسے کیا جواب دیں گے؟
2. جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ خمر صرف انگوری شراب کو کہتے ہیں تو اسے آپ کیا جواب دیں گے؟
3. علاج کی خاطر خمر کا کیا حکم ہے؟
4. نشہ آور چیز کی دو قسمیں کون سی ہیں؟
5. خالی جگہ پر کریں:

- تحریم خمر کی علت ....۔
- خمرِ انگور سے ....۔
- حد اس پر نافذ کی جائے گی جس میں .... اور تعزیر اس پر لگائی جائے گی جس میں ....۔



بیماری اور علاج

(45) سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ، وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ، وَثُلُثٌ لِنَفَسِهِ» [1]

''کسی آدمی نے کوئی برتن اپنے پیٹ سے زیادہ برا نہیں بھرا، آدمی کے لیے چند لقمے ہی کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں، اور اگر زیادہ ہی کھانا ضروری ہو تو پیٹ کا ایک تہائی حصہ اپنے کھانے کے لیے، ایک تہائی پانی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے باقی رکھے۔''

راوی حدیث:

ابو کریمہ مقدام بن معدیکرب ابن عمرو بن یزید، مشہور صحابی ہیں، انھوں نے نبی کریم ﷺ سے ۴۷ احادیث روایت کی ہیں۔ ان کی وفات ۸۷ھ میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۱ سال تھی۔

پرہیز علاج سے بہتر ہے:

یہ حدیث طب کے تمام اصولوں پر مشتمل ہے۔ ''ابن ماسویہ'' ایک طبیب تھے۔ انھوں نے ابو خیثمہ کی کتاب میں جب یہ حدیث پڑھی تو کہا: اگر لوگ اِس حدیث پر عمل کر لیں تو وہ تمام امراض سے محفوظ ہو جائیں گے اور ہسپتال اور میڈیکل سٹورز بند ہو جائیں گے۔ انھوں نے یہ بات اس لیے کہی کہ ہر بیماری کی جڑ بھاری کھانا اور موٹاپا ہے۔

حارث بن کلدہ جو عربوں کے ایک مشہور طبیب تھے ان کا کہنا ہے کہ پرہیز علاج کی جڑ ہے اور موٹاپا بیماری کی جڑ ہے۔ اسی طرح بعض اطباء کا کہنا ہے کہ اگر اہلِ قبور سے پوچھا جائے کہ تمھاری موت کی وجہ کیا بنی تو وہ کہیں گے: موٹاپا۔

---

[1] مسند أحمد (132/4) والترمذي، كتاب الزهد، باب ما جاء في كراهية كثرة الأكل، رقم الحديث (2380) وسنن النسائي الكبرىٰ، كتاب آداب الأكل، باب القدر الذي يستحب للإنسان من الأكل، رقم الحديث (6768) وسنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الاقتصاد في الأكل، رقم الحديث (3349)

ان اطباء کی یہ باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خوراک کم ہونی چاہیے اور پیٹ مجرّد رہنا چاہیے، یہ چیز جسمانی صحت میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ اِس کے علاوہ کم خوراک کا دل پر بھی بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ دل میں رقت، نرمی، قوتِ فہم، انکساری جیسی صفات مضبوط ہوتی ہیں اور خواہشاتِ نفس کمزور ہوتی ہیں۔ جبکہ زیادہ خوراک ان خوبیوں کے برعکس اثرات مرتب کرتی ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن آدم! تم اپنے پیٹ کے تین حصے کر لیا کرو: ایک حصہ کھانے، دوسرا پینے اور تیسرا سانس لینے کے لیے خاص کر دو۔ اس سے تمھاری فکری صلاحیتوں کو جلا نصیب ہوگی۔

امام مروزی رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام احمد رحمہ اللہ بھوک اور فقر کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: کیا آدمی کو ترکِ شہوات پر بھی اجر ملے گا؟ تو انھوں نے کہا: کیسے نہیں ملے گا اجر! جبکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: میں نے گزشتہ چار ماہ سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے کتاب الجوع میں اپنی سند کے ساتھ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے تب سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

اسی طرح انھوں نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن واسع سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: جس کی خوراک کم ہوتی ہے، اس کی سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کا دل صاف اور رقیق ہوتا ہے، جب کہ زیادہ خوراک انسان کو بہت کچھ کرنے سے روکتی ہے۔

عمرو بن قیس کہتے ہیں: تم موٹاپے سے بچو، کیونکہ اس سے دل سخت ہوتا ہے۔

سلمہ بن سعید کہتے ہیں: ان کے دور میں ایک بندے کو موٹاپے کی وجہ سے ایسے شرم دلائی جاتی تھی کہ جیسے اس نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِس حدیث میں کم خوراک کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''ابن آدم کے لیے چند لقمے ہی کافی ہیں جن سے وہ اپنی پیٹھ کو سیدھا کر سکے۔''

صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ، وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ» [1]

''مومن ایک آنت میں کھاتا ہے جبکہ کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔''

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معى واحد، رقم الحديث (5393) ومسلم، كتاب الأشربة، باب المؤمن يأكل في معى واحد، رقم الحديث: 184 (2061)

اِس سے مراد یہ ہے کہ مومن شرعی آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے کھانا کھاتا ہے۔ چنانچہ وہ بس ایک آنت ہی کھانے سے بھرتا ہے۔ جبکہ کافر زیادہ کھانے کی شہوت کے ساتھ کھاتا ہے اور اپنی ساتوں آنتوں کو بھر دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کم خوراک کی ترغیب دی اور تھوڑا سا کھا کر بقیہ کھانے کے لیے دوسروں کو ترجیح دینے کو مستحب قرار دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«طَعَامُ الِاثْنَيْنِ كَافِي الثَّلَاثَةِ، وَطَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِي الْأَرْبَعَةِ»[1]

"دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی ہوتا ہے اور تین آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

کم کھانے پینے کی فضیلت:

کھانے پینے کی مقدار کے حوالے سے جو تقسیم نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمائی، وہ سب سے بہتر ہے۔ ایک حصہ کھانے کے لیے، دوسرا پینے کے لیے اور تیسرا سانس لینے کے لیے۔ زیادہ پینے سے نیند بہت زیادہ آتی ہے اور کھانا بھی فاسد ہوتا ہے۔ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ کچھ نوجوان بنو اسرائیل میں عبادت گزار تھے۔ جب عید الفطر آتی تو ان میں سے ایک کھڑا ہو کر کہتا: تم زیادہ نہ کھاؤ کہ تمھیں زیادہ پینا پڑے، پھر زیادہ سونا پڑے، اِس سے تمھارا بہت خسارہ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت بھوکے رہتے تھے اور پسندیدہ کھانے بہت کم کھاتے تھے۔ اگرچہ اس کی وجہ کھانوں کی عدم موجوگی بھی تھی، تاہم اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کے لیے بہترین اور سب سے افضل حالت پسند کرتا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ ﷺ مُنْذُ قَدِمَ الْمَدِينَةَ، مِنْ طَعَامِ الْبُرِّ ثَلَاثَ لَيَالٍ تِبَاعاً، حَتَّى قُبِضَ»[2]

"مدینہ طیبہ آنے کے بعد آلِ محمد ﷺ نے کبھی مسلسل تین دن گندم کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الأطعمة، باب طعام الواحد يكفي الاثنين، رقم الحديث (5392) ومسلم، كتاب الأشربة، باب فضيلة المواساة في الطعام القليل، رقم الحديث: 178 (2058)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الأطعمة، باب ما كان النبي ﷺ وأصحابه يأكلون، رقم الحديث (5416) ومسلم، كتاب الزهد والرقائق، رقم الحديث: 20 (2970)

«مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ ﷺ مِنْ طَعَامٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ حَتَّى قُبِضَ»[1]

''سیدنا محمد ﷺ کے اہل و عیال نے تین دن متواتر کبھی کھانا سیر ہو کر نہیں کھایا حتی کہ آپ کی روح قبض ہو گئی۔''

صحیح مسلم میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَظَلُّ الْيَوْمَ يَلْتَوِي مَا يَجِدُ دَقَلًا يَمْلَأُ بِهِ بَطْنَهُ»[2]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا آپ پورا دن بھوک لوٹتے تھے اور آپ کو سوکھی ہوئی اتنی سخت کھجور بھی میسر نہ ہوتی تھی جس سے اپنا پیٹ بھر لیتے۔''

شہوات کی پیروی کرنے کی مذمت:

اللہ تعالیٰ نے شہوات کی پیروی کرنے والے شخص کی مذمت کی ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾

[مریم: ٥٩۔ ٦٠]

''پھر ان کے بعد ان کی نالائق اولاد ان کی جانشین بنی جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ وہ عنقریب گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ البتہ ان میں سے جس نے توبہ کر لی، ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ بھر بھی حق تلفی نہ ہوگی۔''

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«إِنَّ خَيْرَكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ»، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ۔ قَالَ عِمْرَانُ رضي الله عنه: فَلَا أَدْرِي أَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَعْدَ قَرْنِهِ، مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةً ۔ «ثُمَّ يَكُونُ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُونَ وَلَا يُسْتَشْهَدُونَ، وَيَخُونُونَ وَلَا يُؤْتَمَنُونَ، وَيَنْذِرُونَ وَلَا يُوفُونَ، وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السِّمَنُ»[3]

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الأطعمة، باب قوله تعالىٰ ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾، رقم الحديث (5374)

[2] مسلم، كتاب الزهد والرقائق، رقم الحديث: 36 (2978)

[3] مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم، رقم الحديث: 214 (2535)

''تم میں سب سے اچھے میرے دور کے لوگ ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد ہوں گے۔ پھر وہ جو ان کے بعد ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے۔'' حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے بعد دو بار فرمایا یا تین بار؟ (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) ''پھر ان کے بعد وہ لوگ ہوں گے کہ وہ گواہی دیں گے جبکہ ان سے گواہی مطلوب نہیں ہوگی اور خیانت کریں گے اور ان کو امانت نہیں سونپی جائے گی، وہ نذر مانیں گے، لیکن اپنی نذریں پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا۔''

مسند احمد میں سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اِنَّ مِمَّا أَخْشَى عَلَيْكُمْ شَهَوَاتِ الْغَيِّ فِي بُطُوْنِكُمْ وَفُرُوْجِكُمْ وَمُضِلَّاتِ الْهَوَى»، وَفِي رِوَايَةٍ: «مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ»[1]

''مجھے تمھارے بارے میں سرکشی کی جن شہوتوں کا سب سے زیادہ ڈر ہے، ان کا تعلق تمھارے پیٹوں، شرمگاہوں، گمراہ کرنے والی خواہشوں اور فتنوں سے ہے۔''

فوائدِ حدیث:

1. حدیث میں کم کھانے کی ترغیب ہے، کیونکہ زیادہ کھانا سستی اور صحت کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔
2. کھانے پینے کی لذتوں کو حاصل کرنے میں کوشاں رہنے والا انسان غالباً دین میں کمال حاصل کرنے سے عاجز آ جاتا ہے۔
3. نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ بھوک وغیرہ کو برداشت کرتے تھے اور کم کھانے پینے اور سادہ زندگی کو پسند فرماتے تھے۔
4. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی بلیغ اللسان تھے اور حقیقی معنوں کو مناسب تشبیہ کے ساتھ واضح فرماتے تھے۔
5. مومن صرف اتنا کھانے پر اکتفا کرتا ہے جس سے اس کے جسم کو تقویت ملے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے مددگار ثابت ہو۔

سوالات:

1. نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی ترغیب دی، وہ قسمیں کون سی ہیں؟ اور اس تقسیم میں کیا حکمت ہے؟

---

[1] مسند أحمد (420/4)، رقم الحدیث (20011)

2 حدیث میں مذکور لفظ« أُكُلَاتٌ » کا کیا مفہوم ہے؟

3 کافر مومن سے کئی گنا زیادہ کھاتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

4 زیادہ کھانے پینے کے کیا نقصانات ہیں؟

5 رسول اکرم ﷺ اور سلف صالحین کا کھانے پینے میں کیا طرزِ عمل تھا؟ وضاحت کیجیے۔



نفاق اور اس کی خصلتیں

(46) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً أَوْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْ أَرْبَعَةٍ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ» [1]

''چار باتیں ایسی ہیں کہ وہ جس کے اندر ہوں وہ خالص منافق ہے۔ یا چار خصلتوں میں سے اگر ایک خصلت بھی ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ اس سے باز آ جائے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ جب معاہدہ کرے تو بے وفائی کرے اور جب کسی سے جھگڑا کرے تو بدزبانی کرے۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ» [2]

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔''

راویِ حدیث:

عبداللہ بن عمرو بن العاص بن وائل بن کعب السہمی القرشی، انھوں نے اپنے والد سے پہلے اسلام قبول کیا، موصوف ان صحابہ کرام میں سے تھے جو علماء بھی تھے اور عبادت گزار بھی۔ ان کا نام العاص تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھا، آپ جاہلیت کے دور میں کاتب تھے۔ پھر اسلام قبول

[1] أخرجه البخاري، كتاب المظالم، باب إذا خاصم فجر، رقم الحديث (2459) ومسلم، كتاب الإيمان، باب خصال المنافق، رقم الحديث: 106 (58)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، رقم الحديث (33) ومسلم، كتاب الإيمان، باب خصال المنافق، رقم الحديث: 107 (59)

کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ وہ جو کچھ آپ سے سنیں لکھ لیا کریں، تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی۔ آپ نے جنگِ صفین میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شرکت کی۔ آپ کی وفات ملک شام میں ۶۵ھ میں ہوئی۔ تب ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ انھوں نے ۷۰۰ احادیث روایت کیں۔

نفاق کا مفہوم:

ارجاء کی طرف میلان رکھنے والے بعض لوگوں نے اِس حدیث کو نبی کریم ﷺ کے دور کے منافقوں پر محمول کیا ہے، اس لیے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے بات کرتے ہوئے جھوٹ بولتے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں ایک سری بات کا امین بنایا تو انھوں نے خیانت کی۔ انھوں نے نبی ﷺ سے جنگ کے لیے آپ کے ساتھ نکلنے کا وعدہ کیا تھا، پھر اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی۔

جب کہ معتبر اہلِ علم کا کہنا ہے کہ ''نفاق'' عربی زبان میں دھوکا دہی اور مکر وفریب کو کہتے ہیں۔ نیز خیر کو ظاہر کرنا اور شر کو باطن میں چھپانا نفاق ہے۔ اور شرعی طور پر نفاق کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: نفاقِ اکبر، اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ایمان باللہ، اور ایمان کے دیگر ارکان پر یقین رکھنے کو ظاہر کرے، لیکن باطن میں اس ایمان کے خلاف عقیدہ رکھے۔ یہ وہ نفاق ہے جو نبی کریم ﷺ کے دور میں موجود تھا اور قرآن مجید اسی کی مذمت میں نازل ہوا اور ایسے ہی منافقین کو کافر قرار دیا اور ان کے بارے میں خبر دی کہ یہ لوگ جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

دوسری قسم: نفاقِ اصغر، اس سے مراد عملی نفاق ہے۔ یعنی انسان میں نفاق کی علامات میں سے بعض علامات ہوں، جو کہ اِس حدیث میں ذکر کی گئی ہیں۔

نفاقِ عملی کے اصول:

عملی نفاق کے پانچ اصول ہیں، جو اس حدیث میں مذکور ہیں:

⊙ پہلا اصول:

انسان اس بندے کے سامنے جھوٹ بولے جو اس کی تصدیق کر رہا ہو۔

⊙ دوسرا اصول:

جب وعدہ کرے تو اس کا پاس نہ کرے۔ اِس کی دو قسمیں ہیں:

1. وہ وعدہ کرے اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ وعدہ خلافی کرے گا، تو یہ بدترین وعدہ خلافی ہے۔

2 وہ اس نیت کے ساتھ وعدہ کرے کہ اسے پورا کرے گا، لیکن بعد میں اس کے ذہن میں یہ بات آئے کہ وہ وعدہ خلافی کرے گا، پھر وہ بغیر عذر کے وعدہ خلافی کرے۔ تو یہ بھی یقیناً ناجائز ہے۔

سنن ابی داود میں سیدنا عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا: ادھر آؤ، چیز دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ سے دریافت فرمایا: ''تم اسے کیا دینا چاہتی ہو؟'' انھوں نے بتایا کہ میں اسے کھجور دینا چاہتی ہوں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا:

«أَمَا إِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ»[1]

''اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو تم پر ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔''

امام زہری رحمہ اللہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: جس نے بچے کو کہا کہ آؤ یہ کھجور لے لو، پھر وہ اسے کھجور نہ دے تو اس پر جھوٹ لکھا جائے گا۔

اہلِ علم کے درمیان وعدہ پورا کرنے کے وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کے نزدیک وعدہ پورا کرنا مطلقاً واجب ہے، جبکہ بعض کہتے ہیں کہ واجب تب ہے جب اس شخص پر چٹی پڑنے کا اندیشہ ہو جس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ جمہور اہلِ علم کے نزدیک مطلقاً واجب نہیں ہے۔

⊙ تیسرا اصول:

جھگڑے میں گالی گلوچ اور بدزبانی پر اتر آنا۔ اصل میں لفظ ''فجور'' سے مراد ہے: حق بات سے جان بوجھ کر نکلنا یہاں تک کہ حق باطل اور باطل حق بن جائے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور بدزبانی کرنی پڑتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ»[2]

''جھوٹ سے بچو، بلاشبہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ جہنم میں پہنچانے والا ہے۔''

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم الحديث (4991)

[2] أخرجه أبو داود، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم الحديث (4989) وأصله في البخاري، رقم الحديث (6094) ومسلم: كتاب البر والصلة، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله، رقم الحديث: 103 (2607)

«إِنَّ أَبْغَضَ الرِّجَالِ إِلَى اللّٰهِ الْأَلَدُّ الْخَصِمُ» ①

''اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند وہ شخص ہے جو بہت زیادہ جھگڑالو ہو۔''

نیز سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، وَأَقْضِي لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْ فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ» ②

''میں ایک انسان ہوں اور بعض اوقات جب تم باہمی جھگڑا لاتے ہو تو ممکن ہے کہ تم میں کوئی دوسرا اپنے فریقِ مخالف کے مقابلے میں زیادہ چالاکی سے بولنے والا ہو، اس طرح میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو میں اس سے سنتا ہوں، لہٰذا ایسے حالات میں جس شخص کے لیے بھی اس کے بھائی کے حق میں کسی چیز کا فیصلہ کر دوں تو وہ اسے نہ لے، کیونکہ اس طرح میں اسے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیتا ہوں۔''

جب ایک شخص جھگڑا کرنے میں بہت طاقتور ہو، خواہ اس کا جھگڑا دین کے حوالے سے ہو یا دنیا کے حوالے سے اور وہ اِس طرح جھگڑا کرنے کا ماہر ہو کہ باطل کو سچ پر غالب کر دے، حق بات کو کمزور کر کے اسے باطل کی شکل میں پیش کرے اور سننے والا یہ سمجھنے لگے کہ یہی حق پر ہے تو یہ بدترین محرمات میں سے اور نفاق کی بدترین خصلتوں میں سے ہے۔

سنن ابی داود میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«وَمَنْ خَاصَمَ فِي بَاطِلٍ وَهُوَ يَعْلَمُهُ، لَمْ يَزَلْ فِي سَخَطِ اللّٰهِ حَتَّى يَنْزِعَ عَنْهُ» ③

''اور جس نے جانتے بوجھتے باطل (کی حمایت) میں جھگڑا کیا تو وہ اللہ کی ناراضی میں رہے گا حتی کہ اس سے باز آ جائے۔''

اِس سے اگلی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

---

① أخرجه البخاري، كتاب المظالم، باب قول الله تعالى: ﴿وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ﴾، رقم الحديث (2457) ومسلم، كتاب العلم، باب في الألد الخصم، رقم الحديث: 5 (2668)

② أخرجه البخاري، كتاب الحيل، باب إذا غصب جارية، رقم الحديث (6967) ومسلم، كتاب الأقضية، باب الحكم الظاهر واللحن بالحجة، رقم الحديث: 4 (1713)

③ أخرجه أبو داود، كتاب الأقضية، باب فيمن يعين على خصومة، رقم الحديث (3597)

«وَمَنْ أَعَانَ عَلَى خُصُومَةٍ بِظُلْمٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ» [1]

''جس نے کسی ظلم کے جھگڑے میں معاونت کی تحقیق وہ اللہ عزوجل کی ناراضی کے ساتھ لوٹا۔''

⦿ چوتھا اصول: معاہدے سے غداری کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ [الإسراء: ٣٤]

''تم عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں یقینی طور پر سوال کیا جائے گا۔''

نیز فرمایا:

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ [النحل: ٩١]

''اور اگر تم نے اللہ سے کوئی عہد کیا ہو تو اسے پورا کرو۔ اور اپنی قسموں کو پکا کرنے کے بعد مت توڑو۔ جبکہ تم اپنے (قول وقرار) پر اللہ کو ضامن بنا چکے ہو۔''

صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُعْرَفُ بِهِ» [2]

''ہر غداری کرنے والے کے لیے ایک جھنڈا ہوگا جس کے ذریعے سے وہ پہچانا جائے گا۔''

ہر عہد سے غداری کرنا حرام ہے، خواہ وہ عہد مسلمانوں کے درمیان ہو، یا مسلمان اور کافر کے درمیان ہو۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ قَتَلَ نَفْسًا مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَاماً» [3]

''جس کسی نے ایسے شخص کو مارا جس سے عہد کیا گیا تھا، وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے پائی جاتی ہے۔''

---

[1] أخرجه أبو داود، كتاب الأقضية، باب فيمن يعين على خصومة، رقم الحديث (3598)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الحيل، باب إذا غصب جارية، رقم الحديث (6966) ومسلم، كتاب الجهاد والسير، باب تحريم الغدر، رقم الحديث: 14 (1737، 1735)

[3] البخاري، كتاب الجزية، باب إثم من قتل معاهدا بغير جرم، رقم الحديث (6914)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مشرکین کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے، جب تک کہ وہ اپنے معاہدوں پر قائم رہیں اور ان میں سے کسی معاہدے کو نہ توڑیں، اور جو معاہدے مسلمانوں کے مابین ہوں تو انھیں پورا کرنا اور بھی زیادہ ضروری اور انھیں توڑنا مزید سنگین گناہ ہوگا۔ ان میں سے بڑا معاہدہ وہ ہے جو حکمران اور رعایا کے درمیان اس کی حکمرانی پر بیعت کی شکل میں ہوتا ہے۔

چنانچہ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«ثَلَاثٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: .... وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا لَا يُبَايِعُهُ إِلَّا لِدُنْيَا فَإِنْ أَعْطَاهُ مِنْهَا وَفَى، وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ مِنْهَا لَمْ يَفِ»[1]

''تین (قسم کے لوگ) ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بات نہیں کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ...... اور (تیسرا) وہ آدمی جس نے حکمران کی بیعت کی اور صرف دنیا کے لیے کی (دین کی سربلندی مقصود نہ تھی۔) اگر اس نے اسے اس (دنیا) میں سے کچھ دے دیا تو (اس نے) وفا کی اور اگر نہیں دیا تو وفادار نہ رہا۔''

جن معاہدوں کو پورا کرنا واجب ہے اور ان میں بدعہدی کرنا حرام ہے، ان میں وہ تمام اگریمنٹس داخل ہیں جو مسلمانوں کے درمیان طے پاتے ہیں، بشرطیکہ معاہدے طے کرتے وقت تمام فریق ان پر رضا مندی ظاہر کر دیں، خواہ وہ خرید وفروخت کے متعلق ہوں یا نکاح وغیرہ کے متعلق۔ اسی طرح ان میں وہ معاہدہ بھی شامل ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، خواہ وہ محض اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ہو، مثلاً: بندہ یوں کہے کہ میرے اوپر اللہ کا حق ہے کہ میں اس کی رضا کے لیے اتنا صدقہ کروں گا۔ یا وہ کسی کام کے بدلے میں ہو، مثلاً: بندہ یوں نذر مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں یہ کروں گا۔ یہ اگرچہ مکروہ ہے تاہم اسے بھی پورا کرنا ضروری ہے۔[2]

⦿ پانچواں اصول: امانت میں خیانت کرنا۔

---

[1] البخاري، كتاب المساقاة، باب إثم من منع ابن السبيل، رقم الحديث (2358) ومسلم، كتاب الإيمان، باب تحريم إسبال الإزار والمن بالعطية، رقم الحديث: 173 (108)

[2] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري (578/11)

جب ایک شخص کو امانت سونپی جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اسے واپس لوٹائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾ [النساء: ٥٨]

"(مسلمانو!) اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ جو لوگ امانتوں کے حقدار ہیں انھیں یہ امانتیں ادا کر دو۔"

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ»[1]

"جو تجھے امین بنائے، تو اس کی امانت اسے واپس کر دے اور جو تیری خیانت کرے، تو اس کی خیانت نہ کر۔"

امانت میں خیانت کرنا نفاق کی خصلتوں میں سے ہے۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اللہ کے راستے میں شہادت پانا ہر گناہ کا کفارہ ہے سوائے امانت میں خیانت کے، خیانت کرنے والے بندے کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: امانت واپس کرو۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! میں اب کہاں سے واپس کروں جبکہ دنیا تو ختم ہوگئی! تو کہا جائے گا: اسے جہنم کے نچلے گڑھے میں لے جاؤ۔ چنانچہ اسے جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں لے جایا جائے گا، جہاں وہ اسی امانت کی طرح کی کوئی چیز دیکھے گا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنی گردن پہ رکھ لے گا۔ پھر اوپر کی طرف چڑھنا شروع کرے گا یہاں تک کہ جب وہ سمجھے گا کہ باہر پہنچ گیا ہے، تو وہ چیز اس سے پھسل کر جہنم میں گر جائے گی اور وہ بھی اسی کے پیچھے جہنم میں گر جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا۔"[2]

سلف صالحین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ بعض اوقات خشوع میں بھی نفاق ہوتا ہے۔ وہ اِس طرح کہ جسم میں تو خشوع ہو لیکن دل میں نہ ہو۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

---

[1] أخرجه أبو داود، كتاب البيوع، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده، رقم الحديث (3534) والترمذي، كتاب البيوع، باب في النهي للمسلم أن يدفع إلى الذمي الخمر، رقم الحديث (1264)

[2] ذكره الهيثمي في مجمع الزوائد (292/5) وذكره أبو نعيم في الحلية موقوفا على ابن مسعود (201/4) وصحح إسناده أحمد شاكر في عمدة التفسير (527/1)

«قَالَ أُنَاسٌ لِابْنِ عُمَرَ: إِنَّا نَدْخُلُ عَلَى سُلْطَانِنَا فَنَقُولُ لَهُمْ خِلَافَ مَا نَتَكَلَّمُ إِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ قَالَ: كُنَّا نَعُدُّهَا نِفَاقاً»①

''کچھ لوگوں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: جب ہم اپنے بادشاہ کے پاس جاتے ہیں تو ان کے سامنے ایسی باتیں کہتے ہیں کہ باہر آ کر اس کے خلاف کہتے ہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: ہم اسے نفاق شمار کرتے تھے۔''

بلال بن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''منافق بات اچھی کرتا ہے لیکن عمل برا کرتا ہے۔''

نفاق سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خوف:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے اوپر نفاق کا خوف ہوتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کرتے تھے کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام منافقوں میں تو نہیں لیا تھا؟! ابو رجاء العطاردی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے صحابہ کرام میں کسی کو ایسا پایا جو اپنے اوپر نفاق سے خوف کھاتا ہو؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، میں نے ان میں سے اللہ کے فضل سے بہت اچھے لوگوں کو پایا اور ہاں وہ نفاق سے بہت سخت خوف کھاتے تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ذکر کیا ہے کہ ابن ابی ملیکہ کہتے تھے: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے تیس ایسے صحابہ پائے جن میں سے ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا خوف تھا۔②

جب کہ امام حسن رحمہ اللہ کہتے تھے: نفاق سے ایک سچا مومن ہی خوف کھاتا ہے اور اس سے بے خوف تو صرف منافق ہی ہوتا ہے۔

ایک آدمی نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ نماز میں نفاق سے اللہ کی پناہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے سلام پھیرا تو اس نے کہا: آپ اور نفاق؟! انھوں نے تین بار کہا: اے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔ آزمائش سے کوئی شخص محفوظ نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! ایک آدمی ایک ہی گھڑی میں فتنے کا شکار ہو کر اپنے دین سے پلٹ سکتا ہے۔ اِس حوالے سے سلف کے آثار بہت زیادہ ہیں۔

عملی نفاق کی سب سے بری خصلت:

عملی نفاق کی سب سے بری خصلتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک انسان کوئی عمل کرے اور وہ ظاہر

① أخرجه البخاري، كتاب الأحكام، باب ما يكره من ثناء السلطان وإذا خرج قال غير ذلك، رقم الحديث (7178)

② رواه البخاري معلقًا، كتاب الإيمان، باب خوف المؤمن من أين يحبط عمله وهو لا يشعر.

یہ کرے کہ اس کا مقصد نیک ہے، حالانکہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعے کسی برے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہو اور دھوکا دہی کے ساتھ وہ اپنے مذموم ارادے کی تکمیل چاہتا ہو۔ پھر اپنے اِس مکروفریب پر خوش بھی ہوتا ہو اور لوگوں سے تعریف سننے کا خواہشمند بھی ہوتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز قرآن مجید میں منافقوں اور یہودیوں کے بارے میں ذکر کی ہے۔

منافقوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾

[التوبۃ: ۱۰۷]

''نیز کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس لیے کہ وہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں، کفر پھیلائیں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور یہ مسجد ایسے لوگوں کو کمین گاہ کا کام دے جو اس سے پیشتر اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اور وہ قسمیں یہ کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کچھ نہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً یہ جھوٹے لوگ ہیں۔''

اور یہود کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۱۸۸]

''جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ ان کی ایسے کاموں پر تعریف کی جائے جو انھوں نے کیے بھی نہیں، ان کے متعلق یہ گمان نہ کیجیے کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے، ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے۔''

یہود کے بارے میں یہ آیت تب نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے ان سے ایک چیز کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے اس کا درست جواب چھپایا اور غلط جواب دیا۔ پھر وہ نبی ﷺ کے ہاں سے نکلے تو بہت خوش تھے کہ انھوں نے آپ ﷺ کو ان کے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا اور اسے چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہے۔[1]

[1] أخرجه البخاري، كتاب التفسير، باب قوله تعالى: ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا ﴾، رقم الحديث (4568) ومسلم، كتاب صفة المنافقين وأحكامهم، باب منه، رقم الحديث: 8 (2778)

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ بات پختہ ہوگئی کہ نفاق ظاہر و باطن کے اختلاف کا نام ہے تو ان میں سے بعض کو یہ خوف محسوس ہوا کہ کہیں وہ منافق نہ ہو چکا ہو، کیونکہ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتے تھے تو دل میں رقت پیدا ہو جاتی تھی اور ایمان میں اضافہ ہو جاتا تھا، لیکن جب دنیاوی امور اور اہل وعیال اور مال ومنال میں مشغول ہوتے تو دل کی حالت تبدیل ہو جاتی اور پہلے والا خشوع وخضوع نہ رہتا۔ انھیں نفاق کا خوف محسوس ہونے لگا۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت حنظلہ (بن ربیع) اسیدی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھ سے ملے اور دریافت کیا: حنظلہ! آپ کیسے ہیں؟ میں نے کہا: حنظلہ منافق ہو گیا ہے! (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے) کہا: سبحان اللہ! تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں حتی کہ ایسا لگتا ہے گویا ہم (انھیں) آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سے نکلتے ہیں تو بیویوں، بچوں اور کھیتی باڑی (اور دوسرے کام کاج) کو سنبھالنے میں لگ جاتے ہیں اور بہت سی چیزیں بھول بھلا جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! یہی کچھ ہمیں بھی پیش آتا ہے۔ پھر میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چل پڑے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ کیا معاملہ ہے؟'' میں نے عرض کی: اللہ کے رسول! ہم آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں، تو حالت یہ ہوتی ہے گویا ہم (جنت اور دوزخ کو) اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب ہم آپ کے ہاں سے باہر نکلتے ہیں تو بیویوں، بچوں اور کام کاج کی دیکھ بھال میں لگ جاتے ہیں ...... ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار ارشاد فرمایا:

«وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ إِنْ لَّوْ تَدُوْمُوْنَ عَلَى مَا تَكُوْنُوْنَ عِنْدِيْ وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَفِيْ طُرُقِكُمْ وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»[1]

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ہمیشہ اسی کیفیت میں رہو جس طرح میرے پاس ہوتے ہو اور ذکر میں لگے رہو تو تمھارے بچھونوں پر اور تمھارے راستوں

[1] مسلم، کتاب التوبۃ، باب فضل دوام الذکر والفکر في أمور الآخرۃ، رقم الحدیث: 12 (2750)

میں فرشتے (آ کر) تمھارے ساتھ مصافحے کریں، لیکن اے حنظلہ! کوئی گھڑی کسی طرح ہوتی ہے اور کوئی گھڑی کسی (اور) طرح۔"

فوائدِ حدیث:

1. "نفاق" ظاہر وباطن کے اختلاف کا نام ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں: نفاقِ اصغر اور نفاقِ اکبر۔
2. حدیث میں نفاق کی خصلتوں اور منافقوں کی صفات کا ذکر ہے۔
3. جس شخص میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں بعض صفات پائی جاتی ہوں وہ انھی کے بقدر نفاق کے درجے پر ہے۔
4. نفاق کی جو صفات ذکر کی گئی ہیں، یہ ساری کی ساری نہیں ہیں بلکہ اہم ترین صفات ہیں۔
5. اچھے اخلاق کا ایمان سے مضبوط رشتہ ہے۔
6. نفاق کے فرد اور معاشرے پر بہت ہی نقصان دہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سوالات:

1. درج ذیل کلمات کے معانی ذکر کریں: "مُنَافِقاً خَالِصًا" "إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ" "إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ"
2. نفاق کی حقیقت کیا ہے؟
3. بعض علماء کے نزدیک اس حدیث میں اشکال پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نفاق کی یہ صفات بعض اوقات سچے مسلمان میں بھی پائی جاتی ہیں .... تو اس پر آپ کا کیا جواب ہوگا؟
4. امانت ایک وسیع باب ہے اور اس میں تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد شامل ہیں جن کا بندے کو امین بنایا گیا ہے۔ اِس کی وضاحت کریں اور مثالیں بھی پیش کریں۔
5. وعدہ خلافی کرنا، اِس کی دو قسمیں کون سی ہیں؟ اور ہر ایک کا کیا حکم ہے؟
6. بدعہدی اور غداری کے متعلق بعض نصوص ذکر کریں۔
7. "حنظلہ منافق ہوگیا" یہ کس کا مقولہ ہے؟ اور کہنے والے نے کسے کہا تھا؟ اور نبی کریم ﷺ نے یہ سنا تو آپ کا جواب کیا تھا؟



توکل اور تواکل

47 سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

«لَوْ أَنَّكُمْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصاً وَتَرُوْحُ بِطَاناً»[1]

''اگر تم لوگ اللہ پر اس طرح بھروسا کرو جیسے اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو وہ تمھیں اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح (گھونسلوں سے) بھوکے روانہ ہوتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں۔''

یہ حدیث توکل کی بنیادی دلیل ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توکل ان بڑے اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کے لیے رزق کھینچ لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾

[الطلاق: ۲۔ ۳]

''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کی کوئی راہ پیدا کر دے گا۔ اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں اسے وہم و گمان بھی نہ ہو۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے پاس پڑھی اور فرمایا:

«لَوْ أَنَّ النَّاسَ كُلَّهُمْ أَخَذُوْا بِهَا لَكَفَتْهُمْ»[2]

''اگر سارے کے سارے لوگ اِس آیت پر عمل کریں تو انھیں کافی ہو جائے گی۔''

---

[1] مسند أحمد (52/1) والترمذي، كتاب الزهد، باب في التوكل على الله، رقم الحديث (2344) وابن ماجه، كتاب الزهد، باب التوكل واليقين، رقم الحديث (4164) وابن حبان، رقم الحديث (730) والحاكم (318/4)

[2] مسند أحمد (187/5)

یعنی اگر وہ تقویٰ اور توکل دونوں پر کما حقہ عمل کریں تو اس سے ان کی دینی اور دنیاوی مصلحتیں پوری ہو جائیں گی۔ اِس سے پہلے اس قسم کی بحث حدیث نمبر:۱۹ میں گزر چکی ہے۔

سلف صالحین میں سے کسی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بہترین وسیلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھ لے کہ آپ کے دل میں اس پر کتنا توکل ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیا تو اللہ تعالیٰ ان کی تمام پریشانیوں میں انھیں کافی ہوگیا۔ پھر انھوں نے مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کی۔

توکل کی حقیقت:

دنیا وآخرت کی تمام مصلحتوں کے حصول اور تمام نقصان دہ چیزوں سے بچنے کے لیے صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ پر اعتماد وبھروسا کرنا اور تمام امور کو اس کے سپرد کرنا۔ اِس بات پر پختہ یقین رکھنا کہ اللہ ہی دیتا ہے، اللہ ہی بچاتا ہے، اللہ ہی نفع پہنچاتا ہے اور اللہ ہی نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: توکل پورا ایمان ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: بندے کا اپنے رب پر توکل کرنا یہ ہے کہ اسے اِس بات پر مکمل یقین ہو کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

توکل اور اسباب:

توکل ان اسباب کو اختیار کرنے کے منافی نہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے اور مخلوقات میں یہی اللہ تعالیٰ کا طریقِ کار ہے۔ چنانچہ جہاں اس نے توکل کرنے کا حکم دیا ہے وہاں اس نے اسباب کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ لہٰذا جسمانی اعضاء کے ذریعے اسباب کو اختیار کرنا چاہیے اور دل میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ ﴾ [النساء:۷۱]

''اے ایمان والو! اپنے بچاؤ کا سامان ہر وقت اپنے پاس رکھو۔''

اسی طرح اس کا فرمان ہے:

﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ ﴾ [الأنفال: ٦٠]

''اور جہاں تک ممکن ہو کافروں کے مقابلہ کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ ﴾[الجمعة: ١٠]

''پھر جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔''

سہل التستری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''جس نے جدو جہد اور کوشش کرنے میں طعن اندازی کی اس نے سنتِ رسول میں طعن اندازی کی اور جس نے توکل میں طعن اندازی کی اس نے ایمان میں طعن اندازی کی۔ توکل کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے اور جدو جہد کرنا بھی۔ لہٰذا ہر حال میں نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل کرنا چاہیے۔

بندے کے اعمال کی قسمیں:

بندہ جو اعمال کرتا ہے اس کی تین اقسام ہیں:

پہلی قسم: وہ اعمال جن کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے بندے کو حکم دیا ہے اور انھیں جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان اعمال کو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس سے مدد طلب کرتے ہوئے بجا لانا ضروری ہے، کیونکہ وہ اس کی توفیق وقوت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ جو شخص ان واجبات میں کمی کوتاہی کرے گا وہ دنیا وآخرت میں سزا کا مستحق ہوگا۔

یوسف بن اسباط رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''کہا جاتا تھا کہ اس آدمی کی طرح عمل کرو جس کو یہ پتا ہو کہ اس کے عمل کے سوا اسے کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی۔ اور اس آدمی کے توکل کی طرح توکل کرو جسے یقین ہو کہ جو اللہ نے لکھا ہے بس وہی ملنا ہے۔''

دوسری قسم: وہ امور جنھیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بطور عادات جاری کر دیا ہے اور اپنے بندوں کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً: بھوک کے وقت کھانا، پیاس کے وقت پینا، دھوپ میں سایہ حاصل کرنا اور سردی سے بچاؤ کے لیے گرمائش لینا وغیرہ۔ ان تمام امور میں بندے پر واجب ہے کہ وہ اسباب اختیار کرے۔ جو شخص قدرت کے باوجود ان میں کمی کوتاہی کرے گا یہاں تک کہ نقصان پہنچنے لگے تو وہ یقیناً سزا کا مستحق ہوگا۔ تاہم بعض اوقات اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بعض بندوں کو اتنی طاقت وقوت دے دیتا ہے جو کسی اور کو نہیں دیتا۔ اگر وہ اسی طاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان میں سے بعض امور کو ترک کر دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بغیر افطار کیے مسلسل روزہ کی حالت میں رہتے تھے اور آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اِس سے منع کرتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے:

«لَسْتُ كَهَيْئَتِكُمْ إِنِّي أَظَلُّ أُطْعَمُ وَأُسْقَى» [1]

''میں تمھاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے تو برابر کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«إِنِّي لَسْتُ كَهَيْئَتِكُمْ إِنِّي يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِ» [2]

''میں تمھاری مثل نہیں ہوں، مجھے میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے۔''

بظاہر یوں لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو روحانی غذا اور طاقت دیتا تھا جس سے آپ کے دل پر فتوحاتِ قدسیہ، انعاماتِ الٰہیہ اور معارف ربانیہ کا نزول ہوتا تھا اور یہ چیزیں ایک زمانے تک کھانے پینے سے کفایت کر جاتی تھیں۔ اسی طرح بعض سلف صالحین کو بھی اللہ تعالیٰ کھانا پینا ترک کرنے کی قوت دیتا تھا جو عموماً کسی اور کو نہیں ملتی اور انھیں اس سے کوئی ضرر بھی نہیں پہنچتا تھا۔ چنانچہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما آٹھ آٹھ دن بغیر افطار کے روزہ کی حالت میں رہتے تھے۔ اسی طرح ابو الجوزاء رحمہ اللہ بھی سات سات دن افطاری کیے بغیر روزہ کی حالت میں رہتے تھے۔ پھر جب افطاری کر لیتے تو کسی نوجوان کے بازو کو اتنی قوت سے پکڑتے تھے کہ لگتا تھا اسے توڑ ڈالیں گے۔ ان میں سے بعض سردی گرمی کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سردیوں میں گرمی کا اور گرمیوں میں سردی کا لباس پہنتے تھے۔ لہٰذا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس جیسے کاموں کی اتنی قوت دی ہو کہ وہ یہ کام کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبردی سے کمزور نہیں ہوا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جس شخص نے ان کاموں میں سے بعض کا تکلف کیا یہاں تک کہ ان کاموں نے اسے بعض واجبات سے کمزور کر ڈالا تو اسے اِس سے منع کیا جائے گا۔ اسی لیے سلف صالحین عبدالرحمٰن بن ابی نعم کو تب روکتے تھے جب وہ کئی کئی دن کھانا چھوڑ دیتے تھے اور اتنے کمزور پڑ جاتے تھے کہ ان کی تیمار داری کی جاتی تھی۔

تیسری قسم: وہ امور جنھیں اللہ تعالیٰ نے عام طور پر، غالب حالات میں بطور عادت جاری کر دیا ہے، تاہم کبھی

[1] أخرجه البخاري، كتاب الصوم، باب بركة السحور من غير إيجاب، رقم الحديث (1922) ومسلم، كتاب الصيام، باب النهي عن الوصال في الصوم، رقم الحديث: 55 (1102)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الصوم، باب الوصال، رقم الحديث (1964)

کبھار اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے عادت کے برخلاف بھی کر دیتا ہے۔
ان امور میں سے کئی امور ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ بہت سارے لوگوں کو بے نیاز کر دیتا ہے۔
مثلاً: بیماری کا علاج ہے، غالب حالات میں یہی ہے کہ مریض اپنی بیماریوں کے لیے علاج کرائیں تو ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بہت سارے بندوں کو اس علاج سے مستغنی کر دیتا ہے اور بغیر علاج ہی کے انھیں شفایاب کر دیتا ہے، جیسا کہ اکثر بستیوں اور دیہاتوں میں ہوتا ہے۔

علاج کا حکم:

اِس بارے میں علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ جس شخص کو کوئی بیماری لگ جائے تو اس کے لیے افضل کیا ہے؟ علاج کرانا یا اللہ پر توکل کرتے ہوئے اسے چھوڑ دینا؟ اِس میں دو مشہور قول ہیں۔
بظاہر امام احمد رحمہ اللہ کا میلان اِس بات کی طرف ہے کہ جو شخص علاج کے بغیر توکل کرنے پر قادر ہو تو وہ توکل ہی کرے۔ جیسا کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے:

«وَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ أَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ»
''میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔''
پھر آپ ﷺ نے ان کی یہ صفات ذکر فرمائیں:
«هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ، وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ، وَلَا يَكْتَوُوْنَ، وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ»[1]
''یہ وہ لوگ ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کراتے، فال نہیں نکالتے (بدشگونی نہیں لیتے) اور داغ کر علاج نہیں کراتے بلکہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔''

علماء میں سے جس نے علاج کو افضل قرار دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہی نبی ﷺ کا حال تھا کہ آپ ﷺ ہمیشہ علاج کرتے کراتے تھے اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ افضل عمل ہی کرتے تھے۔ جہاں تک مذکورہ بالا حدیث کا تعلق ہے تو اسے ان علماء نے اس پر محمول کیا ہے کہ وہ غیر شرعی جھاڑ پھونک نہیں کراتے جن میں شرک کا اندیشہ ہوتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اسے بدشگونی اور داغ لگا کر علاج کے ساتھ ذکر کیا ہے، جب کہ یہ دونوں مکروہ ہیں۔
ان امور میں سے کئی امور ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ بہت کم لوگوں کے لیے خلافِ عادت کرتا ہے۔ مثلاً: رزق کا معاملہ ہے جس میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو جتنی محنت کرتا ہے اسے اتنا رزق ملتا ہے،

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب الطب، باب من اكتوى أو كوى غيره ....، رقم الحديث (5705)

لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ رزق کے لیے جدوجہد نہ کرنے والوں کو بھی کھلا رزق عطا کر دیتا ہے، لہٰذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ پختہ یقین اور سچا توکل دے دے اور اسے یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ خلاف عادت اور عام روٹین سے ہٹ کر بھی رزق دینے پہ قادر ہے، وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے تو اس کے لیے اسباب کو ترک کرنا جائز ہے، اس پر انکار نہیں کیا جائے گا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث اِس وقت ہمارے زیر بحث ہے وہ بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے۔ نیز یہ حدیث اِس بات کی دلیل بھی ہے کہ اگر لوگ اللہ پر کما حقہ توکل نہ کریں، اپنے دلوں میں ظاہری اسباب پر زیادہ بھروسا کریں اور دن رات خوب محنت ومزدوری کریں تو تب بھی انھیں رزق وہی ملنا ہے جو ان کے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ اگر وہ اللہ پر کما حقہ توکل کریں اور دلوں میں اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا کریں تو اللہ تعالیٰ ایک چھوٹے سے سبب کو اختیار کرنے پر بھی انھیں خوب رزق دے گا، جیسا کہ پرندوں کو رزق عطا کرتا ہے، حالانکہ وہ صرف اتنا سا سبب اختیار کرتے ہیں کہ صبح سویرے اپنے گھونسلوں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، نکل کھڑے ہونا ایک معمولی سبب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ انھیں بھی اتنا رزق دیتا ہے کہ وہ شام تک پیٹ بھر کر واپس لوٹتے ہیں۔

بعض اوقات انسان کسی گناہ کی وجہ سے اپنے رزق سے یا اس کے کچھ حصے سے محروم کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ، وَلَا يَرُدُّ الْقَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ»[1]

”صرف نیکی عمر میں اضافہ کرتی ہے، اور صرف دعا ہی تقدیر کو پلٹتی ہے، اور انسان (بعض اوقات) ایک گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔“

نیز حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ، فَإِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتّٰى تَسْتَوْفِيَ رِزْقَهَا وَإِنْ أَبْطَأَ عَنْهَا، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ، خُذُوا مَا حَلَّ، وَدَعُوا مَا حَرُمَ»[2]

”اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور اچھے طریقے سے (اعتدال کے ساتھ) روزی طلب کرو، کیونکہ کوئی

---

[1] مسند أحمد: (208/5) وابن ماجه، كتاب الفتن، باب العقوبات، رقم الحديث (4022)

[2] سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في المعيشة، رقم الحديث (2144)

انسان اپنا رزق پورا کیے بغیر نہیں مرے گا اگرچہ اس (رزق کے حصول) میں دیر ہو جائے۔ چنانچہ اللہ سے ڈرو اور اچھے طریقے سے روزی طلب کرو۔ جو حلال ہے، وہ لے لو اور جو حرام ہے، وہ چھوڑ دو۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''بندے اور اس کے رزق کے درمیان ایک پردہ حائل ہے، چنانچہ اگر وہ قناعت کر لے اور اس کا نفس راضی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے خوب رزق دیتا ہے، لیکن اگر وہ گناہوں میں کود کر اس پردے کو چاک کر ڈالے تو اللہ تعالیٰ اس کے مقرر شدہ رزق میں اضافہ نہیں کرتا۔''

سلف صالحین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ تم اللہ پر کما حقہ توکل کرو، ارزاق تمھاری طرف بغیر تھکاوٹ اور بغیر تکلف کے کھیچے چلے آئیں گے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ایک عابد کسی غار میں عبادت کرتا تھا، ایک کوا روزانہ اس کے پاس ایک روٹی لایا کرتا تھا جس میں ہر خوراک کا ذائقہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ فوت ہو گیا۔

اس کی دلیل ابراہیم خلیل علیہ السلام کا واقعہ ہے، جب انھوں نے ''ہاجرہ'' اور ان کے بیٹے ''اسماعیل'' کو ایک بے آباد وادی میں چھوڑ دیا تھا، ان کے پاس صرف ایک تھیلا جس میں کھجور تھی اور ایک مشکیزہ جس میں پانی تھا۔ جب انھیں چھوڑ کر واپس پلٹے تو ''ہاجرہ'' نے ان سے کہا: ہمیں کس کے سپرد کر کے جا رہے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: اللہ کے سپرد۔ وہ کہنے لگیں: میں اللہ پر راضی ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی وحی کے مطابق ایسا کر رہے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بعض اولیاء کے دلوں میں بھی حق بات کا الہام کر دیتا ہے جس سے ان کے یقین اور توکل میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

سچا توکل:

امام مروزی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ابو عبد اللہ (امام احمد رحمہ اللہ) سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ پر سچا توکل کیسے ہوتا ہے؟ تو انھوں نے کہا: وہ اِس طرح توکل کرے کہ اس کے دل میں آدمیوں میں سے کسی کے بارے میں یہ خیال تک نہ ہو کہ وہ اس کے لیے کوئی چیز لے آئے گا۔ جب وہ ایسے کرے گا تو وہ واقعتاً اللہ پر متوکل ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے رزق دے گا۔

وہ کہتے ہیں: ابو عبد اللہ (امام احمد رحمہ اللہ) سے یہ بھی کہا گیا کہ اگر ایک آدمی گھر میں بیٹھ جائے اور کہے: میں گھر میں بیٹھتا ہوں اور صبر کرتا ہوں، میں کسی کو اس بارے میں نہیں بتاتا، جبکہ وہ گھر سے باہر جا کر کام کاج کر کے بھی کما سکتا ہو؟ تو انھوں نے کہا: اگر وہ گھر سے باہر نکل کر کام کاج کر کے کمائے تو یہ مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اور اگر وہ بیٹھا رہے تو مجھے خوف ہے کہ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑے اور وہ کسی سے امید لگا لے کہ وہ اس کی طرف وہ چیز بھیج دے گا۔

لہٰذا جب ایک آدمی کمزور ہو اور اسے خدشہ ہو کہ وہ صبر نہیں کر پائے گا، یا سوال کرنا شروع کر دے گا، یا (اللہ کی تقدیر کے متعلق) شک اور ناراضی میں واقع ہو جائے گا تو اس کے لیے اسباب کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر وہ ترک کرے گا تو اس پر انکار کیا جائے گا، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے اس شخص پر انکار کیا جو کسبِ معاش کے ذرائع کو چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا اور اپنے ساتھ زادِ راہ بھی نہیں لیا۔ اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ وہ سوال کرنے پہ مجبور ہو جائے گا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:

''اہلِ یمن حج کے لیے بغیر زادِ راہ کے آتے تھے اور کہتے تھے: ہم اللہ پر توکل کرنے والے ہیں، پھر وہ مکہ پہنچ کر لوگوں سے مانگنا شروع کر دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی:

﴿ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ﴾ [البقرۃ: ۱۹۷]

''اور تم زادِ راہ لے لیا کرو، یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔''

یہی بات مجاہد، عکرمہ، نخعی رحمہم اللہ اور دیگر کئی سلف صالحین نے کہی ہے۔ لہٰذا ترکِ اسباب کی اجازت نہیں دی جائے گی، سوائے اس شخص کے جس کے دل میں مخلوقات سے مکمل بے نیازی ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ سے جب توکل کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: مخلوقات سے مکمل طور پر بے نیاز ہونا اور ان سے مایوس ہونا توکل ہے۔

کمانا افضل ہے:

بظاہر امام احمد رحمہ اللہ اِس بات کے قائل ہیں کہ ہر حال میں کسبِ معاش کا سبب اختیار کرنا افضل ہے۔ ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ جو شخص گھر میں بیٹھ جائے اور کسبِ معاش کا کوئی سبب اختیار نہ کرے اور وہ کہے کہ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں تو انھوں نے کہا: لوگوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے، لیکن انھیں اپنے آپ کو کمانے اور محنت و مزدوری کا عادی بھی بنانا چاہیے۔

امام خلال رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے کہا گیا: اگر ایک آدمی گھر میں بیٹھ جائے، یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ اسے اللہ پر توکل ہے، لہٰذا اللہ ہی اسے رزق دے گا، تو انھوں نے کہا: اللہ پہ توکل کرنا تو ٹھیک ہے، لیکن اسباب کو چھوڑ کر گھر میں بیٹھ جانا درست نہیں ہے۔ یہ نہ انبیاء علیہم السلام نے کیا اور نہ کسی اور نے۔ انبیاء علیہم السلام محنت مزدوری کرتے تھے۔ خود امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی کرتے تھے، آپ کے بعد سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ ہم گھر میں بیٹھتے ہیں، رزق اللہ نے ہی دینا ہے۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة: ١٠]

''پھر جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔''

اِس میں اِس بات کی دلیل ہے کہ توکل اسباب اختیار کرنے کے منافی نہیں ہے، بلکہ دونوں کو جمع کرنا افضل ہے۔ بہرحال جو شخص بلند و بالا مقامات تک نہ پہنچ سکے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اسبابِ معاش اختیار کرے، خاص طور پر اگر اس کے بچے بھی ہوں جو عموماً صبر نہیں کر سکتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«كَفٰى بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يُضَيِّعَ مَنْ يَقُوْتُ»[1]

''انسان کے گناہ گار ہونے کے لیے یہ (عمل) کافی ہے کہ جن کے رزق و اخراجات کا یہ ذمہ دار ہو، انھیں ضائع کر دے۔''

حقیقی توکل:

معاویہ بن قرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اہلِ یمن میں سے کچھ لوگ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملے، تو انھوں نے ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ انھوں نے کہا: ہم توکل کرنے والے ہیں۔ انھوں نے کہا: نہیں، تم تو بس کھانے والے ہو، حقیقت میں توکل کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو زمین میں دانا بوتے ہیں، پھر اللہ پہ توکل کرتے ہیں۔''

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کما حقہ توکل کرنے والا شخص وہ ہوتا ہے جو توکل کر کے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس رزق کے حصول کا ذریعہ نہیں بناتا جو اسے کفایت کر جائے، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح ہوگیا جو رزق کے حصول کے لیے تمام اسباب و وسائل اختیار کرتا ہے۔ یہ توکل

---

[1] مسند أحمد (160,194,195/2) وأبو داود، كتاب الزكاة، باب فى صلة الرحم، رقم الحديث (1692)

میں ایک قسم کا نقص ہے۔ ہاں حقیقت میں توکل کرنے والا شخص وہ ہے جسے اِس بات پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے رزق اور اس کے کفایت کر جانے کی ضمانت دی ہے، چنانچہ وہ اس ضمانت کی تصدیق کرے اور اپنے دل سے اس پر پختہ اعتماد کرے اور توکل کو رزق کے حصول کے اسباب میں سے ایک سبب نہ بنائے۔

جہاں تک رزق کا تعلق ہے تو اس کی تقسیم ہر ایک کے لیے کر دی گئی ہے، خواہ کوئی نیک ہو یا برا، مومن ہو یا کافر۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦]

''اور زمین پر چلنے والی ہر مخلوق کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔''

جب کہ زمین پر چلنے والی بہت ساری مخلوقات کمزور اور رزق کے لیے تگ و دو کرنے سے عاجز ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَكَأَيِّنْ مِنْ دَآبَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ﴾ [العنكبوت: ٦٠]

''اور کتنے ہی ایسے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ انھیں رزق دیتا ہے اور تم کو بھی وہی دیتا ہے۔''

لہٰذا جب تک بندہ زندہ ہے تب تک اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس کے لیے رزق کو کمائی کے ذریعے اور بعض اوقات کمائی کے بغیر آسان کر دیتا ہے۔ لہٰذا جس شخص نے طلبِ رزق کے لیے اللہ پہ توکل کیا اس نے توکل کو سبب اور کمائی کا ذریعہ بنایا اور جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کی گارنٹی پر اعتماد کیا اس نے اس پر توکل کیا، اس پر اعتماد کرتے ہوئے اور اس کے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے۔ مثنی الانباری (جو امام احمد رحمہ اللہ کے معتمد شاگردوں میں سے ایک تھے) نے کیا خوب کہا: جس چیز کی گارنٹی دے دی گئی ہے تمھیں اس کے لیے اِس طرح فکرمند نہیں ہونا چاہیے کہ تم گارنٹی دینے والے پر ہی شک کرنے لگو اور اس کے رزق پر راضی نہ رہو۔

توکل کا ثمرہ:

توکل کا ثمرہ ہے اللہ کی قضا و قدر پہ راضی ہو جانا، لہٰذا جو شخص اپنے تمام امور کو اللہ کے سپرد کر دے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جو فیصلہ کرے اور جو مقدر کرے وہ اس پر راضی ہو جائے تو اس نے حقیقتاً اللہ پہ توکل کیا۔ اسی لیے حسن اور فضیل رحمہما اللہ توکل کی تفسیر رضامندی سے کرتے تھے۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''مجھے بعض حکماء سے یہ بات پہنچی ہے کہ توکل کے تین درجات ہیں:

(۱) شکایت نہ کرنا (۲) راضی ہونا (۳) محبت کرنا

''شکایت نہ کرنا'' صبر کا درجہ ہے اور ''راضی ہونا'' اللہ کی تقسیم پر دل کا مطمئن ہونا ہے اور ''محبت'' سے مراد ہے اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں جو کچھ کرے وہ اس سے محبت کرے۔ پہلا درجہ زاہدوں کا، دوسرا سچے مومنوں کا اور تیسرا رسولوں کا ہے۔ لہٰذا اللہ پہ توکل کرنے والا اگر اس چیز پہ صبر کرے جسے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مقدر کرے، خواہ رزق ہو یا کچھ اور، تو وہ صابر ہے۔ اور اگر وہ اس کی تقدیر پہ رضا مندی کا اظہار کرے تو وہ راضی رہنے والا ہے۔ اور اگر اس کی اپنی کوئی پسند نہ ہو سوائے اس چیز کے جو اللہ تعالیٰ اس کے لیے مقدر کرے، اور وہی اس کی رضا ہو تو یہ اس سے محبت کرنے والوں کا درجہ ہے جنھیں اس کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: ہر صبح کو میری خوشی صرف اسی چیز میں ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ میرے لیے مقدر کر دے۔

فوائدِ حدیث:

1. حدیث میں اللہ تعالیٰ پر سچا توکل کرنے اور تمام معاملات میں اس پر یقین کرنے کی ترغیب ہے۔
2. ''توکل'' سے مراد یہ ہے کہ دل میں اطمینان ہو، اللہ تعالیٰ سے خیر کی امید ہو اور پختہ یقین ہو کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے گا وہی ہوگا اور جو نہیں چاہے وہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسباب بھی اختیار کرے۔
3. طلبِ رزق کے لیے اسباب اختیار کرنا اور تگ ودو کرنا اللہ تعالیٰ پر سچے توکل کا حصہ ہے۔
4. رسول اکرم ﷺ اور سلف صالحین رحمہم اللہ نہ اسباب کا انکار کرتے تھے اور نہ ہی اسباب پر بھروسا کرتے تھے، بلکہ اسباب اختیار کرتے ہوئے بھروسا صرف اللہ پہ کرتے تھے۔
5. توکل کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ دل کا تعلق اکیلے اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہوتا ہے۔

سوالات:

1. یہ حدیث کس بات کی طرف دعوت دیتی ہے؟
2. «تَغْدُوْ خِمَاصاً وَتَرُوْحُ بِطَاناً» کا کیا معنی ہے؟ اور اس تعبیر سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟
3. حدیث کی روشنی میں توکل کی حقیقت کیا ہے؟

4. رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ پر کما حقہ توکل کی بہترین عملی مثالیں پیش فرمائیں۔ ان میں سے کوئی ایک ذکر کریں۔

5. اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ اور اس کے فرمان: ﴿فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ میں تطبیق کیسے ہوگی؟

6. عقیدۂ توکل کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟



ذکر عبادت کا مغز ہے

48 سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دو بدو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، .... دوسرے بدو نے کہا: اسلام کے تقاضے تو بہت زیادہ ہیں، اگر کوئی ایک جامع سا عمل ہو جائے اور ہم پابندی سے اس پر عمل کریں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْباً مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ»[1]

''تیری زبان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔''

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کا ذکر بہت زیادہ کیا کریں اور ذکر کرنے والوں کی مدح کی ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾

[الأحزاب: ٤١۔ ٤٢]

''اے ایمان والو! تم اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کیا کرو۔''

نیز فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [الجمعة: ١٠]

''اور تم اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو، تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾

[الأحزاب: ٣٥]

''اور بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کیا ہے۔''

اسی طرح اس کا فرمان ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ [آل عمران: ١٩١]

[1] مسند أحمد: 188/4 (17832)

''(عقلمند وہ ہیں) جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، کھڑے ہو کر بھی، بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے بھی۔''

اور صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسِيْرُ فِيْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فَمَرَّ عَلَى جَبَلٍ يُقَالُ لَهُ جُمْدَانُ، فَقَالَ: «سِيْرُوْا هَذَا جُمْدَانُ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ» قَالُوْا: وَمَا الْمُفَرِّدُوْنَ؟ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: «اَلذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتُ»[1]

''رسول اللہ ﷺ مکہ کے ایک راستے پر چلے جا رہے تھے کہ آپ کا ایک پہاڑ کے قریب سے گزر ہوا جس کو جمدان کہا جاتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''چلتے رہو، یہ جمدان ہے۔ مفردون (لوگوں سے الگ ہو کر تنہا ہو جانے والے) بازی لے گئے۔'' لوگوں نے پوچھا: اللہ کے رسول! مفردون سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے (مرد) اور اللہ کو یاد کرنے والی (عورتیں)۔''

اسی حوالے سے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا ایک قول مشہور ہے جو انھوں نے یومِ عرفہ کو شام کے وقت مزدلفہ جانے سے قبل کہا تھا کہ آج سبقت لے جانے والا وہ نہیں جس کا اونٹ آگے بڑھ گیا، بلکہ سبقت لے جانے والا وہ ہے جس کی مغفرت کر دی گئی۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ»[2]

''رسول اللہ ﷺ اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔''

یعنی چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے اور لیٹے ہوئے، ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ چاہے آپ ﷺ طہارت کی حالت میں ہوتے یا نہ ہوتے۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''جن لوگوں کی زبانیں اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہتی ہیں وہ جنت میں ہنستے مسکراتے داخل ہوں گے۔''

---

[1] مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب الحث علی ذکر اللّٰہ تعالی، رقم الحدیث: 4 (2676)

[2] مسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللّٰہ في حال الجنابة، رقم الحدیث: 117 (373)

ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ ایک آدمی نے سو غلام آزاد کر دیے ہیں تو انھوں نے کہا:

''ایک آدمی کے مال سے سو غلاموں کو رہائی دلانا بہت زیادہ ہے، لیکن اس سے افضل چیز ایمان ہے جو دن رات زندہ رہے اور زبان اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہے۔''

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''میں صبح سے لے کر شام تک اللہ کے ذکر میں مشغول رہوں تو یہ مجھے اِس بات سے زیادہ محبوب ہے کہ میں صبح سے لے کر شام تک اللہ کے راستے میں عمدہ گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہوں۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] کے بارے میں کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ سے کما حقہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے۔ اسے یاد رکھا جائے اور بھلایا نہ جائے۔ اس کا شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔''

حبِ الٰہی کی علامت:

- ربیع بن انس رحمہ اللہ اپنے بعض ساتھیوں سے نقل کرتے ہیں کہ حبِ الٰہی کی علامت اس کا بہت زیادہ ذکر کرنا ہے، کیونکہ آپ کو جس سے محبت ہوتی ہے اسے آپ بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔
- فتح الموصلی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ سے محبت کرنے والا انسان ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کے ذکر سے غافل نہیں ہوتا۔
- ذوالنون رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس شخص کا دل اور اس کی زبان اللہ کے ذکر میں مشغول رہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں اس کے شوق کا نور ڈال دیتا ہے۔
- ایک شخص ابراہیم بن ادہم کے ہاں رات کو سو گیا۔ اس کا کہنا ہے میں جب بھی رات کو بیدار ہوتا تو انھیں اللہ کے ذکر میں مشغول دیکھتا۔ چنانچہ میں اپنے اوپر افسوس کرنے لگ جاتا اور پھر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے یہ آیت پڑھتا: ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [المائدة: ٥٤] ''یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔''
- سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو توحید قبول کرنے کی وجہ سے جب مشرکینِ مکہ شدید گرمی میں عذاب دیتے تھے تو وہ کہتے تھے: احد، احد، وہ جب کہتے کہ تم ''واللات والعزی'' کہو تو وہ جواب دیتے کہ مجھے یہ کہنا نہیں آتا۔

- اللہ تعالیٰ کی معرفت جتنی مضبوط ہوتی ہے اتنا ہی اس کی زبان پر اللہ کا ذکر بغیر کسی تکلف کے جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ نیند میں بھی اللہ، اللہ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ تسبیح کا الہام ایسے کرے گا جیسے وہ سانس لیں گے۔ اور لا إله إلا الله ان کے لیے ایسے ہوگا جیسے اہلِ دنیا کے لیے ٹھنڈا پانی ہو۔
- جب ایک محبت کرنے والا اپنے محبوب کا ذکر کسی اور سے سنتا ہے تو اس کے شوق میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

«اِقْرَأْ عَلَيَّ الْقُرْآنَ» قَالَ: فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَقْرَأُ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ أُنْزِلَ؟ قَالَ: «إِنِّي أَشْتَهِي أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِي»[1]

''میرے سامنے قرآن مجید کی قراءت کرو۔'' کہتے ہیں، میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ کو سناؤں جبکہ آپ پر ہی تو (قرآن مجید) نازل ہوا ہے؟! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری خواہش ہے کہ میں اسے کسی دوسرے سے سنوں۔''

- وہ سات خوش نصیب لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے (عرش) کے سائے میں جگہ دے گا، جس دن اس کے علاوہ کوئی اور سایہ نہیں ہوگا، ان میں سے ایک وہ ہوگا جس کے بارے میں فرمایا:

«وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِياً فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»[2]

''وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے تو (بے ساختہ) اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔''

- ذکرِ الٰہی اللہ کی معرفت رکھنے والے لوگوں کے دلوں کا اطمینان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ [الرعد: ٢٨]

''خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔''

دن اور رات میں ذکر کی انواع واقسام:

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ دن اور رات کے کچھ

---

[1] أخرجه البخاري، كتاب التفسير، باب قوله تعالى: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ ﴾ رقم الحديث (5049) ومسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فضل استماع القرآن، رقم الحديث: 248 (800)

[2] أخرجه البخاري، كتاب الأذان، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة، رقم الحديث (660) ومسلم، كتاب الزكاة، باب فضل إخفاء الصدقة، رقم الحديث: 91 (1031)

مقررہ اوقات میں پانچ نمازیں قائم کر کے اللہ کا ذکر کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے نفلی طور پر مزید ذکر کرنے کا حکم بھی دیا ہے، جس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ ذکر جو نماز ہی کی جنس سے ہے۔ چنانچہ اس نے پانچ نمازوں سے پہلے اور ان کے بعد نوافل پڑھنا بھی مشروع کیا ہے۔ اگر فرائض میں کوئی کمی ہوگی تو اسے ان نوافل کے ذریعے پورا کر دیا جائے گا، ورنہ یہ فرائض پر ایک اضافی عمل ہوگا۔ سب سے زیادہ لمبا وقفہ جو دو نمازوں کے درمیان آتا ہے وہ ہے: عشا اور فجر کے درمیان۔ اور فجر اور ظہر کے درمیان۔ اور ان دونوں وقفوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے مزید نفل نمازیں مشروع کی ہیں۔ تاکہ ذکرِ الٰہی سے غفلت کا وقت زیادہ لمبا نہ ہو۔ عشاء اور فجر کے درمیان نمازِ تہجد اور نمازِ وتر مشروع ہے، جبکہ فجر اور ظہر کے درمیان چاشت کی نماز مشروع ہے۔

دوسری قسم: نمازوں کے علاوہ زبان کے ساتھ اللہ کا ذکر، جو تمام اوقات میں مشروع ہے اور بعض اوقات میں اس کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے کچھ اوقات یہ ہیں:

1. فرض نمازوں کے بعد مسنون اذکار، جن میں سو مرتبہ تسبیحات کا پڑھنا بھی شامل ہے۔
2. ان دو نمازوں کے بعد ذکر اللہ کرنا جن کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہے اور وہ ہیں: نمازِ فجر اور نمازِ عصر۔ لہٰذا فجر کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک اور عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اللہ کا ذکر کرتے رہنا مشروع ہے۔ دن کے دوران یہ اوقات ذکر کے لیے افضل ترین اوقات ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان اوقات میں ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴾ [آل عمران: ٤١]

''اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرو، اور شام کو اور صبح کو اس کی تسبیح بیان کرو۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ﴾ [طٰہٰ: ١٣٠]

''اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے۔''

نیز فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴾
[الأحزاب: ٤١۔ ٤٢]

''اے ایمان والو! اللہ کو بکثرت یاد کیا کرو۔ اور صبح وشام اس کی تسبیح کیا کرو۔''

اسی طرح اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَٱذْكُرِ ٱسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴾ [الإنسان: ٢٥]

''اور صبح وشام اپنے پروردگار کا نام یاد کیجیے۔''

مذکورہ دو اوقات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی بہترین صورت نمازِ فجر اور نمازِ عصر کو ادا کرنا ہے۔ اور یہ دونوں نمازیں افضل ترین نمازیں ہیں۔ انہی دو نمازوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ»①

''جس نے دو ٹھنڈے وقتوں کی نمازیں ادا کیں، وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

③ مطلق ذکر، جس میں نماز، تلاوتِ قرآن، تعلیم وتعلمِ قرآن، علمِ نافع، تسبیحات، مختلف اذکار و دعائیں جن کا صبح وشام پڑھنا نبی ﷺ سے ثابت ہے، شامل ہیں۔

④ مغرب وعشاء کے مابین نماز اور ذکر کرنا۔ اسی حوالے سے ایک حدیث اس سے پہلے حدیث نمبر: 29 کی شرح میں گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ ﴾ [السجدة: ١٦] اسی بارے میں نازل ہوا۔

نمازِ عشاء کو تہائی رات تک لیٹ کرنا مستحب ہے، جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ یہی امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا مذہب بھی ہے، تاکہ رات کا پہلا تہائی حصہ اِس نماز کا انتظار کرتے ہوئے ذکرِ الٰہی اور نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں گزرے۔ پھر وہ نمازِ عشاء پڑھ لے اور اس کے بعد سنتیں اور اگر سونے سے پہلے وتر پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

⑤ اِس کے بعد جب سونے کے لیے بستر پہ پہنچے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ باوضو ہو، پھر مسنون دعائیں پڑھے اور تسبیحاتِ فاطمیہ پڑھے جن کی نبی کریم ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر علی رضی اللہ عنہ کو سونے سے پہلے پڑھنے کی وصیت کی تھی۔②

① مسلم، كتاب المساجد، باب فضل صلاتي الصبح والعصر، رقم الحديث: 215 (635)

② مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب التسبيح أول النهار وعند النوم، رقم الحديث: 80 (2727)

سونے سے پہلے مسنون اذکار مختلف قسم کے ہیں۔ ان میں تلاوتِ قرآن اور دیگر کئی دعائیں شامل ہیں۔ اسی حالت میں سو جائے اور جب کبھی پہلو بدلے اور بیدار ہو تو اللہ کو یاد کرے، جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ تَعَارَّ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي أَوْ دَعَا اسْتُجِيبَ لَهُ فَإِنْ تَوَضَّأَ وَصَلَّى قُبِلَتْ صَلَاتُهُ»[1]

''جو شخص رات کو اٹھے اور کہے:

«لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہت اسی کی ہے، اور تمام تعریفات اسی کی ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ میں اللہ کی پاکیزگی بیان کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے۔ نیکی کرنے کی اور برائی سے بچنے کی طاقت اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔''

پھر یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي» ''اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔''

یا کوئی اور دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اگر وضو کر کے نماز پڑھے تو اس کی نماز بھی قبول ہوتی ہے۔''

سنن ترمذی میں سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ طَاهِرًا يَذْكُرُ اللّٰهَ حَتَّى يُدْرِكَهُ النُّعَاسُ لَمْ يَنْقَلِبْ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ يَسْأَلُ اللّٰهَ شَيْئًا مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ»[2]

---

[1] البخاري، كتاب التهجد، باب فضل من تعار من الليل فصلى، رقم الحديث (1154)

[2] سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب حدثنا الحسن بن عرفة، رقم الحديث (3526)

”جو شخص اپنے بستر پر پاک و صاف ہو کر سونے کے لیے جائے اور اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اسے نیند آ جائے تو رات کے جس کسی لمحے میں بھی بیدار ہو کر وہ دنیا و آخرت کی جو کوئی بھی بھلائی اللہ سے مانگے گا اللہ اسے وہ چیز ضرور عطا کرے گا۔“

6. جب وہ تہجد کے لیے بیدار ہو تو مذکورہ بالا حدیث کے مطابق دعا پڑھے اور نماز سے فراغت کے بعد سحری کے وقت استغفار کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سحری کے وقت استغفار کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے۔

7. جب صبح صادق ہو جائے تو وہ فجر کی دو سنتیں ادا کرے۔ پھر نمازِ فجر پڑھے اور اس کے بعد طلوعِ آفتاب تک ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔ جیسا کہ پہلے بھی یہ بات گزر چکی ہے۔

جو شخص اِس طرح سے اذکار کا اہتمام کرے گا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے تو یہ وہ شخص ہے جس کی زبان اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہے گی۔ بیدار ہونے سے لے کر سونے تک وہ مسلسل ذکرِ الٰہی ہی کی حالت میں رہے گا اور یہ طریقِ کار یقیناً اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کی علامت ہے۔

ہر حال میں اللہ کا ذکر:

انسان دن اور رات میں اپنی جسمانی اور دنیاوی مصلحتوں کے لیے جو کچھ کرتا ہے ان سب میں اللہ کا نام لینا اور مسنون دعا پڑھنا مشروع ہے۔ لہٰذا اسے کھانے، پینے، لباس پہننے، جماع کرنے، گھر میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے، سواری پر سوار ہونے اور جانور کو ذبح کرنے کی مسنون دعائیں پڑھتے رہنا چاہیے۔ اسی طرح جب اسے چھینک آئے یا کسی اور کو چھینک آئے اور وہ ”الحمد للہ“ پڑھے تب بھی وہ مسنون دعاؤں کا خیال رکھے۔ نیز جب ایسے لوگوں کو دیکھے جو دینی یا دنیاوی اعتبار سے کسی آزمائش میں مبتلا ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرے۔ اسی طرح جب اپنے مسلمان بھائیوں سے ملاقات کرے تو اس کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے سلام اور دعا وغیرہ کا اہتمام کرے۔ نیز جب کوئی نئی نعمت ملے یا کوئی مصیبت ٹل جائے تو ہر حال میں اللہ رب العزت کی تعریفیں بیان کرے۔ خوشی میں بھی اور غمی میں بھی، خوشحالی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی۔

اسی طرح بازار میں داخل ہوتے وقت، مرغ کی آواز سن کر، کڑک کی آواز سن کر، بارش کے نزول کے وقت، شدید آندھی کے وقت، پہلی رات کا چاند دیکھ کر، پھلوں میں سے تازہ پھل دیکھ کر، مصیبت کے

وقت، سفر کے لیے نکلتے وقت .... ان مختلف مواقع پر اللہ کا ذکر کرے، اس کی تعریف بیان کرے اور مسنون دعائیں پڑھے۔ غصے کے وقت، برا خواب دیکھ کر، کتوں اور گدھوں کی آوازیں سن کر اللہ کی پناہ طلب کرے۔ نیز جس کام میں انسان کے لیے بہتری کا پہلو ظاہر نہ ہو اس میں استخارہ کرنا مشروع ہے۔ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے توبہ کرنا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فٰحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾

[آل عمران: ۱۳۵]

''اور جب ان سے کوئی بدکاری ہو جاتی ہے، یا اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔''

لہٰذا جو شخص ان تمام اذکار کی حفاظت کرے گا اس کی زبان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے گی۔

ذکر میں جامع کلمات:

ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ نبی ﷺ جامع کلمات کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ آپ ﷺ کو جامع اذکار بہت پسند تھے، لہٰذا آپ ﷺ انہی کو دیگر اذکار پر ترجیح دیتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، کہ نبی اکرم ﷺ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد صبح سویرے ان کے ہاں سے باہر تشریف لے گئے، اس وقت وہ اپنی نماز پڑھنے والی جگہ میں تھیں، پھر دن چڑھنے کے بعد آپ ﷺ ان کے پاس واپس تشریف لائے تو وہ (اسی طرح) بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اب تک اسی حالت میں بیٹھی ہوئی ہو جس پر میں تمھیں چھوڑ کر گیا تھا؟'' انھوں نے عرض کی: جی ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے (ہاں سے جانے کے) بعد میں نے چار کلمے تین بار کہے ہیں، اگر ان کو ان کے ساتھ تولا جائے جو تم نے آج کے دن اب تک کہا ہے تو یہ ان سے وزن میں بڑھ جائیں۔ وہ کلمات یہ ہیں:

« سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَزِنَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ »[1]

''پاکیزگی ہے اللہ کی اور اس کی تعریف کے ساتھ، جتنی اس کی مخلوق کی گنتی ہے اور جتنی اس کو پسند ہے اور جتنا اس کے عرش کا وزن ہے اور جتنی اس کے کلمات کی سیاہی ہے۔''

[1] مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب التسبيح أول النهار وعند النوم، رقم الحديث: 79 (2726)

اسی طرح نبی کریم ﷺ کو دعاؤں میں سے جامع دعائیں پسند ہوتی تھیں، جیسا کہ سنن ابی داود میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدَعُ مَا سِوَى ذٰلِكَ»[1]

''رسول اللہ ﷺ جامع دعائیں پسند فرمایا کرتے تھے اور اس کے علاوہ کو چھوڑ دیتے تھے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:

''اے عائشہ! تم صرف جامع دعائیں پڑھا کرو:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَاذَ بِهِ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ وَ عَمَلٍ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ وَ عَمَلٍ وَأَسْأَلُكَ أَنْ تَجْعَلَ كُلَّ قَضَاءٍ قَضَيْتَهُ لِيْ خَيْرًا»[2]

''اے اللہ! میں تجھ سے ہر قسم کی خیر مانگتا ہوں، جلدی ملنے والی اور دیر سے ملنے والی (یا دنیا کی اور آخرت کی)، وہ بھی جس کا مجھے علم ہے اور وہ بھی جس کا مجھے علم نہیں۔ اے اللہ! میں ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، جلدی آنے والے سے بھی، اور دیر سے آنے والے سے بھی (یا دنیا و آخرت کے شر سے)، جس کا مجھے علم ہے، اس سے بھی اور جس کا مجھے علم نہیں، اس سے بھی۔ یا اللہ! میں تجھ سے وہ خیر مانگتا ہوں جو تجھ سے تیرے بندے اور تیرے نبی (محمد ﷺ) نے مانگی ہے۔ اور میں اس شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں جس شر سے تیرے بندے اور تیرے نبی (محمد ﷺ) نے پناہ مانگی ہے۔ یا اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور ہر اس قول و عمل (کی توفیق) کا سوال کرتا ہوں جو اس سے قریب کرے۔ اور میں (جہنم کی) آگ سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور ہر اس قول و عمل سے پناہ مانگتا ہوں جو اس

---

[1] سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب الدعاء، رقم الحديث (1482)

[2] مسند أحمد (146/6) وسنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب الجوامع من الدعاء، رقم الحديث (3846)

(جہنم) سے قریب کرے۔ اور میں یہ سوال کرتا ہوں کہ تو جو بھی فیصلہ کرے اسے میرے لیے بہتر (یا خیر کا باعث) بنا دے۔"

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ.

فوائدِ حدیث:

1. انسان تمام کی تمام طاعات کا استقصاء کرنے سے عاجز ہے، کیونکہ وہ بہت زیادہ ہیں۔
2. حدیث میں ذکرِ الٰہی کی فضیلت اور ترغیب ہے اور اِس پر ہمیشگی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔
3. اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بہت وسیع ہے کہ وہ تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ اجروثواب عطا فرماتا ہے۔
4. مصیبتوں اور آزمائشوں میں سب سے بہتر علاج اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہمیشگی کرنا ہے۔
5. جامع کلمات جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں، ان کے ساتھ دعا کرنا سب سے افضل ذکر ہے۔
6. ذکرِ الٰہی پر ہمیشگی اختیار کرنا مسلمان کے لیے شیطانی وسوسوں سے بچنے کا مضبوط قلعہ ہے۔
7. ذکرِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں: قلبی ذکر اور زبانی ذکر۔
8. اللہ عزوجل نے ہمیں اپنے ذکر کا حکم اس لیے دیا ہے کہ مومن کا دل ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے جڑا رہے۔
9. مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو ہمیشہ اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رکھے، کیونکہ ذکرِ الٰہی مردہ دل کو زندہ کرتا ہے۔

سوالات:

1. ذکر اللہ اور اطمینانِ قلب میں کیا تعلق ہے؟
2. وہ کون سے اوقات ہیں جن میں ذکرِ الٰہی دوسرے اوقات کی نسبت افضل ہے؟ اپنے جواب کی دلیل بھی ذکر کریں۔
3. نبی کریم ﷺ کی جامع دعاؤں میں سے بعض دعائیں ذکر کریں۔
4. نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ "تمھاری زبان اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہے۔" کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے؟
5. نبی کریم ﷺ کو جامع دعائیں پسند تھیں۔ اس کی وضاحت کریں۔

6 صحیح اور غلط کی نشاندہی کریں:

1 یہ حدیث مساجد اور حلقاتِ ذکر کی ترغیب دے کر دراصل سستی اور کام کاج سے بھاگنے کی طرف دعوت دیتی ہے۔

2 ذکر اور ثناء کا تعلق صرف زبان سے ہے۔

3 یہ حدیث اِس قاعدہ کی تاکید کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

4 جن نمازوں کے بعد کوئی نفلی نماز نہیں، ان کے بعد ذکر اللہ کے لیے بیٹھنا غلو اور تکلف ہے۔

5 دعا اور ذکر میں تفصیل مستحب ہے۔



یادداشت

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

هدية من
لجنة القارة الهندية
جمعية إحياء التراث الإسلامي
دولة الكويت



مکتبہ اسلامیہ

لاہور بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

www.maktabaislamia.com.pk
maktabaislamiaofficial
maktabaislamiainfo@gmail.com

